شاہد احمد دہلوی
دِلّی جو ایک شہر تھا
مرتب: نیاض رفعت

شاهد احمد دهلوی

دلّی جو ایک شہر تھا

(شاہد احمد دہلوی کی منتخب تحریریں)

ترتیب وتہذیب: فیاض رفعت

دلّی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب
ہم رہنے والے ہیں اُسی اُجڑے دیار کے

— میر تقی میرؔ

دلّی جو ایک شہر تھا

(شاہد احمد دہلوی کی منتخب تحریریں)

ترتیب و تہذیب:

فیاض رفعت

زیر اہتمام:

تخلیق کار پبلشرز

۲۰۵، گلی نمبر۔۶، بے۔ایکسٹینشن، لکشمی نگر، دہلی۔۱۱۰۰۹۲

نام کتاب : **دلی جو ایک شہر تھا**

ناشر و مرتّب : فیاض رفعت

پتہ : 328, ELDECO GREENS, Dream Villas,
Gomti Nagar, Lucknow- 226010 (U.P.)

تعداد : ۵۰۰

زیراهتمام : تخلیق کار پبلشرز
۲۰۵/۶، جے۔ ایکسٹینشن، لکشمی نگر، دہلی۔۱۱۰۰۹۲

سرورق : مسعود التمش

کمپوزنگ : رچنا کار پروڈکشنز، لکشمی نگر، دہلی-۱۱۰۰۹۲

مطبع : کلاسک آرٹ پرنٹرس، چاندنی محل، دریا گنج، نئی دہلی۔۱۱۰۰۰۲

ملنے کے پتے:

- کتابی دُنیا، ترکمان گیٹ، دہلی۔۱۱۰۰۰۶
- مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار، جامع مسجد، دہلی۔۱۱۰۰۰۶
- راعی بک ڈپو، ۷۔۳۴، اولڈ کٹرہ، الہ آباد۔۲۱۱۰۰۲ (یو۔ پی)
- کتب خانہ انجمن ترقی اردو، اردو بازار، جامع مسجد، دہلی۔۱۱۰۰۰۶
- ایجوکیشنل بک ہاؤس، مسلم یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ۔۲۰۲۰۰۱ (یو۔ پی)
- ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، گلی وکیل، کوچہ پنڈت، لال کنواں، دہلی۔۱۱۰۰۰۶
- کتاب دار، جلال منزل، ٹیمکر اسٹریٹ، نزد جے۔ جے۔ اسپتال، ممبئی۔۴۰۰۰۰۸
- ہورائزن ڈسٹری بیوٹرس، گوراچاند روڈ، انٹالی، کولکاتہ۔۷۰۰۰۱۴ (مغربی بنگال)

T.P.: 0215
ISBN-978-93-80182-30-8
2011
₹280.00
DILLI JO EK SHEHAR THA *(Articles)*
by SHAHID AHMED DEHELVI
Compiled by FAYYAZ RIFAT
TAKHLEEQKAR PUBLISHERS
205 / 6, J-Extension., Laxmi Nagar, Delhi - 110092
Ph.:011-22442572,9811612373 Email:qissey@rediffmail.com

○

دِلّی والوں

کے نام

○○

وے صورتیں الٰہی کس دیس بستیاں ہیں
اب دیکھنے کو جن کے آنکھیں ترستیاں ہیں

سعید خان دہلوی

کی یاد میں

نغمہ ہائے غم کو بھی اے دل غنیمت جانئے
بے صدا ہو جائے گا یہ ساز ہستی ایک دن

—— اسد اللہ خاں غالبؔ

فہرست

گنج ہائے گرانمایہ

(''اُجڑا دیار'' سے منتخب مضامین)

سیکھے ہیں مہ رُخوں کے لیے ہم مصوری

(خاکے)

لفظ و معنی

ساز و آواز

(موسیقی)

افسانہ و افسوں

(ترجمہ)

پس لفظ

○○

تعارف

تعارف لکھنا کسی ایسے مصنف کی کتاب پر جو روشناسِ خلق نہ ہو، اس لحاظ سے مفید ہوسکتا ہے کہ اس طرح بھی اس کا چرچا ہو جائے گا، لیکن جسے خاص و عام، سب پہلے سے جانتے ہوں، اس کو متعارف کرانے کے لئے کچھ لکھنا محض رسمی سی بات ہے۔ بھلا ڈپٹی نذیر احمد کے پوتے اور مولوی بشیر الدین احمد کے بیٹے اور مدیر ''ساقی'' سے کون واقف نہیں۔ جس نے رسالہ ''ساقی'' کی جھلک بھی دیکھی ہے اور جو ادب سے ذرا بھی دلچسپی رکھتا ہے، وہ شاہد احمد دہلوی کے نام سے اور ان کے کارناموں سے ضرور واقف ہے کہ وہ کئی کتابوں کے مصنف تھے اور ۳۷ سال مسلسل ''ساقی'' نکالتے رہے تھے اور ادیب ابن ادیب ابن ادیب تھے۔ روپے پیسے کی طرح علم اور ادب بھی ایک گھر میں تین پشت نہیں ٹھیرا کرتا۔ یہ شرف شاہد احمد صاحب کو حاصل تھا۔ شاہد احمد تین پشت سے صاحبِ علم اور صاحبِ قلم تھے۔

افسوس! آج شاہد صاحب کے ذکر میں ماضی کا صیغہ استعمال کرنا پڑ رہا ہے۔ ڈیڑھ دو ماہ پہلے تک وہ بزم ساقی میں پورے انہماک کے ساتھ موجود تھے۔ انہوں نے اپنے انتقال سے صرف ہفتہ بھر قبل اس کتاب کا پیش لفظ لکھا تھا۔ ان کی خواہش تھی کہ اس کا تعارف میں لکھوں۔ اپنے قول کے مطابق میرے چند الفاظ تبرک کے طور پر اس میں شامل کر لینا چاہتے تھے۔ میں پندرہ مہینے سے فالج کا مریض ہوں۔ اس لئے میرے الفاظ واقعی تبرک کے دائرے سے نہیں بڑھیں گے۔

شاہد احمد کے عہد سے بہت پہلے میر نے دِلّی کو "اُجڑا دیار" کہہ کر گویا ہمیشہ کے واسطے مہر لگا دی تھی کہ یہ بستی اہل دہلی کے حق میں اُجڑی اور اُجڑتی ہی رہے گی۔ شاہد صاحب نے وہ شعر بارہا پڑھا تھا، اور میں نے سنا ہے کہ وہ یہ شعر بڑے سوز کے ساتھ گایا بھی کرتے تھے، جس میں اجڑے دیار کا ذکر ہے۔ لیکن وہ دِلّی کو بسی ہوئی حالت میں دیکھتے تھے اور یوں پوری طرح شعر کی کیفیت کو شاید محسوس نہ کرتے ہوں۔ ۱۹۴۷ء میں دِلّی وہاں کے اصل باشندوں کی نظر میں درحقیقت اُجڑ گئی تو شاہد صاحب کے لئے اس کا احساس سوہانِ روح بن گیا اور انہوں نے ان ہستیوں کا تذکرہ لکھنا شروع کر دیا، جن کے دم قدم سے ۱۹۴۷ء تک دِلّی صحیح معنوں میں دِلّی تھی، اور جنہیں نظر انداز کرنے کے بعد نگاہ بازگشت ڈالنے سے وہاں کوئی رونق دکھائی نہیں دیتی۔ وہ خود لٹ لٹا کر اس شہرِ خوباں سے ہجرت کرنے پر مجبور ہوئے تھے اور اس کو اُجڑی حالت میں چھوڑ کر پاکستان آئے تھے۔ اُن کے سینے پر زخم پڑ گئے تھے۔ اُنہوں نے اُن زخموں کو کرید کر جو لکھا، وہ اپنے پورے تاثرات کے ساتھ ہمارے سامنے ہے۔

جن پیشہ وروں کا ذِکر انہوں نے کیا ہے، وہ ہر ملک میں اور ہر شہر میں پائے جاتے ہیں، لیکن دِلّی کے ان پیشہ وروں کی بات کچھ اور تھی۔ مثال کے طور پر لاہور میں وزیر خاں والے چوک کے کبابی مشہور تھے لیکن لوگ ان کے کبابوں کا مزا تو لیتے تھے، مگر ان کی ذات سے متاثر نہیں تھے۔ ان کا ذکر آج تک کسی مضمون میں نہیں آیا۔ شاہد صاحب نے جن کبابی کا حال لکھا ہے، اُن کا کردار تھا جسے کباب کھانے والے کباب کی لذّت کے ساتھ یاد رکھتے تھے۔ محفلوں کا رنگ دوبالا کرنے کے لئے بھانڈوں اور طوائفوں کے مجرے بھی ہر جگہ ہوتے ہیں لیکن دِلّی میں کمالِ فن کے ساتھ کچھ دِل کی لگن بھی پائی جاتی تھی جواب ناپید ہے۔ اِسی طرح کبوتر ہر جگہ اُڑائے جاتے ہیں مگر دِلّی کے کبوتر بازوں کی جس خودداری کا ذکر شاہد صاحب نے کیا ہے، وہ کہاں نصیب ہو سکتی ہے۔ کھانے پینے میں لذّت کام و دہن کا خیال رکھنا معاشرے کا ایک اہم جزو ہے۔ بہت سے ملکوں یا ان کے شہروں میں لوگ صرف پیٹ بھر لینا جانتے ہیں۔ ان کی سعی

وکاوش کی یہی معراج ہے کہ صبح وشام جو ملا کھالیا اور زندگی بسر کر لی۔ اپنے کھانوں میں تنوع اور لذت پیدا کرنا دلی والوں کا خاص مشغلہ تھا جو صحیح ذوق کے بغیر پورا نہیں ہو سکتا۔ دلی والوں کا چٹور پن مشہور تھا۔ شاہد احمد خود بھی اس سے بیگانہ نہیں تھے۔ لہذا بڑے مزے لے لے کر ان باتوں کا ذکر اس طرح کیا ہے کہ پڑھنے والے کے منہہ میں پانی بھر بھر آتا ہے۔ موسمی تہوار اور میلے بھی ہر جگہ منائے جاتے ہیں لیکن جو روایات دلی کے تہواروں اور میلوں سے وابستہ ہیں، ان کا احساس کتنے لوگوں کو کس شدت کے ساتھ ہوتا ہے۔ یہ شاہد صاحب کے دل سے پوچھئے اور ان کی تحریروں میں تلاش کیجئے۔

ان سب مضامین کو اور ان سچے قصۂ ہائے پارینہ کو پڑھنے کے بعد ایک اضمحلال سا طبیعت میں محسوس ہوتا ہے لیکن اس میں ایک لذت بھی پائی جاتی ہے...... ایک لذتِ غم جس سے زندگی عبارت ہے۔

○○

خاکسار
محمد ارتضیٰ واحدی
۱۵-۷-۱۹۶۷

حسین ڈی سلوا کولونی
کراچی (پاکستان)

نگاہِ اوّلیں

یہ مضامین وقتاً فوقتاً لکھے گئے تھے، اس لئے ان میں بعض باتیں آپ کو بعض مضامین میں مکرر نظر آئیں گی۔ مضمون کی روانی کو قائم رکھنے کے لئے ان کا اخراج بھی ممکن نہیں تھا، اس لئے انہیں خارج نہیں کیا گیا۔

ان مضامین میں اس دِلّی کی معاشرتی اور تہذیبی جھلکیاں پیش کی گئی ہیں جو ۱۹۴۷ء تک قائم تھی۔ ہنگامہ ۱۸۵۷ء کے بعد دِلّی کی اینٹ سے اینٹ بج گئی تھی۔ بوڑھے بادشاہ کو قید کر کے رنگون بھیج دیا گیا تھا اور دِلّی کے مسلمان شرفا چن چن کر توپ دم کر دیے گئے تھے۔ ان مرنے والوں کے ساتھ دِلّی کی وہ تہذیب بھی مرگئی جو مسلمانوں کے دم قدم کی برکت سے صدیوں میں بنی تھی۔ معافیوں کے بعد بچے کھچے دِلّی والے جب واپس اپنے شہر میں آئے تو اسے ویرانہ پایا۔ انہوں نے اس کھنڈر ہی کو اللہ عزیز کرلیا اور رفتہ رفتہ دِلّی نے اپنی عظمت رفتہ پھر حاصل کر لی۔

دِلّی کی ایک مخصوص تہذیب تھی جو عروج و زوال کے تانے بانے سے بنتی بگڑتی رہی۔ اس کے ہر بگاڑ میں ایک سنوار تھا۔ ۱۹۴۷ء میں دِلّی کو غسل خونیں دیا گیا۔ اس سے دِلّی کی آبادی تو دگنی ہوگئی مگر وہ تہذیب اور وہ معاشرت غارت ہوگئی جس پر دِلّی کو ناز تھا اور جس سے دِلّی کی انفرادیت قائم تھی۔ وہ تہذیب کیا تھی اور وہ معاشرت کیسی تھی؟ اسے بیان کرنے کے لئے دفتر درکار ہیں جن کی نہ توفیق نہ ہمت۔ البتہ چند جھلکیاں آئندہ صفحات میں پیش کی جارہی ہیں۔ ان سے آپ کو اندازہ ہو سکے گا کہ وہ

کیسی ستھری تہذیب اور کیسی اُجلی معاشرت تھی جس سے دِلّی محروم ہوگئی، اور یہ محرومی صرف دِلّی ہی کی نہیں ہے، پورے ہندوستان کی ہے، کیونکہ دِلّی ہندوستان کا دل ہے۔

○○

کراچی
۲۲/مئی ۱۹۶۷ء

شاہد احمد دہلوی
مدیر ماہنامہ ''ساقی''

کچھ شاہد احمد دہلوی کے حوالے سے

۔ فیاض رفعت

شاہد احمد دہلوی کے فنی رموز و نکات پر روشنی ڈالنے سے قبل ہم لازم جانتے ہیں کہ ان کی سرگزشت حیات کی جھلکیاں خود اُن ہی کی زبانی پیش کی جائیں۔

''میں بائیس مئی ۱۹۰۶ء کو دِلّی میں اپنے آبائی مکان میں پیدا ہوا۔ چار سال سے پہلے کی باتوں کا مجھے ہوش نہیں ہے۔ ایک خواب کا سا خیال ہے کہ ابا جب حیدر آباد سے دِلّی آتے تو سب سے پہلے دادا ابا کی خدمت میں لے جاتے۔ ابا دادا ابا سے بغلگیر ہو کر رونے لگتے اور ہم حیران ہو کر انہیں دیکھتے رہتے۔ پھر دادا ابا ہمیں ایک ایک اشرفی دیتے اور ہم چپکے سے وہاں سے کھسک لیتے۔ لیکن اور کچھ یاد نہیں ہے......

پھر ایک دفعہ ابا دِلّی آئے تو مطبع مجتبائی میں مولوی عبدالاحد خاں کے ہاں ان کی ملاقات ڈاکٹر ضیاء الدین سے ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب نے اُنہیں مشورہ دیا کہ بچوں کو علی گڑھ اسکول میں داخل کروایا جائے۔ ۱۹۱۶ء میں ہم تینوں بھائیوں (منذر احمد، مبشر احمد اور شاہد احمد) کو ایم۔ اے۔ او۔ اسکول میں داخل کر دیا گیا۔ اس زمانے میں بچوں کا بورڈنگ ظہور وارڈ تھا۔ تقریباً تین سال ہم نے علی گڑھ میں پڑھا۔ اس کے بعد عدم تعاون تحریک نے

زور پکڑا اور مولانا محمد علی نے جامعہ ملیہ علی گڑھ میں قائم کیا۔ ابا نے ہمیں علی گڑھ سے اُٹھالیا۔ وہ حیدرآباد سے پنشن لے کر آئے تھے۔ ہمیں عربک اسکول میں داخل کردیا۔

۱۹۲۳ء میں میٹرک پاس کرنے کے بعد میں نے لاہور جا کر ایف۔ سی۔ کالج میں داخلہ لے لیا۔ وہاں سے ایف۔ ایس۔ سی۔ (میڈیکل) پاس کرنے کے بعد میڈیکل کالج میں داخل ہوا۔ سڑی ہوئی لاشوں پر کام کرنے سے طبیعت اس قدر مکدر اور بیزار ہوئی کہ ایک سال میں، میں وہاں سے بھاگ لیا۔ دِلّی آکر میں نے انگریزی ادبیات میں بی۔اے آنرز کی ڈگری لی۔ اس سے ایک سال پہلے ابا کا انتقال فالج میں ہوگیا تھا۔ وہ ہمارے لیے پچاس پچاس ہزار روپے نقد اور دو دو سو روپئے کی ماہانہ جائداد چھوڑ گئے تھے۔ اس لیے کمانے دھمانے کی ہمیں کوئی فکر نہیں تھی۔ میں نے فارسی ادبیات میں ایم۔اے میں داخلہ لے لیا۔ یہ ۱۹۲۹ء کا ذکر ہے۔

میرے ایک رشتہ دار کے بھانجے ہیں انصار ناصری، جو میر ناصر علی صاحب ''صدائے عام'' کے پوتے ہیں۔ انہوں نے مجھے مشورہ دیا کہ دِلّی سے ایک عمدہ ادبی رسالہ جاری کیا جائے۔ اپنی سمجھ میں بھی یہ بات آگئی اور بغیر کسی تجربے یا مشورے کے جنوری ۱۹۳۰ء میں ماہنامہ ''ساقی'' جاری کر دیا۔ کوئی چار پانچ ماہ کی اُلٹی پُلٹی میں اس پرچے نے اپنی جگہ تو بنا لی مگر میرے ماموں نے جو اس پرچے کا اہتمام کرتے تھے، مجھے بتایا کہ اس پرچے پر پچیس تیس ہزار روپیہ ضائع ہو چکا ہے اور اگر یہی روش رہی تو باقی روپیہ بھی نکل جائے گا۔ اِدھر بھائیوں نے بھی لعنت ملامت کی تو آنکھیں کھلیں۔ پرچے کا انتظام خود اپنے ہاتھ میں لیا اور ہمعصر ادیبوں کی کتابیں چھاپنی شروع کیں۔ ڈوبتا ہوا کاروبار تر ہوگیا اور ۱۹۴۷ء میں ''ساقی بک ڈپو'' کی مالیت دو لاکھ روپئے کی تھی، اور پندرہ ہزار روپیہ ادیبوں اور

شاعروں کی طرف بطور پیشگی باقی تھا۔

دِلّی کا سارا کاروبار کشت وخون کی بھینٹ چڑھ گیا۔ آں دفتر را گاؤ خرد گاؤ را قصاب بُرد۔ ہمیں بیک بنی دوگوش دِلّی سے نکلنا پڑا۔ پُرانے قلعہ میں تین دِن پناہ لینے کے بعد ریل سے لاہور روانہ ہوئے۔ رات کو پٹیالہ کے علاقہ میں ریل پر حملہ ہوا۔ آدھی ریل کٹ گئی، ہم سخت جان تھے، بچ گئے۔ بُرے حال بانکے دھیاڑے لاہور پہنچے۔ یہاں کی دُنیا راس نہ آئی۔ دس مہینے بعد کراچی آگئے۔ ''ساقی'' دوبارہ جاری کیا۔ مگر اب اس کا نقصان کہاں سے بھرا جاتا۔ اسی تردد میں تھا کہ ریڈیو پاکستان نے میوزک سپروائیزر کی خدمت پیش کی۔ شکریہ کے ساتھ اُسے قبول کیا۔ خدا جانے موسیقی کا شوق مجھے کہاں سے لگا۔ مولویوں کا خاندان، دُور دُور تک گانے بجانے کا چرچا نہیں، مگر سنتے آئے ہیں کہ اولیا کے گھر بھوت پیدا ہو جاتے ہیں۔ شاید یہی بات ہو۔ سولہ سال کی عمر سے کلاسیکی موسیقی اچھے اُستادوں سے سیکھنا شروع کی تھی۔ خاندان والے ناراض تھے کہ یہ کیا بیہودہ شوق لگایا ہے۔ میں خود بھی کبھی کبھی سوچتا تھا کہ موسیقی اور وہ بھی کلاسیکی موسیقی سے آخر حاصل کیا ہوگا؟ اب اندازہ ہوتا ہے کہ میرے پاس یہ موسیقی کا علم وفن نہ ہوتا تو خدا جانے یہاں میرا حشر کیا ہوتا۔ ہاں تو ۱۹۳۶ء سے آل انڈیا ریڈیو کے کئی اسٹیشنوں سے کلاسیکی موسیقی نشر بھی کرنی شروع کر دی تھی۔ مگر ایس۔ احمد کے نام سے۔ پاکستان آنے کے بعد یہ راز بھی راز نہ رہا......

کجا مانند آں رازے کزد سازند محفلہا، اب ہمارا شمار ادب کے علاوہ موسیقی کے اُستادوں میں بھی ہوتا ہے۔

ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا!

لاہور میں قیام کے دَوران شاہد احمد دہلوی نے ''ساقی'' کا ڈکلریشن حاصل کرنے کی ہزار کوششیں کیں، مگر پریس آفیسر نے نہ جانے کس بدگمانی کی بنا پر ڈکلریشن

نہیں دیا۔ مجبوراً پانی والے تالاب میں کوچہ سیٹھاں کے جس مکان میں مقیم تھے، اُسے اپنے پھوپی زاد بھائی اشرف صبوحی کے حوالے کر کے کراچی کی راہ لی۔ یہ پھوپی زاد ۱۹۴۳ء میں ''دہلی کی چند عجیب ہستیاں'' لکھ کر مشہور ہو چکے تھے۔ شعر بھی کہتے تھے۔ ۱۹۲۹ء میں ''ارمغان'' رسالہ نہایت تزک واحتشام سے نکال چکے تھے۔ ایک طرح سے ''ارمغان''، ''ساقی'' کا پیش رو تھا۔ شاہد احمد دہلوی ان کا بے حد احترام کرتے تھے۔ اسکول کے زمانے سے ساتھ اُٹھتے بیٹھتے آئے تھے۔ ان کے والد مولوی بشیر الدین ابن ڈپٹی نذیر احمد نے اشرف صبوحی کو انگریزی اور اُردو، فارسی کا درس دیا تھا۔ مبشر احمد اور شاہد احمد بھی ساتھ بیٹھتے تھے۔

شاہد احمد دہلوی کے احوال و کوائف کو اسلم فرخی نے نہایت تفصیل سے لکھا ہے۔ کراچی میں ریڈیو کے ساتھ وابستگی کے زمانے میں بالخصوص اسلم فرخی اور شمس زبیری کو ان کی والہانہ قربت نصیب ہوئی۔ دونوں سائے کی طرح ان کے ساتھ رہتے تھے۔ حسن عسکری، جمیل جالبی بھی ساتھ ہو لیے تھے۔ ''ساقی'' میں یہ دونوں ادیب و نقاد باقاعدگی کے ساتھ لکھتے تھے۔ ایک زمانے تک حسن عسکری ''جھلکیاں'' کے عنوان سے ساقی میں ادبی کالم لکھتے رہے۔ رسالے کو اعتبار و استحکام بخشنے میں ان دونوں حضرات نے دل وجان سے سعیٔ جمیل کی، اور دِل آسائی کا فریضۂ احسن بھی انجام دیا۔

شاہد احمد دہلوی نے ایک ادبی خانوادے میں آنکھیں کھولیں۔ دلی کی بولی ٹھولی اور ٹکسالی زبان ان کے کانوں میں شہد گھولتی رہی۔ روزمرہ محاوروں کی کہکشاں ان کے شعور واحساس میں جوت جگاتی رہی۔ انہوں نے ناصر نذیر فراق، مرزا فرحت اللہ بیگ، خواجہ حسن نظامی، راشد الخیری، آغا حیدر حسن دہلوی اور ملاّ واحدی کی آنکھیں دیکھی تھیں۔ دلی کے ان رہنمائے ادب کی غیر معمولی تحریروں سے شاہد احمد دہلوی نے منزہ و پاکیزہ نثر لکھنے کے آداب سے شناسائی حاصل کی۔ گو کہ اُن کی ادبی زندگی کا باقاعدہ آغاز افسانہ نگاری سے ہوا۔ ان کا پہلا افسانہ ''مالی کی لڑکی'' لاہور کے رسالے ''شباب اُردو'' میں ۱۹۲۵ء میں شائع ہوا تھا۔ اس زمانے میں وہ لاہور میں زیر تعلیم تھے۔

ساقی کی ادارت کے زمانے میں وہ ترجموں کی طرف مائل ہوئے، اور سہلِ ممتنع میں مغربی اور روسی ادیبوں کے شاہکار اُردو میں منتقل کیے۔ ان کے مشہور تراجم میں ''نرگس جمال، پروین وثریا، فاؤسٹ، سرگزشت عروس، پھانسی، دھان کا کھیت، عثمان'' بطور لائق صد ستائش ہیں۔ شاہد احمد دہلوی کے ادبی کارناموں کی فہرت طویل ہے۔ خاکوں کے تین مجموعے ہیں۔ ''گنجینۂ گوہر''، ''بزم خوش نفساں''، اور ''طاق نسیاں''۔ بیشتر خاکے جمیل جالبی کے مسلسل اصرار اور فرمائش پر ضبط تحریر میں لائے گئے۔ ''گنجینہ گوہر'' کی اشاعت ۱۹۶۲ء میں عمل میں آئی۔ ''بزم خوش نفساں'' ڈاکٹر جمیل جالبی نے مرتب کی، جو ۱۹۸۵ء میں شائع ہوئی۔ ''بزم خوش نفساں'' کو ''چند ادبی شخصیتیں'' کے عنوان سے زیراہتمام پریم گوپال متل، موڈرن پبلشنگ ہاؤس، دلی نے ۱۹۹۵ء میں شائع کیا۔ پاکستان میں جمیل جالبی کے بعد باقی ماندہ خاکے ڈاکٹر سید محمد عارف نے ''طاق نسیاں'' کے نام سے مرتب کیے۔ کتابی صورت میں آنے سے پہلے ان کے بیشر خاکے ''نیا دور'' کراچی میں شائع ہوئے۔

شاہد احمد دہلوی نے دلی کی تہذیب و معاشرت کے بارے میں سینکڑوں مضامین لکھے۔ ان کی انشاپردازی کا رنگ یگانہ الگ سے پہچانا جاتا ہے۔ دہلوی تہذیب کی بازیافت اور دلی ماں کے ہڑکے میں انہوں نے یادوں کا ایسا طلسم خانہ مرتب کر دیا جس میں غدر کے بعد کی عوامی دلی کا سارا حسن وزیبائی سمٹ آئی ہے۔ ان کی ایسی ہی نادر تحریروں کا ایک مجموعہ ''اُجڑے دیار'' کے نام سے مکتبہ دانیال، کراچی نے نومبر ۱۹۶۷ء میں شائع کیا۔

جمیل جالبی نے ان کی نثر پر کیا خوب تبصرہ کیا ہے۔ ''ان کی نثر میں مجھے خوشبو کا احساس ہوتا ہے۔ ان کی نثر نہ صرف شگفتہ ہے بلکہ واقعات کے موتیوں کو بھی دل کے تار میں پروتی جاتی ہے۔ ان کی عبارت میں نہ تو انگریزی کے الفاظ آتے ہیں، نہ فارسی و عربی کے الفاظ شان وشوکت اور گھن گرج پیدا کرنے کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں۔ محاوروں کا برمحل استعمال روزمرہ کا صحیح تصرف اس طور پر ہوتا ہے کہ ہر لفظ زندہ اور جیتا

جاگتا محسوس ہوتا ہے۔ جو آپ سے بات کرتا ہے اور آپ کو تھپکتا اور جھنجھوڑتا ہے اور الفاظ کے ذریعہ خیال و احساس کی پوری تصویر پڑھنے والے کے سامنے آ کھڑی ہوتی ہے۔

زبان کے برمحل استعمال اور محاروں کو برتنے کا سلیقہ ان کے ورثے کا حصہ ہے۔ شاہد احمد دہلوی کی نثر میں وہ سارا بانکپن موجود ہے جو ہمیں الگ الگ ڈپٹی نذیر احمد اور محمد حسین آزاد کے یہاں نظر آتا ہے۔ آزاد کی نثر میں استعاروں کی کثرت ہے۔ وہ ایک بات کو کئی کئی استعاروں کے ذریعہ خوبصورت توازن کے ساتھ ادا کرتے ہیں۔ ان کی عبارت رنگین اور تخئیل کے زور سے شگفتہ ہو جاتی ہے۔ نذیر احمد محاوروں کو کثرت سے استعمال کرتے ہیں۔ ان کی نثر صاف، طرز بیان رواں اور بے ساختہ ہے۔ بقول مرزا فرحت اللہ بیگ، ڈپٹی نذیر احمد نے روزمرہ اور محاورات کا ایک مجموعہ بنا رکھا تھا۔ لکھتے تھے تو سامنے رکھتے تھے۔ بعد میں مرزا فرحت اللہ بیگ نے من وعن ان کی پیروی میں روزمرہ اور محاروں کا بے تکان استعمال کیا اور ''ڈپٹی نذیر احمد کی کہانی: کچھ ان کی کچھ میری زبانی'' لکھ کر خاکہ نگاری کو دُنیا میں شہرت عام اور بقائے دوام حاصل کی۔ یہ خاکہ مولوی عبدالحق نے ''اُردو'' کے جولائی ۱۹۲۷ء کے شمارہ میں شائع کیا تھا۔ ''دہلی کا ایک مشاعرہ'' اور ''پھول والوں کی سیر'' ان کے دیگر غیر معمولی مضامین ہیں۔

شاہد احمد دہلوی کے یہاں نہ استعاروں کی کثرت ہے اور نہ محاوروں کی۔ ان کی عبارت میں نہ وہ شوخی ہے جو آزاد کے یہاں نظر آتی ہے، اور نہ وہ ظرافت جو نذیر احمد کے یہاں ملتی ہے۔ لیکن ان دونوں صاحب طرز ادیبوں کی نثر کے امکانات جس نقطہ پر ملتے ہیں، وہاں سے شاہد احمد دہلوی کی نثر پیدا ہوتی ہے، جس میں استعارے، محاورے، روزمرہ، رچی ہوئی زبان، مزاح کی سنجیدگی اور شگفتگی کے ساتھ مل کر ایک نئے لب ولہجہ کو جنم دیتی ہے۔ ان کی نثر میں محاورے ایسے ٹھاٹ باٹ اور ٹھسے سے استعمال میں آتے ہیں کہ انہیں کسی دوسرے لفظ یا محاورہ سے نہیں بدلا جا سکتا۔ نہ وہ بہت دور تک نذیر احمد کے ساتھ چلتے ہیں اور نہ محمد حسین آزاد کے ساتھ۔ لیکن دونوں کو اپنے ساتھ لیے، دونوں کے مزاجوں کو اپنے مزاج کے خمیر میں گوندھ کر ایک نیا مرکب تیار کرتے ہیں۔ آپ کو ان

کے ہاں دونوں کی گونج تو ضرور سنائی دے گی۔ لیکن ساتھ ساتھ یہ احساس بھی ہوگا کہ یہ ان دونوں سے مختلف ہیں۔ شاہد احمد دہلوی کی نثر میں نذیر احمد اور محمد حسین موجود بھی ہیں اور نہیں بھی۔ ان کی نثر نذیر احمد اور محمد حسین آزاد کی نثر کا ایک نیا امکان ہے۔

صنف خاکہ نگاری کے حوالے سے جمیل جالبی رقم طراز ہیں کہ اُردو ادب میں خاکہ نگاری مختصر افسانہ کی طرح ایک نئی صنف کے طور پر ظہور پذیر ہوئی۔ اس سے پہلے ہمیں طویل سوانح عمریاں تو ملتی ہیں، لیکن ان کی خشت عام طور پر ادبی کم او تاریخی زیادہ ہے۔ غالبؔ کے فوراً بعد کے دور میں سوانح نگاری نے خاص اہمیت حاصل کر لی اور حالیؔ کی ''یادگار غالبؔ''، ''حیات سعدی''، ''حیات جاوید''، شبلی کی ''حیات ابوحنیفہ''، ''المامون''، ''الفاروق'' وغیرہ سامنے آئیں۔ یہ چیزیں مستقل تصانیف ہیں اور ان میں کسی ایک شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو ہر زاویۂ نظر سے دیکھا اور دکھایا گیا ہے۔ ان میں تاریخی اہمیت زیادہ اور کردار نگاری کا عنصر کم ہے۔ انگریزی ادب کے روز افزوں اثرات کے ساتھ اُردو میں کچھ ایسی سوانح عمریاں لکھی گئیں جن میں کسی ایک کردار کو صرف اس اعتبار سے دکھایا گیا کہ وہ انسان کی حیثیت سے کیسا تھا۔ اس میں ذاتی زاویۂ نظر اور ذاتی تاثرات کو دلچسپ واقعات کے ساتھ ساتھ اس طور پیش کیا گیا کہ اس شخصیت کے خدوخال اور کردار نمایاں ہو جائیں۔ مرزا فرحت اللہ بیگ کا خاکہ ''ڈپٹی نذیر احمد کی کہانی: کچھ ان کی کچھ میری زبانی'' پیش رو کی حیثیت رکھتا ہے۔ مولوی عبدالحق نے ''چند ہمعصر'' لکھ کر فنِ خاکہ نگاری میں ایک بیش بہا اضافہ کیا۔ رشید احمد صدیقی نے ''گنج ہائے گراں مایہ'' لکھ کر مختلف ادبی و علمی شخصیتوں کو روشناس کرایا۔ انہوں نے اپنے مخصوص مزاحیہ انداز میں واقعات جمع کر کے ایسی سنجیدہ چیزیں پیش کیں کہ ان کے پڑھنے سے جیتا جاگتا انسان (جو ہر وقت انسان رہتا ہے) سامنے آجاتا ہے اور وہ کام جو مصور اپنے موقلم سے نہیں کر سکتا تھا، صاحبِ قلم نے قلم سے کر دکھایا۔ اشرف صبوحی کی ''دلی کی ہستیاں'' بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ چراغ حسن حسرتؔ نے ''مردم دیدہ'' میں اپنے جادو بیان قلم سے مزاح کے ساتھ ساتھ زندہ انسان پیش کیے ہیں۔ ''دوزخی'' لکھ

کر عصمت چغتائی نے اس صنف ادب کو ایسی فنکارانہ چابکدستی کے ساتھ استعمال کیا کہ یہ چیز افسانہ کے قریب آ کر افسانہ سے زیادہ دلچسپ ہو گئی۔ بہن نے بھائی پر لکھا، وہ چاہتی تو اسے فرشتہ بنا دیتی، اپنے بھیا کو دوزخی بنا دیا۔ لیکن پڑھنے والے کو اس دوزخی سے اتنا پیار ہو جاتا ہے کہ اس کی شخصیت کا جادو سر چڑھ کر بولنے لگتا ہے۔

یہاں یہ بات بے محل نہ ہوگی کہ خاکہ نگاری افسانہ نگاری کے بین بین ہے۔ مختصر افسانہ نگاری میں کردار نگاری کا سلسلہ شروع ہوا۔ افسانہ نگار عام زندگی میں کسی کردار سے متاثر ہوا اور اس نے اس تاثر میں تخئیل کی سحر کاریوں کا اضافہ کر کے ایک انسانی کردار پیش کر دیا۔ منٹو نے اس قسم کے بہت سے کردار، مثلاً بابو گوپی ناتھ، موذیل اور کالی شلوار کا شنکر وغیرہ اُردو ادب کو دیے۔ عصمت کرشن چندر اور دوسرے افسانہ نگاروں نے اسی قسم کے خاکہ نما افسانے لکھے۔ گویا خاکہ نگاری ایک ایسی صنف ادب قرار پائی جس میں کسی ایسے انسان کے خدوخال پیش کیے جائیں کسی ایسی شخصیت کے نقوش اُبھارے جائیں جس سے لکھنے والا خلوت وجلوت میں ملا ہو۔

۱۹۵۰ء سے ۱۹۶۲ء تک شاہد احمد دہلوی نے جن شخصیات پر خاکے تحریر کیے ان کے ظاہر و باطن سے وہ کماحقہ آشنا تھے۔ بعض کے ساتھ تو ان کی دانت کاٹی روٹی تھی جیسے مرزا عظیم بیگ چغتائی، جمیل جالبی، بعض ان کے بڑے تھے جن سے انہوں نے علم وفن کے آداب سیکھے تھے۔ جیسے مولانا عبدالسلام نیازی، خواجہ حسن نظامی، میر ناصر علی، بیخود دہلوی وغیرہ۔

شاہد احمد دہلوی کا انداز نگارش اتنا شائستہ اور پُرشکوہ ہے کہ ہر جملے پر تحسین وآفرین کی صدائیں بلند کرنے کو جی چاہتا ہے۔ بزم خوش نفساں میں مولوی نذیر احمد، پروفیسر ناصر علی، اُستاد بیخود دہلوی، خواجہ حسن نظامی، بشیر الدین احمد دہلوی، مولانا عنایت اللہ، میراجی، پروفیسر مرزا محمود سعید، ایم۔ اسلم، جوش ملیح آبادی، جگر مرادآبادی، حکیم کیف دہلوی، اُستاد بندو خاں جیسی کمیاب ہستیوں پر لازوال خاکے لکھ کر انہیں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے زندہ وتابندہ کر دیا ہے۔ شاہد احمد دہلوی کے دل پذیر خاکے پڑھ کر ہمیں تو اپنی ادبی

غرابت کا شدید احساس ہوا۔ انہوں نے اپنے ان خاکوں میں سراپا نگاری کا ایسا جادو جگایا ہے کہ پڑھنے والا طلسم حیرت میں کھو جاتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ انہوں نے اپنے قلم سے موقلم کا کام لیا ہے اور ایسی دلآویز اور موہنی تصویریں بنائی ہیں کہ دل پر نقش ہو جاتی ہیں اور ہم ان سے عشق کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

ایمان کی کہیں تو، سچ تو یہ ہے کہ خاکہ نگاری کا فن ان پر تمام ہوا۔ حالانکہ ان کے بعد بھی محمد طفیل مدیر نقوش اور احمد ندیم قاسمی نے بعض ممتاز ادبی شخصیتوں پر خاکے لکھے ضرور، مگر وہ نوری زیادہ تھے اور ناری کم۔ خاکے میں چسک تو تبھی پیدا ہوتی ہے، جب اہل خاکہ میں اہرمن اور یزداں دونوں کی شبیہیں اُتاری جائیں۔

اسی طور ''اُجڑا دیار'' میں شامل مضامین میں دلی کی معاشرتی اور تہذیبی زندگی کی جھلکیاں پیش کی گئی ہیں جو ۱۹۴۷ء تک اہل دانش وبینش کی جولانگاہ بنی ہوئی تھی۔ ۱۹۴۷ء میں دلی جب دلی والوں کے لیے واقعی اُجڑ گئی تو شاہد احمد دہلوی کے لیے اس کا شدید احساس سوہان روح بن گیا اور انہوں نے ان ہستیوں کا تذکرہ لکھنا شروع کر دیا جن کے دم قدم سے ۱۹۴۷ء تک دلی صحیح معنوں میں دلی تھی۔

''دلی کے چٹخارے''، ''دلی کے دل والے''، دلی کی گرمی''، ''باغ کی سیر''، ''قطب صاحب کی سیر''، ''پھول والوں کی سیر''، ''چوک کی بہار''، ''شام کی چہل پہل''، ''چٹور پن''، ''دلی کے حوصلہ مند غریب''، ''دلی والوں کے شوق''، ''رہن سہن کی ایک جھلک''، ''بھانڈ اور طوائفیں''، ''دلی کا ایک شریف گھرانہ''، ''دلی کی ایک پُرانی حویلی''، ''دلی کے چند گیت''، ''روزہ کشائی''، ''میٹھی عید''، ''سلونی عید''، ''بسنت کی بہار''، ''راگ رنگ کی ایک رات''، ''دلی کا آخری تاجدار'' اور ''شاہجہانی دیگ کی کھرچن'' جیسے معرکۃ الآرا مضامین میں اس دلّی کی بازیافت کی گئی ہے جسے شاہد احمد دہلوی نے اپنی آنکھوں سے روح میں اُتارا تھا اور دل کے آئینہ میں سجایا تھا۔ ان کے عمیق مطالعے سے ہمیں دلی اور دلی والوں کی رخشندہ تہذیب کے بطن سے پھوٹتی ہوئی شعاؤں سے خیرگی کا احساس ہوتا ہے۔ جو ہمارے لیے تزکیۂ نفس اور تطہیر نفس کا باعث ہوتا ہے۔ وہ تہذیب کیا تھی اور وہ معاشرت

کیسی تھی؟ اسے بیان کرنے کے لئے دفتر درکار تھے، مگر شاہد احمد دہلوی کے فن کی خوبی یہ ہے کہ انہوں نے اس کارِ مشکل پسند کو آسان کر دکھایا۔ انہیں مصورِ دلی کہا جائے تو بھی حق ادا نہ ہوگا۔ حق تو ہے کہ انہوں نے دہلوی تہذیب کو جو رنگ و رامش عطا کیا ہے وہ محض ان ہی کا حصہ تھا۔ زرین ماضی کی بازآفرینی میں انہوں نے جگر کو پانی کیا ہے۔ بلاشبہ وہ اپنے اس عظیم الشان کارنامے کے لیے لائق صد تحسین ہیں۔

بقول اسلم فرخی...... ''دلی آنے والے ادیبوں کے لیے شاہد بھائی کا گھر راحت کدہ تھا۔ چغتائی سے لے کر مہاشے سدرشن تک سبھی آتے تھے۔ یہ دستور کراچی میں بھی جاری رہا۔''

شاہد احمد دہلوی نے بے شمار ادیبوں کو ساقی میں چھاپ کر ان کی ساکھ بنا دی۔ کراچی آئے تو یہاں بھی یہی شغل جاری رکھا۔ مگر دلی سے مراجعت ان کے دل کا گھاؤ بن گئی تھی۔ وہ دلی اور دلی والوں کو کبھی نہ بھول سکے۔ ان کی یادوں کو سیتے اور سنجوتے رہے، کہ یہی ان کا سرمایہ حیات تھیں۔ کراچی میں پرانے رفیقوں فضل حق قریشی، انصار ناصری اور بعض دوسرے احباب کی بے رُخی کو شاہد بھائی نے بہت محسوس کیا۔ لیکن بقول اسلم فرخی، دِل پر ہاتھ رکھ لیا لیکن زبان سے کوئی شکایت نہ کی۔

بظاہر وہ خوشحال رہتے تھے۔ چہل سے شاہد بھائی کو لطف آتا تھا۔ فراقؔ اور آثرؔ کی معرکہ آرائی ایسی ہی ایک چہل تھی۔ آثرؔ کے خلاف فراق کا بارہ صفحے کا ایک مضمون ساقی میں شائع ہوا تھا جس میں ولی سے مجاز تک کے اشعار میں تحریف کر کے اثر کی ہجو کی گئی تھی۔ پھبتیاں ہی پھبتیاں تھیں۔ ثقہ لوگوں نے اسے پسند نہیں کیا۔ مگر شاہد بھائی اسے پڑھ کے ہنستے تھے اور ان کے معاون حسن عسکری بھی اپنی تمام تر سنجیدگی و متانت کے باوجود ہنستے تھے۔

ادبی مسائل ہوں یا لسانی مسائل ہوں، شاہد صاحب کا رویہ صاف اور واضح ہوتا تھا۔ لگی لپٹی نہیں رکھتے تھے۔ سرکاری رسالے ماہ نو کراچی کے خلاف ساقی میں اداریہ لکھا تو بہت سخت! اُردو کے مسئلہ پر محمد طفیل (مدیر نقوش، لاہور) کو جواب دیا تو بہت سخت۔

مسائل کے سلسلے میں وہ کسی طرح کی لچک یا سمجھوتے کا مظاہرہ نہیں کرتے تھے۔ شمشیر برہنہ تھے۔ مگر دل میں کچھ نہیں رکھتے تھے۔

جوشؔ صاحب سے بگڑی تو انہوں نے ان کے خلاف ساقی کا جوش نمبر نکال دیا۔ مضامین کی جستجو میں دلی آئے۔ یارانِ نقد ونظر سے مسکت مضامین لکھوائے۔ جوش کے خلاف لکھنے والوں میں ہمارے اُستاد خلیل الرحمٰن اعظمی بھی تھے۔ ہمارے پاس ساقی کا جوش نمبر تھا۔ افسوس گردش ایام میں کہیں ضائع ہو گیا۔ جوش صاحب نے نذیر احمد کی زبان پر اعتراض کر دیا تھا اور کہیں کہیں سے اصلاح بھی کر دی تھی۔ شاہد احمد دہلوی نے اپنی برہمی کے اظہار کے طور پر جوش نمبر نکالا۔

شاہد احمد دہلوی بلا کے محبتی بھی تھے۔ عظیم بیگ چغتائی، جمیل جالبی، اسلم فرخی اور شمس زبیری پر جان چھڑکتے تھے۔ پریم چند اور مہاشئے سدرشن کی بے پناہ عزت کرتے تھے۔ پریم چند کی شرافت اور نجابت کے دل سے قائل تھے۔ بقول ان کے ''پریم چند کے ساقی میں افسانے کم شائع ہوئے کیونکہ افسانہ مکمل ہوتے ہی یار لوگ اُچک لیتے تھے۔''

ساقی کے مدیر شاہد احمد دہلوی کے بعد جن لوگوں کے دم خم سے دلی کی محفلیں ہری بھری تھیں، انہوں نے بھی ایک ایک کر کے رخت سفر باندھا۔ علامہ تربھون ناتھ زآر دہلوی، مہیشور دیال، میر مشتاق، مولانا امداد صابری، گوپی ناتھ امن طالبؔ دہلوی، بشیشور پرساد منور، مرزا محمود بیگ ہمارے دیکھتے دیکھتے داستان پارینہ بن گئے۔ یہ وہ لوگ تھے جن کے دم قدم سے دلی کا سہاگ برقرار تھا۔ ہمارے ہم عصروں میں لے دے کے ڈاکٹر اسلم پرویز، سید ضمیر حسن دہلوی، شاگرد مرزا محمود بیگ، محمد ذاکر، فیروز دہلوی، ڈاکٹر صلاح الدین خاں، باقیات الصالحات میں سے ہیں جو گاہے بگاہے ادب کی چھتری پر تخئیل کے کبوتر اُڑاتے رہتے ہیں۔ مشترکہ تہذیب کے نمائندہ گلزار دہلوی کا دم غنیمت ہے جن کے فعال وجود کے بنا پر مشاعروں کی چہل پہل قائم ودائم ہے۔

''دلی سوسائٹی'' کے مدیر سعید خان نے بھی پر پرواز باندھا جن کے زندہ وجود سے دلی کی شمع روشن تھی، اور دلی والے بقعہ نور بنے ہوئے تھے۔

نصف دلی والے تو ہم بھی ہیں کہ ہم نے اپنی عمر عزیز کا زریں حصہ دلی کی گلیوں میں گزارا اور وہاں کی خاک کو آنکھوں کا سرمہ بنایا اور دلی کی اینٹ روڑوں کو جوڑ کر بھان متی کا کنبہ آباد کیا۔ بات کہاں سے کہاں نکل گئی۔ لیجیے، شاہد احمد دہلوی کی بعض منتخب تحریریں پیش خدمت ہیں۔ شاید اس طور ناخن کا کچھ قرض ادا ہو جائے۔

○○

— فیاض رفعت

(محترم اسلم فرخی اور آصف فرخی کا میں دل سے سپاس گزار ہوں جن کی مرتب کردہ کتاب ''بزم شاہد'' سے مجھے استفادے کا موقع ملا۔ مرتب)

گنج ہائے گرانمایہ

(''اُجڑا دیار'' سے منتخب مضامین)

دِلی کے چٹخارے

شاہ جہاں بادشاہ نے آگرہ کی چلچلاتی گرمی سے بچنے کے لئے دلی کو حکومت کا صدر مقام بنانے کے لئے پسند کیا، اور جمنا کے کنارے قلعہ معلیٰ کی نیو پڑی۔ یہاں ہو کا عالم تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے جمنا کے کنارے کنارے ہلالی شکل میں شہر آباد ہونا شروع ہو گیا۔ ہزاروں مزدور قلعہ کی تعمیر میں لگ گئے۔ ان کے بال بچے، کنبے قبیلے والے سب مل ملا کر لاکھ ڈیڑھ لاکھ آدمی تو ہوں گے۔ ان کی ضروریات پوری کرنے کے لئے سودا سلف بیچنے والے بھی آ گئے۔ گھاس پھونس کی جھونپڑیاں اور کچے مکانوں کی آبادی میں خاصی چہل پہل رہنے لگی۔ لال قلعہ کے پہلو میں دریا گنج کے رُخ متوسلین شاہی اور امیر امرا کے محلات، ڈیوڑھیاں اور حویلیاں بننی شروع ہو گئیں۔ ادہر قلعہ کے سامنے پہاڑی پر جامع مسجد ابھرنی شروع ہوئی۔ شہر کے بازاروں کے نقشے بنے۔ جہاں اب پریڈ کا میدان ہے یہاں اُردو بازار۔ خانم کا بازار اور خاص بازار تھا۔ چاندنی چوک یہی تھا اور قلعہ کے چوک پر ختم ہوتا تھا۔ جا بجا نہروں اور باغوں سے شہر کو سجایا گیا تھا۔ جب قلعہ کی تعمیر مکمل ہوئی اور بادشاہ نے اس میں نزول اجلال فرمایا تو شاہ جہاں آباد سج سجا کر دُلہن بنا۔

پہلا دربار ہوا تو بادشاہ نے خزانے کا منہ کھول دیا۔ مغل شہنشاہوں کی بے انتہا دولت پانی کی طرح بہنے لگی اور رعایا فارغ البال اور مالا مال ہو گئی۔ بادشاہ کے حکم کے مطابق بازاروں میں دُنیا زمانے کی چیزیں موجود۔ اس کے علاوہ فرمان ہوا کہ روزمرہ

سودا گلی گلی اور کوچے کوچے پھیری والے آواز لگا کر بیچیں، چنانچہ دلی میں یہی دستور چلا آتا تھا کہ گھر بیٹھے ایک پیسے سے لے کر ہزار روپے کی چیز پھیری والوں سے بازار کے بھاؤ خرید لو۔ اصل میں پردہ نشین خواتین کی آسائش بادشاہ کو منظور تھی کہ جس کا جی چاہے اپنی ڈیوڑھی پر ضرورت کی چیز لے لے۔ دلی کی عورتیں بیٹی کا پورا جہیز گھر بیٹھے خرید کر جمع کر لیا کرتی تھیں۔ گھر سے قدم نکالنا بُرا سمجھا جاتا تھا۔ جس گھر میں ان کا ڈولا آتا تھا اس گھر سے ان کی کھاٹ ہی نکلتی تھی۔

کنجڑے، قصائی، کمیرے، ٹھٹیرے، قلعی گر، بڑھئی، کھٹ بنے، بزاز، منیہار، فصل کا میوہ اور رُت کا پھل بیچنے والے، حد یہ کہ پھول والے تک بڑی دلکش آواز لگاتے تھے اور گلی گلی سودا بیچتے پھرتے تھے۔ ان کی آوازیں پھر کبھی آپ کو سنائیں گے، اس وقت تو صرف ایک آواز سن لیجئے......

''ریشم کے جال میں ہلایا ہے، نکتیاں بنا قدرت کا اُودا بنا جلیبا کھالو۔'' ایک تو بول دلکش، اس پر ترنم غضب۔ جی ادبدا کر یہی چاہتا ہے کہ سودے والا خالی نہ جانے پائے۔ گنڈے دمڑی کی اوقات ہی کیا؟ جھٹ آواز دی ''اے بھئی جلیبے والے، یہاں آنا۔'' ''اچھا بوا'' کہہ کر وہ ڈیوڑھی پر آ گیا۔ ''ہاں بوا، کیا حکم ہے؟''

''اے بھئی حکم اللہ کا۔ دھیلے کا جلیبا دے جاؤ۔''

پھیری والا دھیلے کے ڈھیر سارے شہتوت دے گیا۔ اچھے زمانے، سستے سمے، پیسے میں چار سودے آتے تھے۔ دلی کے دل والے سدا کے چٹورے ہیں۔ شاید اس زبان کے چٹخارے کے ذمہ دار یہی چٹ پٹے پھیری والے ہیں جن کی سریلی آوازیں دل کو کھینچتی ہیں۔ شاید ہی کوئی سودے والا ہو جو کسی شوم کے گھر سے خالی جاتا ہو۔ دھیلی پاؤلا ہر گلی سے مل جاتا ہے۔ باہر والے دلی والوں کے یہ طور طریقے دیکھتے تو ان کی آنکھیں پھٹتیں۔ شاہی ۱۸۵۷ء کے ساتھ ختم ہوئی مگر دلی والوں کی زبان کا چٹخارہ اور شاہ خرچیاں پھر بھی نہ گئیں۔

زبان کے چٹخارے کا ذکر آیا ہے تو اس شہر والوں کے ایک اسی پہلو کو لے لیجئے۔

دلی والوں کو اچھا کھانا اور طرح طرح کے کھانوں کا شوق تھا۔ یہ شوق انہیں ورثے میں ملا تھا۔ اگلے دلی والوں میں شاید ہی کوئی ایسا ہو جو بادشاہ سے بالواسطہ یا بلاواسطہ وابستہ نہ ہو۔ بادشاہ کی دولت میں سے حصہ رسد سب کو پہونچتا تھا۔ مہنگائی نام کو نہ تھی۔ روپے پیسے کی طرف سے فراغت، بے فکری سے کماتے تھے اور بے فکری سے اُڑاتے تھے۔ اور باتوں کی طرح کھانے پینے میں بھی قلعہ والوں کی تقلید کی جاتی تھی۔ ہر قسم کے کھانے رکابدار اور باورچیوں سے تیار کرائے جاتے تھے۔ہفت ہزاری سے لے کر ٹکے کی اوقات والے تک ہر ایک کو خود بھی اپنے ہاتھ کا کمال دکھانے کا شوق تھا۔ آخری بادشاہ بہادُر شاہ ظفؔر نے کئی کھانے ایجاد کئے جن میں سے مرچوں کا سالن ڈُلہ آج بھی دلی والوں کے گھروں میں پکایا جاتا ہے۔ غریبوں میں اب بھی کسی کسی کے ہاں طاہری ایسی پکتی ہے کہ بریانی اس کے آگے ہیچ ہے۔ کبھی ان کے ہاں مونگ پلاؤ یا یخنی پلاؤ کھانے کا اتفاق ہو تو انگلیاں ہی چاٹتے رہ جایئے۔ ماش کی دال ایسی مزے دار کہ کوئی اور لگاون اس سے لگا نہیں کھاتے۔

گھروں کے علاوہ بعض بازار کے دکانداروں نے کسی ایک چیز میں ایسا نام پایا کہ آج تک ان کی مثال دی جاتی ہے۔ مثلاً گھنٹے والا حلوائی، چڑیا والا کبابی، سرکی والوں کا کھیر والا، پائے والوں کے چچا کبابی، قابل عطار کے کوچے کا حلوہ سوہن والا، شاہ گنج کا نواب قلفی والا، فراش خانے کا شابو بھٹیارا، لال کنویں کا حاجی نانبائی اور چاندنی چوک کا گنجا نہاری والا۔ یہ وہ نام ہیں جو دلی میں زبان زدِ عام تھے۔ ورنہ شاید ہی کوئی محلّہ ایسا ہو جس میں ان سب سودے بیچنے والوں کی دکانیں نہ ہوں۔ مشہور دکانداروں کے ہاں سودا سلف صاف ستھرا، نفیس اور ذائقہ دار ہوتا ہے۔ پشت ہا پشت سے ان کے ہاں یہی کام ہوتا چلا آتا ہے۔ ان کے خاندانی نسخے ان کے سینوں میں محفوظ رہتے ہیں، اور کہا جاتا ہے کہ ہر کاروبار کی طرح ان کے بھی چند بھید ہوتے ہیں۔ عوام کے اس نظریئے نے اتنی شدت اختیار کی کہ طرح طرح کی روایتیں اور افواہیں شہر میں پھیل گئی تھیں۔

چاچا کبابی گولے کے کباب ایسے بناتے تھے کہ سارا شہر ان پر ٹوٹا پڑتا تھا۔

پائے والوں کے رخ جامع مسجد کی سیڑھیوں کے پہلو میں ان کا ٹھیا تھا۔ چچا کے دادا کے کباب بادشاہ کے دسترخوان پر جایا کرتے تھے۔ شہر میں مشہور تھا کہ چچا کے دادا جیسے کباب نہ تو کسی نے بنائے اور نہ آئندہ بنائے گا۔ ان میں کچھ ایسا سلونا پن پایا جاتا تھا کہ کھانے والا ہونٹ چاٹتا رہ جاتا تھا۔ ہم نے اکثر بڑے بوڑھوں سے پوچھا کہ آخر ان کبابوں میں اور اُن کبابوں میں فرق کیا ہے؟ وہ کہتے ''میاں بس چپکے ہو جاؤ۔ کچھ کہنے کا مقام نہیں ہے۔''

''آخر کچھ تو بتایئے۔''

''میاں سمجھے بھی یہ سلونا پن کاہے کا ہوتا تھا؟''

''نمک کا ہوتا ہوگا۔''

''اونھ۔ اماں آدمی کا گوشت کھلاتا تھا، آدمی کا۔''

''آدمی کا گوشت؟''

''اور نہیں تو کیا۔ جب وہ پکڑا گیا ہے اور اس کے گھر کی تلاشی ہوئی ہے تو سینکڑوں کھوپڑیاں تہہ خانے میں سے نکلیں۔''

''آپ نے خود دیکھا تھا؟''

''خود تو نہیں دیکھا، البتہ کان گنہگار ہیں۔''

''روزانہ آدمی غائب ہوتے رہیں اور کوئی انہیں تلاش نہ کرے؟''

''کیا پتہ چل سکتا ہے؟ آدمیوں سے دُنیا بھری پڑی ہے''

''مگر کھوپڑیاں آخر تہہ خانے میں کیوں بھر رکھی تھیں؟''

''اوہو بھئی مجھے کیا معلوم؟''

''مگر۔''

''اگر مگر کچھ نہیں۔ تمہاری تو عادت ہی حجت کرنے کی ہے۔''

ناراض ہو کر چلے گئے۔

لاحول ولاقوۃ۔ بھلا یہ بھی کوئی سمجھ میں آنے والی بات ہے؟ سچ ہے، افواہوں کی

دیوی بڑی بھیانک ہوتی ہے جو اپنی ہزاروں خاموش لٹکی ہوئی زبانوں سے ہوا میں بِس گھولتی رہتی ہے۔

اصل میں اجزائے ترکیبی کے صحیح اور خاص تناسب کی وجہ سے ایک مخصوص ذائقہ پیدا ہو جاتا ہے۔ پھر تاؤ بھاؤ بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ بھلا کھیر ایسی کونسی انوکھی چیز ہے؟ گھر گھر پکتی ہے۔ مگر سرکی والوں کی دکان کے پیالوں میں کچھ اور ہی مزہ ہوتا تھا۔ وہی دودھ، چاول اور شکر کا آمیزہ ہے، مگر تناسب اور تاؤ بھی تو ہے، یہ معلوم ہوتا تھا کہ دولت کی چاٹ کھا رہے ہیں۔

شابو بھٹیارے کے ہاں کا شوربہ مشہور تھا۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ......

''ہمارے ہاں بادشاہی وقت کا شوربہ ہے۔''

''ارے بھئی بادشاہی وقت کا؟ یہ کیسے؟''

''اجی وقت یہ ایسے کہ ہم شوربے میں سے روزانہ ایک پیالہ بچا لیتے ہیں، اور اگلے دن کے شوربے میں ملا دیتے ہیں۔ یہ دستور ہمارے ہاں سات پیڑھی سے چلا آرہا ہے۔ یوں ہمارا شوربہ شاہی زمانے سے چلا آتا ہے۔''

حاجی نانبائی کے ہاں یوں تو شادی بیاہ کے لئے خمیری، کلچے اور شیر مال تیار کئے جاتے اور ایسے ملائم کہ ہونٹوں سے توڑ لو، مگر ان کا ہنر دیکھنا ہو تو فرمائش کر کے پکوا لیجئے۔ روٹیوں کے نام ہی سن لیجئے......

روغنی روٹی، بری روٹی، قیمہ بھری روٹی، بیسنی روٹی، گاؤدیدہ، گاؤزبان، باقر خانی، شیرمال، بادام کی روٹی، پستے کی روٹی، چاول کی روٹی، گاجر کی روٹی، مصری کی روٹی، غوثی روٹی، نان منبہ، نان گلزار، نان قماش، تافتان، روے کے پراٹھے، میدے کے پراٹھے، گول، چوکور، تکونے۔ غرض روٹی کی کوئی شکل اور ترکیب ایسی نہیں ہے جو ان کے تندور میں تیار نہ ہو سکتی ہو۔

حاجی نان بائی کا ذکر آیا تو یاد ش بخیر میاں گنجے نہاری والے یاد آ گئے۔ اصل میں نہاری والے نان بائی ہی ہوتے ہیں، بھٹیارے نہیں ہوتے۔ نہاری تو جاڑوں میں کھائی

جاتی ہے۔ گرمیوں اور برسات میں نہیں کھائی جاتی۔ خالی دنوں میں نہاری والے اپنا تندور گرم کرتے ہیں اور روٹی پکانے پر ان کی گزراوقات ہوتی ہے۔ ۴۷ء میں دلی اُجڑنے سے پہلے تقریباً ہر محلے میں ایک نہاری والا موجود تھا۔

لیکن اب سے ۴۰۔۵۰ سال پہلے صرف چار نہاری والے مشہور تھے۔ انہوں نے شہر کے چاروں کھونٹ داب رکھے تھے۔ گنجے کی دکان چاندنی چوک میں نیل کے کٹڑے کے پاس تھی، اور شہر میں اس کی نہاری سب سے مشہور تھی۔

دِلّی سے باہر اکثر لوگ یہ بھی نہیں جانتے تھے کہ نہاری کیا ہوتی ہے۔ بعض شہروں میں یہ لفظ کچھ اور معنوں میں مستعمل ہے۔ مثلاً چوپایوں کو، خصوصاً گھوڑوں کو تقویت دینے کے لئے ایک گھولوا پلایا جاتا ہے جسے نہاری کہتے ہیں۔ بعض جگہ پایوں کو نہاری کہا جاتا ہے۔ دلّی میں یہ ایک خاص قسم کا سالن ہوتا تھا جو بڑے اہتمام سے تیار کیا جاتا تھا اور بازار میں فروخت ہوتا تھا۔ اس کے پکانے کا ایک خاص طریقہ ہے اور اس کے پکانے والے بھی خاص ہوتے ہیں۔ نہاری کو آج سے نہیں ۱۸۵۷ء کے پہلے سے دلی کے مسلمانوں میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔ یوں تو گھر میں بھی اور باہر بھی سینکڑوں قسم کے قورمے پکتے ہیں مگر نہاری ایک مخصوص قسم کا قورمہ ہے جس کا پکانا سوائے نہاری والوں کے اور کسی کو نہیں آتا۔ اس کی پُخت و پُز کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اسے ساری رات پکایا جاتا ہے، اور پکنے کی حالت میں ہمہ وقت اس کا تاؤ مساوی رکھا جاتا ہے۔ اس کام کے لئے بڑی مشق و مہارت کی ضرورت ہے۔ تیسرے پہر سے اس کی تیاری شروع ہوتی ہے۔ دکان کی دہلیز کے پاس زمین میں گڑھا کھود کر ایک گہرا چولہا یا بھٹی بنائی جاتی ہے اور اس میں ایک بڑی سی دیگ اس طرح اتار کر جمادی جاتی ہے کہ صرف اس کا گلا باہر نکلا رہ جاتا ہے۔ چولہے کی کھڑکی باہر کے رخ کھلتی ہے۔ اس میں سے ایندھن ڈالا جاتا ہے جو دیگ کے نیچے پہونچ جاتا ہے۔ آگ جلانے کے بعد جیسے قورمے کا مسالا بھونا جاتا ہے گھی میں پیاز داغ کرنے کے بعد دھنیا، مرچیں، لہسن، ادرک اور نمک ڈال کر نہاری کا مسالا بھونا جاتا ہے۔ جب مسالے میں جالی پڑ جاتی ہے تو گوشت کے

پارچے، خصوصاً ادلے ڈال کر انہیں بھونا جاتا ہے۔ اس کے بعد اندازے سے پانی ڈال کر دیگ کا منھ بند کر دیا جاتا ہے۔

پکانے والے کو جب آدھ گلے گوشت کا اندازہ ہو جاتا ہے تو دیگ کا منہ کھول کر اس میں پچیس تیس بھیجے اور اتنی ہی نلیاں یعنی گودے دار ہڈیاں ڈال دی جاتی ہیں۔ شوربے کو لبدھڑا بنانے کے لئے آلن ڈالا جاتا ہے۔ پانی میں آٹا گھول کر آلن بنایا جاتا ہے۔ یہ دیگ ساری رات پکتی رہتی ہے اور اس کا تاؤ دھیما رکھا جاتا ہے۔ بارہ چودہ گھنٹے پکنے کے بعد جب علی الصبح دیگ پر سے کونڈا ہٹایا جاتا ہے تو دور دور تک اس کی اشتہاء انگیز خوشبو پھیل جاتی ہے۔

سب سے پہلے دیگ میں سے بھیجے اور نلیاں نکال کر الگ لگن میں رکھ لی جاتی ہیں۔ پھر گاہکوں کا بھگتان شروع ہوتا ہے۔ یہ کھانا چونکہ دن کے شروع ہوتے ہی کھایا جاتا ہے اس لئے اس کا نام نہار کی رعایت سے نہاری پڑ گیا۔

ہاں تو ذکر تھا گنجے نہاری والے کا۔ دلّی والوں کے علاوہ قرب وجوار سے بھی لوگ ان کی نہاری کھانے آیا کرتے تھے۔ خصوصاً علی گڑھ کالج کے لڑکے اتوار کو دھاوا بولا کرتے تھے۔ اسی سلسلے میں ہمیں بھی چند بار گنجے صاحب کی نہاری سے لطف اندوز ہونے کا موقع ملا۔ ان کی دکان گجر دم کھلتی تھی اور کھلنے سے پہلے گاہک موجود ہوتے تھے۔ کسی کے ہاتھ میں پتیلی، کوئی بادیہ، کوئی ناشتہ دان سنبھالے سردی میں سکڑتا، سوں سوں کرتا ٹہل لگا رہا ہے۔ نپی تلی ایک دیگ پکتی اور ہاتھوں ہاتھ بک جاتی۔ ذرا دیر سے پہونچے تو میاں گنجے نے معذرت کے لہجے میں کہا۔

"میاں اب خیر سے کل لیجئے گا، اور ذرا سویرے آیئے گا۔"

نہاری کے مسالوں کا وزن اور پکانے کا طریقہ اوروں کو بھی معلوم ہے مگر وہ ہاتھ اور نگاہ جو اُستاد گنجے کو میسر تھی وہ کسی اور کو نصیب نہ ہوئی۔ اکثر لوگ خود ان سے دریافت بھی کرتے تھے کہ "آخر اُستاد کیا بات ہے کہ دوسروں کے ہاتھ کی نہاری میں یہ لذت نہیں ہوتی؟" وہ ہنس کر کہہ دیا کرتے تھے کہ "میاں بزرگوں کی جوتیوں کا صدقہ اور

حضرت سلطان جی کا فیض ہے۔ ورنہ میں کیا اور میری بساط کیا؟''

اُستاد گنجے کے کردار پر روشنی ڈالنے سے پہلے ضروری ہے کہ کچھ ان کا سراپا بھی بیان کر دیا جائے۔ ''گنجے'' کے نام سے خواہ مخواہ ذہن میں ایک کراہت سی پیدا ہوتی ہے۔ نفیس مزاج اور نازک خیال لوگ تو گنجے کے ہاتھ کا پانی پینا بھی گوارہ نہیں کر سکتے۔ لیکن اُستاد کو تو سرے سے گنج کی بیماری تھی ہی نہیں۔ اصل میں ان کی چندیا کے بال جھڑ گئے تھے اور ٹانٹ صاف ہو کر تامڑا نکل آیا تھا، جس کے تین طرف چار انگل چوڑی بالوں کی ایک جھالر سی تھی۔

دلّی کے چلبلی طبیعت والے بھلا کب چوکنے والے تھے۔ گنجے کی پھبتی ان پر کسی، اور یہ کچھ ایسی جمی کہ چپک کر رہ گئی۔ گندمی رنگ کا گول چہرہ، خشخشی ڈاڑھی، بڑی بڑی چمکدار مگر حلیم آنکھیں۔ باوجود نہاری فروشی کے ان کا لباس ہمیشہ صاف ستھرا رہتا تھا۔ لٹھے کا شرعی پاجامہ، نیچا کرتہ، کرتے پر بہت صوفیانہ چھینٹ کی نیم آستین سر پر صافہ۔ کسرتی اور بھرا بھرا بدن، کوئی دیکھے تو سمجھے کہ بڑے خرانٹ ہیں۔ بات بات پر کاٹنے کو دوڑتے ہوں گے، مگر ان کی طبیعت اس کے بالکل برعکس تھی۔ بالعموم نامی دکاندار بڑے بدمزاج اور غصیل ہوتے ہیں، جیسے چچا کبابی کہ بڑے ہتھ چھٹ تھے اور مار پیٹ تک سے نہیں چوکتے تھے۔ اُستاد گنجے بڑے خلیق اور رکھ رکھاؤ کے آدمی تھے۔ ہم نے کبھی نہیں سنا کہ انہیں تاؤ آیا ہو، یا کبھی ان کے منہ سے کوئی ناشائستہ کلمہ نکلا ہو۔ ہر گاہک سے چاہے وہ آنے دو آنے کا ہو، چاہے روپے دو روپے کا، بڑی نرمی سے بات کرتے اور مستقل گاہکوں کو تو اپنا مہمان سمجھتے تھے۔

اُستاد گنجے کے کردار میں سب سے نمایاں چیز ان کا علم اور انکسار تھا۔ حضرت نظام الدین اولیا سے جنہیں دلّی والے سلطان جی کہتے ہیں، اُستاد گنجے کو بڑی عقیدت تھی، اور یہ سلطان جی ہی کا روحانی تصرّف تھا کہ اُستاد کا دل گداز ہو گیا تھا۔ وہ اپنی ساری کمائی غریبوں، مسکینوں اور محتاجوں کی امداد کرنے میں صرف کر دیا کرتے تھے۔

سلطان جی کی سترھویں میں اپنی دکان بڑے اہتمام سے لے جاتے تھے اور

سارے دنوں میں جمعرات کے جمعرات درگاہ میں حاضری پابندی سے ہوتی تھی۔ روپے پیسے سے خوش تھے مگر دلی سے سلطان جی کی درگاہ پیدل جایا کرتے تھے۔ ہر موسم کے لحاظ سے محتاجوں کو کپڑا تقسیم کرتے تھے۔ ہر مہینے گیارہویں کی تیاری ان کے ہاں بڑی دھوم سے ہوتی۔ دن بھر لنگر جاری رہتا۔ جمعرات کو ان کی دکان پر فقیروں کی لنگتار رہتی اور سب کو پیسہ ٹکا ملتا۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ دکانداری شروع کرنے سے پہلے اللہ نام کا حصہ نکالا کرتے۔ اگر کوئی محتاج موجود ہوا تو پہلے اسے کھلایا ورنہ نکال کر الگ رکھ دیا۔ پھر دیگ میں سے بھیجے اور نلیاں نکال کر طباق میں رکھیں، تار اور رونق کو ایک بڑے بادیئے میں الگ نکال لیا۔ اس کے بعد دکانداری شروع ہوئی۔

دُکان میں بیسوں پتیلیاں، دیگچے اور برتن رکھے ہیں۔ کسی میں دو روپے، کسی میں روپیہ، کسی میں بارہ آنے، کسی میں آٹھ آنے پڑے ہیں۔ شوقین اور قدردان رات ہی کو اپنے اپنے برتن دے گئے ہیں کہ صبح کو مایوس نہ ہونا پڑے۔ سب سے پہلے انہی برتنوں کی طرف اُستاد کی توجہ ہوتی ہے۔ بڑی تیزی اور پھرتی سے ہاتھ چلاتے ہیں، ادھر گاہکوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگے ہیں۔ ان کی آسائش کا بھی انہیں خیال ہے۔ گاہک بھی جانتے ہیں کہ جن کے برتن پہلے آگئے ہیں انہیں نہاری پہلے ملے گی۔ کسی باہر والے نے، جو یہاں کے قاعدے قرینے نہیں جانتا، جلدی مچائی تو اُستاد نے رسان سے کہا۔ ''ابھی دیتا ہوں۔ جو پہلے آیا ہے اسے اگر پہلے نہ دوں گا تو شکایت ہوگی۔''

برتنوں کی لین ڈوری ختم ہوئی تو گاہکوں کا بھگتان شروع ہوا۔ دو روپے سے دو پیسے تک کے خریدار موجود، اور سب کو حصہ رسد ملتا ہے۔ تین گھنٹے میں ڈیڑھ دو سو گاہکوں کو نہاری دی اور دیگ نخی کے دل کی طرح صاف ہوگئی۔ اب جو کوئی آتا ہے تو بڑی انکساری سے کہتے ہیں۔ ''میاں معافی چاہتا ہوں۔ میاں اب کل دوں گا، اللہ نے چاہا تو۔ اللہ خیر رکھے، کل کھایئے گا۔''

سبحان اللہ، کیا اخلاق تھا اور کیسی وضعداری تھی۔ آگ اور مرچوں کا کام اور اس قدر ٹھنڈے اور میٹھے! دوسروں کو دیکھئے گالی گلوج، دھکا مکی اور لپاڈگی کی نوبت رہتی ہے۔

اُستاد گنجے کے ہاں دو قسم کے گاہک آتے تھے۔ ایک وہ جو خرید کر لے جاتے تھے، اور دوسرے وہ جو وہیں بیٹھ کر کھاتے تھے۔ وہیں بیٹھ کر کھانے والوں کے لئے دکان کے اوپر کمرے میں نشست کا انتظام تھا۔ یہ ایک جھوٹا سا صاف ستھرا کمرہ تھا جس میں چٹائیاں بچھی رہتی تھی۔ اس کمرے میں ایک ایک دو دو آدمی بھی کھاتے تھے اور دس دس بارہ بارہ کی ٹولیاں بھی۔ اُستاد سے جتنا جتنا اور جو جو سودا کہا جائے اتنا ہی دیتے تھے، اپنی طرف سے اس میں کمی بیشی نہیں کرتے تھے۔ مستقل گاہکوں کا بہت لحاظ کرتے تھے۔ بڑے مزاج شناس تھے اور ان کی یادداشت بھی غضب کی تھی۔ صورت دیکھتے ہی کہتے۔ ''فرمایئے حکیم صاحب، کیا حکم ہے؟ حکیم صاحب قبلہ تو خیریت سے ہیں؟'' ''ہاں ڈپٹی صاحب، ارشاد؟ بڑے ڈپٹی صاحب کے دیدار تو روزانہ شام کو ہو جاتے ہیں۔'' ''ہاں میاں، آپ فرمایئے؟ وکیل صاحب سے میرا اسلام عرض کیجئے گا۔''

اُستاد گنجے کی نہاری دلّی کے سب شرفا کے ہاں جاتی تھی۔ ان کی سات پشتیں اسی دلی میں گزری تھیں۔ سارا شہر ان کو جانتا تھا، اور یہ بھی دلی کی دائی بنے ہوئے تھے۔ شہر آبادی بعد کے سارے خاندان اور ان کے رودار افراد اُنہیں ازبر تھے۔ کبھی موج میں ہوتے تو مزے مزے کی باتیں بھی کر لیتے۔ ''جی چاہتا ہے کہ ڈپٹی صاحب کو ایک دن تحفہ نہاری کھلاؤں۔ اللہ نے چاہا تو اب کے وہ نہاری کھلاؤں گا کہ چلّے کے جاڑوں میں پسینہ آجائے۔''

''ہاں میاں تو آپ کے لئے کیا بھیجوں؟''

''اُستاد، چھ آدمیوں کے لئے نہاری، کمرے پر۔''

بس اس سے زیادہ آپ کو کہنے کی اور ان کو سننے کی ضرورت نہیں۔ انہیں معلوم ہے کہ آپ کی نہاری کا کیا لوازمہ ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ آپ کے ساتھی بھی آپ کے ہم مذاق ہی ہوں گے۔ فی کس پاؤ بھر نہاری کے اندازہ سے انہوں نے نہاری ایک بڑے سے بادیئے میں نکالی۔ گھی آدھ پاؤ فی کس کے حساب سے داغ کرنے انگیٹھی پر رکھ دیا۔ اتنے گھی تیار ہو، انہوں نے چھ بھیجے توڑ صاف صوف کر نہاری میں ڈال دیئے، اور

بارہ نلیاں بھی اس میں جھاڑ دیں۔ اوپر سے کڑکڑاتا گھی ڈال تانبے کی رکابی سے ڈھک دیا۔ لڑکے کو آواز دے کر پہلے غوریاں اور چمچہ اوپر بھیجا۔ لڑکے نے اوپر پہونچ کر کھونٹی پر سے کھجور کا بڑا سا گول دسترخوان بیچ میں بچھا دیا اور اس پر غوریاں چن دیں۔ پھر لپک کر نیچے آیا اور نہاری کا بادیہ احتیاط سے اوپر پہونچا دیا۔ پھر آفتابہ اور سلفچی لے کر ایک کونے میں کھڑا ہو گیا۔ اتنے وہ ہاتھ دھلائے دوسرا لڑکا تھئی کی تھئی خمیریاں اور ایک رکابی میں گرم مسالہ، ادرک کی ہوائیاں، ہری مرچیں اور کھٹا رکھ گیا۔ سب دسترخوان پر ہو بیٹھے تو وہی لڑکا دہر دہر جلتی انگیٹھی ایک سینی میں ان کے پاس رکھ گیا۔ لڑکا روٹی سینک سینک کر دیتا جاتا ہے۔ دوستوں کے قہقہے چہچے ہوتے جاتے ہیں۔ گھی نے نہاری کی لذت بڑھانے کے علاوہ مرچوں کا دف بھی مار دیا ہے۔ نہاری ذرا ٹھنڈی ہوئی اور غوری انگیٹھی پر رکھی گئی۔

لیجئے، اُستاد نے آپ کے دوستوں کے لئے ایک خاص تحفہ بھیجا ہے۔ تنور میں سے گرم گرم روٹیاں نکال کر گھی میں ڈال دیں اور روٹیاں گھی پی کر ایسی خستہ اور ملایم ہو گئی ہیں جیسے روئی کے گالے۔ واہ واہ! کیا مزاج دانی اور ادا شناسی ہے! جبھی تو آج تک گنجے نہاری والے کو دلّی والے یاد کرتے ہیں۔

یہ تو خیر امیروں کے چونچلے ہیں۔ اصل میں نہاری غریب غربا کا من بھاتا کھاجا ہے۔ دستکار، مزدور اور کاریگر صبح صبح کام پر جانے سے پہلے چار پیسے میں اپنا پیٹ بھر لیتے تھے۔ دو پیسے کی نہاری اور دو پیسے کی دو روٹیاں ان کے دن بھر کے سہارے کو کافی ہوتیں۔ گھر میں علی الصبح چار پیسے میں بھلا کیا تیار ہو سکتا ہے؟

سستے اور بابرکت سے تھے۔ ایک کماتا دس کھاتے تھے۔ اب دس کماتے ہیں اور ایک کو نہیں کھلا سکتے۔ وہ وقت نہیں رہے۔ میاں گنجے نہاری والے بھی گزری ہوئی بہاروں کی ایک چٹ پٹی داستان بن کر رہ گئے۔

سدا رہے نام اللہ کا

OO

دِلّی کے دل والے

''دلّی کی دل والی، منہ چکنا پیٹ خالی۔''

یہ جو مثل مشہور ہے تو اس میں بہت کچھ صداقت بھی ہے۔ روپے پیسے والوں کا تو ذکر ہی کیا؟ انہیں تو ہمہ نعمت چٹکی بجاتے میں مہیا ہو جاتی ہے۔ دلی کے غریبوں کا یہ حوصلہ تھا کہ نہوتی میں دھڑلے سے خرچ کرتے، کل کی فکر انہیں مطلق نہ ہوتی تھی۔ کوڑی کفن کو لگا نہیں رکھتے تھے۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ جس نے دیا ہے تن کو وہی دے گا کفن کو۔ عجب دل والے اور بے فکرے تھے۔ لنگوٹی میں پھاگ کھیلتے تھے۔ تن کو نہیں لتہ، پان کھائیں البتہ۔ ذرا سی بات کے پیچھے لاکھ کا گھر خاک کر دیتے۔ گھر پھونک تماشہ دیکھنا انہیں خوب آتا تھا۔ مگر ان کی کمائی میں برکت بھی ایسی تھی کہ پھر لہر بہر ہو جاتی۔ اماں بھٹیارے کی بھی کوئی اوقات ہے؟ بیٹی کی چھٹی میں سونے چاندی کی کھچڑی بھیجی تھی۔ چاندی کے چاول اور سونے کی دال۔ پہاڑ گنج کے ایک سادہ کار نے بیٹے کے بیاہ میں چاندی کی چتی ہوئی طشتریاں تقسیم کیں جن میں ایک ایک سونے کا پھول جڑا ہوا تھا۔ ان طشتریوں میں پاؤ پاؤ بھر کھوئے کے پیڑے، اوپر سے ایک ریشمی رومال بندھا ہوا۔ اسی برات میں بیٹی والوں نے مینا کاری کی بیضوی ڈبیوں میں بُن دھنیا بانٹا تھا۔ سوئی والوں کے سقوں میں ایک شادی ہوئی تو کئی ہزار کی پوری برادری کو دُہرا کھانا کھلایا گیا۔ پھر بھنگیوں میں گھر گھر حصے بھیجے گئے۔ دو قسم کا سالن، میٹھے گھییئے کا اور قورمہ۔ شیرمال اور خمیری روٹی۔ بڑی بڑی لاکھی رکابیوں میں بریانی اور زردہ۔ ایک ایک جوڑ فیرنی کا۔

ایک گھر میں اگر دس بیاہے ہیں تو دسوں کے دس حصے۔ انہیں دیکھ کر شہر آبادی کے تورے یاد آتے تھے۔ ہم نے تو تورے دیکھے نہیں، ہاں بڑی بوڑھیوں سے ان کا ذکر ضرور سنا ہے کہ ایک تورہ کم از کم بیس آدمیوں کے لئے کافی ہوتا تھا۔

سقے، کنجڑے، نائی، قصائی، کیرے، ٹھٹیرے، قلعی گر، بیٹنے، کندلہ کش، ورق کوب، سادہ کار، نیاریئے، غرض سارے کرخندار اور دستکار اسی دریا دلی سے روپیہ خرچ کرتے تھے۔ اور تو اور ایک دفعہ ایک برات دیکھی۔ روشنی کے جھاڑ بے شمار، ان کے پیچھے انگریزی بینڈ باجہ، اس کے پیچھے نفیری کا ایک طائفہ، اس کے بعد ایک طوائف مع سفردا، برات چند قدم چلتی اور رُک جاتی۔ طوائف مبارکبادی کے دو بول گاتی، گت بھرتی، تھئی تھئی ناچتی، بیل لیتی، سلام کرتی اور برات آگے بڑھ جاتی۔ گہنا پہنے ہوئے نقرے پر ننہا سا دولہا سوار۔ دولہا کے پیچھے دولہا کے ابا زری کی چھوٹی باڑھ کی گول ٹوپی سر پر، زربفت کی اچکن اور سفید ساٹن کا آڑا پاجامہ پہنے اسی گھوڑے پر سوار۔ دولہا کے گھوڑے کے پیچھے پالکی جس پر چمکتے دوپٹے پڑے ہوئے۔ آخر میں مسہری اور جہیز کی لنگتار، کھانچیوں میں چمچماتے ہوئے برتن رکھے ہوئے۔ ہر دس قدم پر روشنی کا ایک ہنڈا۔ پالکی اور دولہا پر سے مٹھیاں بھر بھر کے ریزگاری کی بکھیر ہوتی جاتی ہے۔ کنگلے لوٹتے جاتے ہیں، ایک کے اوپر ایک گدا گد گر رہا ہے۔ یہ کسی کی برات نہیں چڑھ رہی۔ گڈے گڈیا کا بیاہ ہے۔ اس میں شادی بیاہ کی ساری رسمیں پوری کی جائیں گی۔ لاڈ پیار اور مان تان اولاد کا اتنا تو ہو۔

وہ دیکھئے، مٹیا محل کی طرف سے ایک برات آتی دکھائی دے رہی ہے۔ نفیری کی تانیں اُڑ رہی ہیں۔ گھوڑے پر ایک صاحب مرغ زریں بنے بیٹھے ہیں۔ ان کے آگے ایک بچہ ہے تین چار سال کا۔ سر پر سہرا بندھا ہے۔ بدن میں بدّھی ہے۔ اماں یہ کیسی برات ہے؟ اجی حضت، یہ برات نہیں ہے، بچہ گھوڑی چڑھا ہے۔ اس کی ختنہ ہوئی تھی۔ اچھے ہونے کی خوشی منائی جا رہی ہے۔ ختنہ کو دلّی والے ''مسلمانیاں'' کہتے ہیں۔ صاجزادے کی مسلمانیاں ہوئی ہیں۔ مسجد کو سلام کرنے جا رہے ہیں۔ یہ صاحب جو بچے

کو گھوڑے پر لئے بیٹھے ہیں ابا ہیں پیچھے ڈولیوں میں اماں ہیں اور رشتے کنبے کی عورتیں ہیں۔ یہ طاق بھریں گی اور چاندی کے چراغ جلائیں گی۔ لو بھئی **سُنّتوں** سے ادا ہوئے، بھلا خوشی کیوں نہ منائیں، قرض دام بھی اللہ اُتروادے گا۔

چوہا بل میں سماتا نہیں دُم سے باندھے چھاج! دلّی کے غریبوں کے کھنڈلوں میں آدمیوں کے رہنے کے لئے بھی جگہ کم ہوتی تھی، کجا یہ کہ ان میں جانور بھی پالے جائیں؟ مگر شاید ہی کوئی گھر ایسا ہو جس میں دو چار جانور نہ پلے ہوئے ہوں۔ ہر گھر میں کبوتروں کے دس پانچ جوڑے ہوتے تھے۔ کبوتر بہت بے ضرر اور بھولا جانور ہے۔ اسی لئے اسے معصوم سمجھا جاتا ہے، اور بعض لوگ تو اسے سیّد سمجھتے ہیں۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جس گھر میں کبوتر ہوتے ہیں اس گھر میں بیماری نہیں آتی۔ گھُٹے ہوئے گھروں میں ہوا کا گزر کہاں؟ کبوتروں کے اڑتے رہنے سے ہوا صاف ہوتی رہتی ہے۔ کبوتروں کا شوق اور کبوتروں کی مانگ بڑھی تو کبوتر بازوں نے نئی نئی نسلیں تیار کرلیں۔ چوک کی سیڑھیوں پر بائیں طرف ہر قسم کے کبوتروں کے ڈھیروں کھانچے اور پنجرے بھرے رہتے تھے۔ جو نسل آپ پسند فرمائیں مول تول کر کے لے لیں۔ بیسیوں قسم کے کبوتر ہوتے تھے، اب تو ان کے پورے سے نام بھی یاد نہیں رہے۔ چند نام یہ ہیں:-

لال بند، جنگلا، سفیدا، پلکہ، تفتہ، کلپوٹیہ، کمہریا، تبولیہ، زرد پوٹیہ، لال بند کھیرا، سبز کھیرا، لال جوگیا، لال دیڑ، سبز دیڑ، کالا دیڑ، انجیریا دیڑ، امیری، زمیری، طاؤس، چوئے چندن، کالا مکھی، سبز مکھی، اُودا مکھی، سفید لقا، سیاہ لقا، سبز لقا، یاہو سفید، یاہو چوٹی دار، بھانتا، لوٹن، نثاورا ہر رنگ کا، خال، لال، کالا، سبز، عنابی، کاسنی، بھورا۔ پٹیہ ہر رنگ کا۔ تابڑے، چتیلے، نقاب پوش، گلوئے لکھنئی۔ گلوئے ہر رنگ کے، شیرازی، گولے، گرہ باز، کابلی۔

ان میں سے بیشتر خوشنمائی کے لئے رکھے جاتے تھے اور چند اُڑانے کے لئے۔ اُڑنے والوں کی اُڑانوں میں فرق ہوتا تھا۔ بعض ایسے ہوتے تھے جن کی ٹکڑیاں بنائی جاتی تھیں، اور پورے جھلڑ کو ایسا سدھایا جاتا تھا کہ پرا بنا کر دُور دُور ہو آتے اور

کسی اور ٹکڑی میں بھی گھل مل جاتے، مگر ایسے گردان ہو جاتے کہ ایکوں ایک اپنی چھتری پر واپس آجاتا۔ اگر ان میں سے کوئی بھٹک کر دوسری ٹکڑی کے ساتھ چلا جاتا تو دوسری ٹکڑی والا اُسے چھپکے سے پکڑ لیتا۔ پہلی ٹکڑی والا اسے اپنی ہار سمجھتا اور ضرورت سمجھتا تو منہ مانگے دام دے کر دوسری ٹکڑی والے سے واپس لے آتا۔ ورنہ بھٹک جانے والے کبوتر کو اس لائق نہ سمجھا جاتا کہ اسے دوبارہ اپنی ٹکڑی میں شامل کیا جائے۔ جھوٹے کا اعتبار ہی کیا؟

بعض کبوتر ایسے ہوتے ہیں جو دیر تک اڑ سکتے ہیں۔ کبوتر باز انہیں طرح طرح کی غذائیں کھلا کر تیار کرتے ہیں۔ پھر آپس میں شرطیں لگ جاتی ہیں کہ صبح کو ایک ساتھ کبوتر اڑائے جائیں۔ جس کا کبوتر پہلے اتر آیا وہ ہارا۔ یہ کبوتر سارے سارے دن آسمان کا تارا بنے اڑتے رہتے اور دونوں وقت ملتے اترتے۔

ایک زمانے میں نامہ بر کبوتر بھی ہوتے تھے۔ ہمارے زمانے میں یہ کبوتر دلّی میں نہیں تھے، البتہ جاپان کے ایک اخبار کے دفتر میں ان کا پنجرہ نظر آیا تھا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ خبر رساں کبوتر ہیں۔ بعض رپورٹر اپنے ساتھ ان میں سے دو چار کبوتر لے جاتے ہیں اور جب کسی واقعہ کی اطلاع فوراً دینی ہوتی ہے تو ایک پرزہ لکھ کر کبوتر کے پاؤں میں باندھ دیتے ہیں۔ کبوتر اڑ کر سیدھا اپنے اخبار کے دفتر پہنچ جاتا ہے۔ ٹیلیفون کے زمانے میں بھی جاپان میں خبر رساں کبوتروں سے کام لیا جاتا ہے۔ سنا ہے کہ کوئی شاہی کبوتر باز تھے۔ جب بادشاہ جمعہ کی نماز کو قلعۂ معلّٰی سے مولا بخش ہاتھی پر سوار ہو کر برآمد ہوتے تو شاہی کبوتر باز کبوتروں کی ٹکڑی کو اس خوبی سے اُڑاتا کہ بادشاہ کے سر پر ان کا سایہ رہتا۔

خلیل خاں کا بھی قصہ مشہور ہے کہ فاختہ اُڑاتے تھے۔ فاختہ کو ایک بہت کم عقل پرندہ سمجھا گیا ہے۔ اس لئے کہ اگر اسے اُڑایا جائے تو پھر فاختہ اُڑتی ہی چلی جاتی ہے، واپس نہیں آتی۔ مگر اگلے وقتوں میں کوئی صاحب خلیل خاں نامی تھے جنہوں نے فاختاؤں کو بھی کبوتروں کی ٹکڑی کی طرح اڑا کر دکھا دیا۔ یہ تو ہم نے بھی دیکھا ہے کہ ایک

صاحب سبک سے ٹھیلے پر ایک پنجرہ پدڑیوں کا لے کر نکلا کرتے تھے۔ جہاں چاہتے پنجرہ کھول کر پدڑیوں کو اُڑا دیتے، اور جب چاہتے انہیں واپس بلا لیتے۔ یہ پدڑی وہی حقیر سی چڑیا ہے جس کے بارے میں کہاوت مشہور ہے کہ ''کیا پدی اور کیا پدی کا شوربہ؟'' یا ایک مثل اور ہے کہ ''باپ نے نہ ماری پدڑی بیٹا تیرانداز۔''

بیۓ کے بارے میں جو مشہور ہے کہ اسے چھلاّ دکھا کر چھلاّ کنویں میں اچھال دیجئے۔ وہ اس چھلے کو پانی تک پہونچنے سے پہلے نکال لاتا ہے، یہ کوئی روایت نہیں ہے بلکہ حقیقت ہے، اور ہم نے یہ ماجرا اکثر دیکھا ہے۔ بعض لوگوں نے بیۓ کو ایسا سدھایا تھا کہ اس کی چونچ میں ایک الائچی دے دی اور اشارہ کر دیا بیا اڑ کر اس کے منہ میں الائچی دے آتا تھا جس کی طرف اشارہ کیا گیا ہو۔ فال نکالنے والے جو ٹریوں پر پنجرے لئے اور بہت سارے لفافے لگائے بیٹھے رہتے ہیں، ان کے پنجرے میں بھی بیا ہی ہوتا ہے۔ بعض لوگوں نے اس کام کے لئے طوطے کو بھی سدھا لیا ہے۔

طوطے تو تقریباً ہر گھر میں پالے جاتے تھے۔ ٹوئیاں سے لے کر پہاڑی طوطے تک سب کو کچھ نہ کچھ بولنا سکھا دیا جاتا تھا۔ ''مٹھو بیٹے۔ نبی جی بھیجو۔ حق اللہ پاک ذات اللہ'' تو ہر طوطا کہنے لگتا تھا۔ کاکتو ابھی صاف صاف بولنے لگتا تھا اور سیٹی تو بڑے زور میں دیتا تھا۔

بلبل صرف لڑانے کے لئے پالے جاتے تھے۔ ان کی لڑائی بڑی خوبصورت ہوتی ہے۔ لڑانے کے لئے کیڑے بھی پالے جاتے تھے۔ اُنہیں گل دُم بھی کہتے تھے۔

بٹیر تھیلیوں میں بند رہتے تھے۔ بٹیر بازوں کو جب بھی فرصت ملتی بٹیر کو مٹھی میں لے لیتے اور پان کی پیک سے اس کا سر رنگتے رہتے۔ شرطیں بدلے بٹیروں پر پالیاں جمائی جاتیں۔ جب آر پار کشتی دیکھنی ہوتی یعنی ایسی جس میں دو میں سے ایک زندہ رہ جائے تو بٹیروں کے پنجوں میں چھوٹے چھوٹے چاقو کے پھل باندھ دئے جاتے۔ چونچیں ملتیں اور لاتیں چلتیں یہاں تک کہ ایک کی لات ایسی پڑتی کہ دوسرے کا پوٹا پھٹ جاتا۔ اس پر بھی زخمی بٹیر لڑے جاتا تھا تا آنکہ بے دم ہو کے گر جاتا۔

لڑائی تو مرغوں کی ہوتی تھی اور مرغوں میں بھی اصیل مرغ کی۔ یہ عجیب بے ہنگم مرغ ہوتے تھے۔ بڑے قد آور، گنجے آدمی کی طرح بے بال و پر۔ کلغی غائب، لمبی لمبی ٹانگیں۔ ان کی لات اتنی زور دار ہوتی تھی کہ کسی اچھے خاصے آدمی کے پڑ جائے تو ہڈی ٹوٹ جائے۔ کانڑے مرزا کو اکثر دیکھا کہ مرغ بغل میں دبائے چلے جا رہے ہیں۔ لوگ کہتے تھے کہ مرزا کے باپ بھی بڑے مرغ باز تھے۔ کانڑے مرزا چند مہینے کے تھے کہ ان کی اماں انہیں کھٹولی پر لٹا کر کسی کام سے دالان میں چلی گئیں۔ کچھ ہی دیر گزری ہو گی کہ ایک دم سے بچے کے بلبلا کر رونے کی آواز سنائی دی۔ جلدی جلدی آکر جو دیکھا تو دیکھا کہ بچے کا چہرہ لہولہان ہو رہا ہے اور ایک آنکھ غائب ہے۔ پاس ہی مرزا صاحب کا اصیل مرغ کھڑا دوسری آنکھ پر تاک لگا رہا ہے۔ ان کے تو ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔ ''ہے ہے میرا بچہ'' کہہ کر بچے کو سینے سے لگا لیا اور سر پر برقعہ ڈال ننگے پاؤں ہی محلے کے جراح کی دکان پر جا پہونچیں۔ مرغ نے ایک ڈھیلا پورا نکال کر نگل لیا تھا۔ وہ تو اللہ نے بڑی خیر کی جو دُوسری آنکھ بچ گئی۔ مرزا صاحب کی بیوی ذرا چوک جاتیں تو دوسرا ڈھیلا بھی گیا تھا۔ اب تو مرزا کانڑے ہو کر جی گئے جو اندھے ہو جاتے تو کیا ہوتا؟

اگن یا ہزار داستان پالنے کا بھی دلّی والوں کو بہت شوق تھا۔ ان کے پنجروں پر بستنیاں چڑھی رہتیں۔ جب اگن چہکتا تو گھنٹوں اس کی چہکار سنی جاتی۔ ہزاروں بولیاں بولتا تھا، اسی لئے ہزار داستان کہلاتا تھا۔ چوک پر اگن بکنے آتے تھے۔ ان کے پنجروں پر کیکری کٹاؤ کے غلاف چڑھے ہوتے تھے۔ شوقین مزاج لوگ بڑی بڑی قیمتیں دے کر خرید لے جاتے تھے۔

کلکتہ کی کالی مینا جو بنگالے کی مینا اور آغا مینا بھی کہلاتی تھی طوطے سے زیادہ صاف بولتی تھی، اور زیادہ باتیں سیکھ جاتی تھی۔ اس کا بولنا بڑا بھلا لگتا تھا۔ چھوٹے بچے جب پیاری پیاری باتیں کرنے لگتے تو دلّی کی عورتیں انہیں پیار سے ''میری آغا مینا'' کہہ کر ان کا منہ چوم لیتی تھیں۔

لال اور چِڑیاں بھی اکثر گھروں میں ہوتی تھیں۔ ان کی چہکار ایک خاص وضع کی

ہوتی تھی۔ دلّی والے کہتے تھے کہ یہ صمٌ بکمٌ تلاوت کرتے رہتے ہیں اور اس سے گھر میں برکت رہتی ہے۔

دستکاروں میں سے اکثر کو تیتر پالنے کا شوق ہوتا تھا۔ دو جڑواں پنجرے ہوتے تھے۔ ایک میں نر اور دوسرے میں مادہ۔ صبح شام انہیں دیمک چگانے اور ہوا کھلانے شہر سے کہیں باہر لے جاتے تو باری باری سے انہیں کھولتے۔ دونوں کو ایک ساتھ نہیں کھولتے تھے۔ ایک کے بولنے پر دوسرا بھاگا چلا آتا تھا۔ یہ بھورے تیتر ہوتے تھے۔

کالا تیتر دیکھنے میں بھی بڑا خوبصورت ہوتا تھا۔ اس کی چہکار گورے تیتر سے مختلف ہوتی تھی۔ اس کی لگی بندھی آواز کو لوگوں نے طرح طرح کے معنی پہنا لئے تھے۔

دودھ بیچنے والے کہتے یہ کہتا ہے۔ ''شیر دارم شکرک۔''

بنیا کہتا ہے۔ ''نون تیل ادرک۔''

مذہبی خیال کے لوگ کہتے یہ کہتا ہے۔ ''سبحان تیری قدرت۔''

ہندو کہتے یہ کہتا ہے۔ ''سیتا، رام دسرتھ۔''

بھورے تیتر کے بارے میں بھی روایت مشہور تھی کہ کہتا ہے۔ ''پدرم سلطان بود۔'' دوسرا اس کے جواب میں کہتا ہے۔ ''تُراچہ؟ تُراچہ؟ تُراچہ؟''

غرض جتنے منہ اتنی باتیں۔ سب اپنے اپنے مطلب کی سوچتے ہیں۔ چلو میاں کرخندار اپنی سنجوگی اُٹھاؤ اور گھر کی راہ لو۔

شکاری پرندے پالنے کا بھی دلّی والوں کو شوق تھا۔ بہری اور شکرے کو چمڑے کا دستانہ پہنا کر کلائی پر بٹھا لیا جاتا تھا۔ شکرے کی آنکھوں پر ٹوپی چڑھی رہتی تھی۔ جب شکار کرنا ہوتا تو ٹوپی آنکھوں پر سے اتار دی جاتی اور شکار کی سمت میں اُسے اُڑا دیا جاتا۔ پلک جھپکتے میں شکرا اپنے شکار کو دبوچ کر بیٹھ جاتا تھا۔ شہ باز کو ایسا سدھایا جاتا کہ خرگوش کو پکڑ لیتا تھا۔ شاہی زمانے میں سنا ہے کہ ایسے بھی شکاری پرندے ہوتے تھے جو جھپٹ کر ہرن کی آنکھیں پھوڑ ڈالتے تھے۔ ہرن اندھا ہو کر چوکڑی بھول جاتا اور شکاری دوڑ کر اسے پکڑ لیتے۔

دلّی والوں کو چوپایوں میں سے بھیڑے اور دُنبے پالنے کا بہت شوق تھا۔ دودھ پیتا بچہ لے کر پالتے تھے۔ روزانہ اسے کھلانا پلانا، نہلانا دھلانا، صبح شام اسے پھرانا، چارے میں جئی اور بونٹ کے پودے ستلی سے باندھ کر دیوار میں لٹکا دئے جاتے۔ دانا ضرور کھلاتے تھے۔ اس سے فربہی آتی تھی۔ جو اور زیادہ لاڈ و پیار کرتے دودھ جلیبیاں بھی کھلاتے، چاہے خود کھانے کی استطاعت نہ رکھتے ہوں مگر جانور کو ضرور کھلاتے۔ بکرے اور بھیڑے کو خصی کروا دیتے تھے۔ اس سے جانور کا قد بھی نکل آتا تھا اور جسم میں چربی بھی بڑھنے لگتی تھی۔ دُنبے تو اس قدر فربہ ہو جاتے اور ان کی چکتیاں اتنی بھاری ہو جاتیں کہ اس بوجھ کو لے کر چلنا ان کے لئے ناممکن ہو جاتا ہے، لہٰذا ہلکی پھلکی دو پہیوں کی چھوٹی چھوٹی گاڑیاں بنوائی جاتیں جن پر ان کی چکتیاں رکھ دی جاتیں، تب کہیں ان کی پھرائی ممکن ہوتی۔ ان کی اُون ذرا بڑھی اور کٹوائی گئی۔ جب یہ جانور جوان ہوتے تو دیکھنے دکھانے کے لائق ہوتے۔ چکنے ایسے کہ مکھی بیٹھے تو پھسل جائے۔ چھانٹ کر سفید رنگ کے لئے جاتے تھے۔ ان پر مہندی سے گل بوٹے بنائے جاتے۔ ان کے گلوں میں رنگ برنگے موٹے موٹے منکوں کی مالائیں اور پیتل کی گھنٹیوں کے ہار پہنائے جاتے۔ کئی سو روپے ایک ایک جانور پر لگ جاتے۔ یہ جانور بیچنے یا نفع کمانے کے لئے نہیں بقرعید اور شادی بیاہ کے لئے پالے جاتے تھے۔

بکری یا گائے بھینس پالنے کا رواج دلّی والوں میں نہیں تھا۔ دودھ دہی سستا اور اعلیٰ درجے کا بازاروں میں مل جاتا تھا۔ لہٰذا ان جانوروں کا پالنا علت سمجھا جاتا تھا۔ ہر محلے کے قریب گھوسی بستے تھے۔ اپنے سامنے ان سے دُودھ نکلوالیا جاتا۔ دُودھ ایسا گاڑھا ہوتا تھا کہ اس میں سیکھ کھڑی کرلو۔

دلّی کے مہتر مینڈھے پالتے تھے اور انہیں دلّی والوں ہی کی طرح تیار کرتے۔ بعض دفعہ یہ تیار ہو کر اس قدر خوفناک ہو جاتے تھے کہ ایک آدمی کے بس کے نہیں رہتے تھے۔ گلے کے پٹے میں دوطرفہ باگ ڈور ڈال کر دو آدمی لے کر انہیں نکلتے تھے۔ یہ جانور لڑانے کے لئے پالے جاتے تھے۔ بڑی بڑی شرطیں لگائی جاتی تھیں اور

ان کی ٹکریں دیکھ کر دل لرز جاتا تھا۔

دِلّی کے دستکاروں کو گھوڑا اور رہڑی رکھنے کا شوق تھا۔ بعض پیشوں میں اس کی ضرورت بھی ہوتی تھی۔ مثلاً قصائیوں کو کمیلے سے راسیں لانے کے لئے۔ مگر زیادہ تر رہڑیاں محض نمود کے لئے رکھی جاتی تھیں۔ رہڑی ایک کھلا ہوا اونچا سا دو پہیہ ہوتا تھا۔ بیٹھنے کی ہموار مستطیل جگہ کے چاروں طرف بالشت بھر اونچا جنگلا لگا ہوتا تھا۔ اس میں چار چھ آدمی بیٹھ سکتے تھے۔ دن بھر کے کام دھام سے فارغ ہونے کے بعد گھر آئے، نہائے دھوئے، اُجلے کپڑے پہنے اور یار دوستوں کو ساتھ لے کر کسی طرف سیر سپاٹے کو نکل گئے۔ نظام الدین، اوکھلا، قطب صاحب کی سڑک اچھی تھی اور اس پر بھیڑ بھڑکّا بھی نہیں ہوتا تھا۔ دلی دروازے سے نکلنے کے بعد کوشش یہی ہوتی تھی کہ ہم سب سے آگے نکل جائیں، کوئی اور ہم سے آگے اپنی رہڑی نہ نکالنے پائے۔ چنانچہ ان منچلوں میں دوڑیں لگ جاتیں، راسیں ڈھیلی چھوڑ دی جاتیں اور گھوڑے ہوا سے باتیں کرنے لگتے۔ جب کوئی رہڑی برابر سے ہو کر آگے نکلنے لگتی تو جیتنے والے خوشی سے ''پیری ہے بے پیری'' کے نعرے لگاتے اور منہ سے ہاتھ لگا کر عجیب عجیب آوازیں نکالتے۔ جو پھسڈی رہ جاتا وہ کھسانا ہو کر اپنے گھوڑے کی کھال اُدھیڑنے لگتا۔ مگر وہ بچارہ اپنی بساط سے زیادہ آخر کیسے بھاگے؟ لہذا مالک بھی ''تھو بے'' کہہ کر راسیں کھینچ لیتا۔ زندہ دل لوگ ایسی شکست سے بددل نہیں ہوتے، یار زندہ، صحبت باقی۔ پھر سہی۔''

○○

قطب صاحب کی سیر

عجب بے فکرے تھے یہ دِلّی والے بھی! اپنی جان کو کوئی غم نہ لگاتے تھے۔ کہتے تھے ''فکر جان کا روگ ہوتا ہے۔ ہم غم کیوں پالیں؟ پالیں ہمارے دشمن، بیری۔ شکر خورے کو شکر اور موذی کو ٹکر۔ میاں اسی لئے تو کماتے دھماتے ہیں کہ آنند کے تار بجائیں۔ ان کی بھلی چلائی جو جوڑ جوڑ مر جائیں گے اور مال جنوائی کھائیں گے۔ آج مرے کل دوسرا دن۔ مر گئے مردود جن کی فاتحہ نہ درود۔ جو صبح صبح ان کی صورت دیکھ لو تو دن بھر روٹی نصیب نہ ہو۔ اللہ پیسہ دے، پیسے کی محبت نہ دے۔ ہاتھ کے میل سے محبت کیا؟ میاں ہم تو کوڑی کفن کو لگا نہیں رکھتے۔ اپنا آپا کیسا ہے؟ جان ہے تو جہان ہے۔ آپ زندم جہاں زندم، آپ مردم جہاں مردم، کھائیں گے گھی سے نہیں تو جائیں گے جی سے۔''

ان دِلّی والوں نے ابی قورس کا نام کاہے کو سنا ہوگا؟ انہیں فلسفیوں سے کیا کام؟ یہ تو سیدھی سی بات جانتے ہیں کہ کھاؤ پیئو اور موج مارو۔ موت سر پر کھڑی ہے۔ جو دم گزر جائے غنیمت ہے۔ آج نقد کل ادھار۔ کل کی کل دیکھی جائے گی......

اَب تو آرام سے گزرتی ہے
عاقبت کی خبر خدا جانے

ہاں تو ہوا یہ کہ مینہ کا پہلا چھینٹا پڑنے کے بعد گرمی ڈھل گئی اور موسم سہانا ہو گیا۔ کیا امیر کیا غریب، سب کے دل ہرے ہو گئے۔ مینہ کا پہلا چھینٹا پڑنے کے بعد گرمی ڈھل گئی۔ ایسے سمے میں بھلا پاؤں توڑے گھروں میں دِلّی والے کیسے بیٹھے رہتے؟ اسی

دن کی تو آس لگائے بیٹھے تھے۔ گھر گھر سیر کا چرچا ہونے لگا۔

آغا نواب نے شام ہوتے گھر میں قدم رکھا۔ دالان میں جا کر انگرکھا اُتارا۔ اتنے وہ کپڑے بدلیں بیگم نے صحن میں بچھی ہوئی چوکیوں پر بی مغلانی سے کہہ کر دری چاندنی کا فرش لگوا دیا۔ خود لپک کر مکھانوں کے ستو اور گڑھل کے شربت کا اہتمام کیا۔ ایک جھم جھماتے کٹورے میں ستو گھولے، دوسرے میں شربت بنایا۔ ان میں برف کچل کر ڈالی اور چاندی کی تھالی میں دونوں کٹورے لگا کر آغا نواب کے لئے .زنی پر لگا دئے۔ پھر بوا مغلانی کو آواز دی۔ ''بوا مجھے پٹاری دے جانا۔''

آغا نواب گاؤ تکئے کے سہارے ہو بیٹھے تو بیگم پاس بیٹھ کر پنکھا جھلنے لگیں۔ آغا نواب نے کہا۔ ''میں نے مختار کار صاحب سے کہہ دیا ہے کہ قطب صاحب میں ہمارے لئے بالا خانے کا انتظام کر دیں۔ پھول والوں کی سیر کی تاریخ بھی مقرر ہو چکی ہے۔''

بیگم نے خوش ہو کر پوچھا۔ ''تو خیر سے کب چلنا ہوگا؟''

آغا نواب نے کہا۔ ''کل منہ اندھیرے۔''

بیگم نے چونک کر کہا۔ ''کل؟ آپ بھی ہتھیلی پر سرسوں جماتے ہیں۔ بھلا اتنے جلدی سب کام ہو جائیں گے؟''

آغا نواب بولے۔ ''کارِ خیر میں دیر کیسی؟ مختار کار نے آدمی مہرولی روانہ کر دیا ہے۔ ابھی تو پوری رات پڑی ہے۔''

بیگم نے کہا۔ ''ہاں رات تو پڑی ہے پوری مگر کام بھی تو سمیٹنے ہیں۔ یہ تو نہیں ہے کہ منہ اٹھایا اور چل دئے۔ ماشاء اللہ بھرا پُرا گھر ہے۔ پھر پاس پڑوس کے بھی دو چار گھر ہیں۔ یہ غریب بھی ہمارا آسرا تکتے ہیں۔''

آغا نواب بولے۔ ''ہاں ہاں، انہیں ضرور ساتھ لے لینا۔ ان سے بڑی رونق ہوتی ہے۔ انہیں یہ ضرور بتا دینا کہ صبح گجر دم پالکی گاڑیاں اور بھارکس پھاٹک پر لگ جائیں گے۔ سورج نکلنے سے پہلے گھروں سے روانہ ہو جانا ہے۔''

بیگم کی باچھیں کھلی جا رہی تھیں۔ گھر کی چار دیواری میں گھٹے گھٹے دم بولا گیا تھا۔ بولیں......

''تو میں بچیوں سے کہہ دوں صبح بیدار ہونا ہے۔ ویسے نماز کے لئے تو روزانہ ہی اٹھتی ہیں، قدرے پہلے جاگ جائیں۔ صبح کے ناشتے کا بھی انتظام کروں اور ضروری برتن بھانڈا ایک بوری میں بھروادوں۔ صندوقوں میں سے فرش بھی نکلواؤں۔ ہمسائیوں کو اطلاع کراؤں کہ وہ بھی صبح چلنے کے لئے تیار ہو جائیں۔''

آغانواب نے کہا۔ ''تمہیں اختیار ہے جسے چاہو نیوتا دو۔''

بیگم نے سب سے پہلے بڑی بیگم کو اطلاع دی۔ وہی اس خاندان کی بڑی بوڑھی ہیں۔ ان کے مشورے کے بغیر کوئی کام نہیں ہوتا۔

بڑی بیگم نے کہا۔ ''اس وقت تو میں کوئی اور ہی دُعا مانگتی، قبولیت کی گھڑی تھی۔ میرے دل میں قطب صاحب کا خیال آیا ہی تھا کہ تم نے خیر سے یہ خبر سنائی۔ لو بی، بسم اللہ کرو۔ سودا سلف منگاؤ۔ ماشاء اللہ پورا محلّہ ہی ساتھ جائے گا۔ نواب دولہا تو کہیں اکیلے جانے کے قائل ہی نہیں۔ جاؤ تم اپنے کام دیکھو۔''

سیر کی خبر سنتے ہی بچیوں میں کھلبلی مچ گئی۔ سب کو اپنے اپنے کپڑوں اور جوڑوں کی فکر ہوئی۔

بڑی ننھی بولی۔ ''نانی اماں، ہمارے پاس تو دھانی ڈوپٹہ کوئی نہیں ہے۔''

نانی اماں نے کہا۔ ''بیٹی تم اپنے دُھلے ہوئے کپڑے ساتھ رکھ لو۔ قطب صاحب میں ایک سے ایک اچھا رنگریز موجود ہے۔''

چھوٹی ننھی نے تنک کر کہا۔ ''جنگل میں دھرا ہے رنگریز۔''

نانی اماں بولیں۔ ''اے بیٹی ہوش کے ناخن لے۔ کیسا جنگل؟ رت بدلتے ہی جنگل میں منگل ہو گیا ہوگا۔ تم دیکھنا تو سہی وہاں کیسی بہار آ رہی ہوگی۔ آدھی دِلّی وہاں ڈھل چکی ہوگی۔''

صبح جانے کی خوشی میں بھلا نیند کسے آتی؟ رات آنکھوں ہی آنکھوں میں کٹ گئی۔

یہ برکھارت بڑی اللہ آمین کی تھی۔ سارے شہر میں ایک ہلچل مچی ہوئی تھی۔ جس کو دیکھو سیر کے لئے پر تول رہا ہے۔ کوئی سبزی منڈی کے باغوں میں جائے گا، کوئی کوٹلہ پُرانے قلعہ، مدرسہ، ہمایوں کے مقبرے یا اس سے آگے حوض خاص۔ مگر قطب صاحب کی بات ہی کچھ اور ہے۔ حضرت بختیار کاکیؒ کی برکت کہو کہ دِلّی والے سات کوس کھنچے چلے جاتے ہیں، اور وہاں تہوار کا سِرا بھی تو ہے۔ تین دن بعد پھول والوں کی سیر ہے۔ یوں اور بھی خلقت ٹوٹی پڑتی ہے۔

یوں تو دِلّی سے قطب صاحب موٹریں اور بسیں چلتی ہیں مگر دِلّی کے سیلانی جیوڑے گیارہ میل کے راستے کا بھی لطف اٹھاتے ہیں۔ اس لئے تانگوں، اونٹ گاڑیوں، بیل گاڑیوں اور ٹھیلوں میں جانا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ جگہ جگہ ٹھیکیاں لیتے کچھ راستہ سواری میں اور کچھ پیدل طے کرتے ہیں۔ غریب غربا پیدل جاتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ یہی لوگ سیر کا اصل لطف اٹھاتے ہیں۔ مٹکے میں ایک دو جوڑے رکھے اور مٹکا سر پر اوندھا لیا اور چل پڑے۔ یہ مٹکا صندوق کا کام بھی دیتا ہے اور چھتری کا بھی۔ خراماں خراماں شور مچاتے چلے جاتے ہیں۔ جہاں چاہتے ہیں چھاؤنی چھالیتے ہیں۔ کھاتے ہیں، پیتے ہیں، کھیلتے ہیں، دوڑ لگاتے ہیں اور ہنستے کھیلتے اُجالے اُجالے قطب صاحب پہنچ جاتے ہیں۔ یہاں بیسیوں ٹوٹی پھوٹی عمارتیں ہیں۔ کسی کھنڈر میں ڈیرا جما لیتے ہیں۔

فجر کی اذان کے وقت سے گلی گلی ڈیوڑھیوں اور چوراہوں پر سواریاں لگ گئیں۔ گٹھریاں۔ بوغبند، برتنوں کی بوریاں بھار کسوں میں لادی گئیں۔ آغا نواب نے عورتوں کے لئے پالکی گاڑیوں کا انتظام کیا ہے۔ ان کی لین ڈوری لگ رہی ہے۔ ان میں محلے بھر کی عورتیں اور بچے ایسے ٹھنس کر بیٹھے کہ ہلنا تک محال ہو گیا۔ جہاں چار مردوں کا بیٹھنا مشکل ہوتا ہے وہاں آٹھ عورتیں آرام سے بیٹھ جاتی ہیں۔ آغا نواب ہنس کر کہا کرتے تھے کہ عورتیں ربڑ کی بنی ہوئی ہوتی ہیں۔

گاڑیاں بھر بھر کے روانہ ہوتی رہیں۔ دِلّی دروازے سے باہر نکلے خونی دروازے سے آگے فیروز شاہ کا کوٹلہ آ گیا۔ جنہیں قطب صاحب پہونچنے کی جلدی

نہیں ہے کوٹلے میں رک گئے۔ یہاں بھی چھوٹا سا میلہ لگا ہوا ہے۔ حلوائی کی دکان پر گرما گرم کچوریاں جھپا جھپ اتر رہی ہیں۔ حلوہ مانڈا بھی موجود ہے۔ ایک ایک پیسے یہ یہ بڑی کچوری لے لو۔ آلو کی ترکاری ہے جس میں گاجر اور آم کے اچار کی ایک ایک پھانک بھی ہے۔ چار پیسے کی بیوڑیوں میں پیٹ بھر کے ناشتہ کیا۔ دکاندار نے بیوڑیوں پر حلوے کی لگدی بھی رکھ دی تھی۔ اس سے منہ میٹھا کیا۔ پھر منہ صاف کرنے کے لئے ایک پیسے میں دو دیسی پانوں کا بیڑا بنوایا، کلہ تازہ کیا، اوپر چڑھ کر اشوک کی لاٹ دیکھی اور آگے روانہ ہو گئے۔

ببر کے تکئے سے ہوتے ہوئے پرانے قلعے پہونچے۔ شیر منڈل پر چڑھے۔ کسی نے بتایا کہ اسی پر سے ہمایوں باشاہ کا پیر پھسلا تھا اور ایسا پھسلا کہ بادشاہ کو اپنی جان سے ہاتھ دھونے پڑے۔ مسجد میں سے جمنا کی سیر کی۔ کچھ لوگ قلعہ کے پہلو میں ہنڈیوں والے مزار کے ٹیلے پر چڑھے۔ خبر نہیں یہ کس زمانے کے بزرگ ہیں۔ لوگ منتیں مانتے ہیں اور جب مرادیں پوری ہو جاتی ہیں تو ایک مٹکے یا ہنڈیا میں شربت بھر کے مزار پر چڑھاتے ہیں۔ سینکڑوں ہزاروں ہنڈے اور ہانڈیاں یہاں اوندھی ہوئی دیکھ لو۔ ان پر اللہ کے بندے سفیدی بھی کر دیا کرتے تھے۔ دور سے ایسا لگتا تھا جیسے اس ٹیلے پر کگرمتا کا جنگل کھڑا ہے ۴۷ء میں جب دِلّی میں کٹا مری پھیلی اور دِلّی کے مسلمان گھروں سے نکل کر ان کھنڈروں میں آن پڑے تو پرانے قلعے میں ایک لاکھ نگھرے مسلمان تھے۔ ہم بھی ان ہی میں تھے۔ ہم نے یہ دیکھا کہ جب پانی بھرنے کے لئے برتنوں کی ضرورت پیش آئی تو انہی بزرگ کے مزار کے ہزاروں مٹکے ان مہاجروں کے کام آئے۔ خیر، یہ ایک الگ قصہ ہے۔ پھر کبھی آپ کو سنائیں گے۔

سیلانی دوپہر سے پہلے سلطان جی جا پہنچے۔ دِلّی والے حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء کا نام لینا بے ادبی سمجھتے ہیں، اس لئے اُنہیں سلطان جی کہتے ہیں۔

درگاہ میں داخل ہوئے۔ پہلے سلطان جی کے محبوب مرید حضرت امیر خسرو کے مزار پر فاتحہ پڑھی، پھر سلطان جی کے مزار پر حاضری دی۔ پہلو ہی میں مسجد ہے۔ اس

میں جا کر گنبد میں لٹکے ہوئے سونے کے کٹورے کو دیکھا۔ کہتے ہیں کہ کسی زمانے میں یہ نیچا تھا۔ کسی بدفطرت نے اسے چرانا چاہا تو اوپر کھنچ گیا۔ درگاہ سے نکل کر ہمایوں کے مقبرے کا رُخ کیا۔ یہاں بھی سیلانی اُترے ہوئے ہیں۔ پتنگ بازوں کے ہاتھ لگ رہے ہیں۔ مقبرے کا چکر لگایا اور صفدر جنگ کے مقبرے جا پہونچے۔ یہ مقبرہ مدرسہ کہلاتا ہے۔ ساون بھادوں میں کچھ دیر آرام کیا۔ قطب صاحب میں جب چھڑیاں ہوتی ہیں تو دِلّی والے مدرسے میں ضرور ٹھہرتے ہوئے جاتے ہیں۔ دِلّی کی بعض برادریوں میں عورتوں کا ایک گانا بھی گایا جاتا ہے......

چاہے سیاں مارو میں چھڑیوں میں جاؤں گی
اندر سے کی گولیاں مندر سے میں کھاؤں گی

مدرسے میں سُستا کر سیلانی موسم کا لطف اُٹھاتے، چہلیں کرتے حوض خاص جا پہنچے۔ یہ بڑے سکون کی جگہ ہے۔ تھوڑی دیر یہاں ٹھہرے، پھر قطب صاحب روانہ ہوئے۔ شام ہونے سے پہلے مہرولی پہنچ لئے۔ جن لوگوں نے کمرے یا بالا خانے کرائے پر نہیں لئے ہیں وہ جنگلی محل، ظفر محل، مرزا بابر کی کوٹھی اور بیسیوں پرانی عمارتوں میں جا اُترے اور اپنی تھگلی صاف کر قبضہ جما بیٹھے۔ کوئی روک ٹوک نہیں، جس کا جہاں جی چاہے رہے۔ شام ہو رہی ہے، اس لئے سب اپنے اپنے ٹھکانوں پر پہنچ کر سب سے پہلے کھانے کا انتظام کر رہے ہیں۔

مہرولی کا بازار سجا ہوا ہے۔ ہر چیز یہاں افراط سے ملتی ہے۔ تندور گرم ہیں، نان بائی حکم کے منتظر ہیں۔ اپنا گھی اور رَوا میدہ لایئے، اور اپنے سامنے پراٹھے لگوایئے۔ چنگیر میں ترتراتے پراٹھے رکھے، آم کا اچار سامنے کی دکان سے خریدا۔ افورے میں دودھ والے سے ربڑی لی۔ کان میں چرخی کے پنکھے کی آواز آئی، اُدھر کا رخ کیا۔ کبابی سیخیں بھر بھر کے رکھتا جاتا ہے۔ جو سیخیں سنک گئی ہیں پانی کا ہاتھ لگا کر اُنہیں ڈھاک کے دَونوں میں اُتارا جاتا ہے۔ اس سے حسب ضرورت گولے کے کباب خریدے۔ دو شاخہ جلائے آموں کا ڈھیر ٹھیلے پر رکھے پھیری والا آواز لگاتا سامنے سے گزرتا ہے۔

''کیرانے کا لڈوا ہے۔'' ایک پنسیری آم اس سے خریدے اور لدے پھندے اپنے ٹھکانے پر لوٹے۔ سب نے مل کر کھانا کھایا اور پھر جو پڑ کر سستائے تو صبح کی خبر لائے۔

صبح ہوئی، منہ ہاتھ دھویا، ناشتہ کیا۔ بازار میں ہمہ نعمت موجود ہے۔ سب کو سیر کی سوجھی۔ پہلے جہاز پر گئے۔ شمسی تالاب کٹورے کی طرح بڑا چھلک رہا ہے۔ پانی بہت گہرا ہے۔ اس میں صرف تیراک ہی اتر سکتے ہیں۔ وہاں سے اولیاء مسجد پہونچے۔ نفل پڑھے۔ یہاں سے جھرنے گئے۔ سہ درے والان کی چھت میں سے پانی اس طرح گر رہا ہے جیسے بارش ہو رہی ہو۔ پرنالوں کا پانی چھجے پر سے چادریں بن کر گر رہا ہے۔ حوض میں بچے، جوان، بوڑھے، سبھی نہا رہے ہیں، اور سہ درے کی چھت پر سے پانی ان پر گر رہا ہے۔ پھسلنا پتھر جھرنے کی دیوار میں گڑا ہوا ہے۔ اب ٹوٹ چکا ہے۔ اس پر سے پھسلنے میں بڑا مزہ آتا تھا۔ مرد عورت سب اس پر سے پھسلا کرتے تھے اور خوب ہنسی ہوتی تھی۔

اس سے آگے امریاں ہیں۔ بڑے بڑے تناور آم کے درخت اس طرح سر جوڑے کھڑے ہیں کہ دھوپ کا گزر نہیں ہوتا۔ بیسیوں جھولے ان میں پڑے ہیں۔ چپے چپے پر سیلانی بیٹھے ہیں۔ انگیٹھیاں دہک رہی ہیں، کڑھائیاں چڑھی ہوئی ہیں۔ گلگلے، سہال، اندرسے کی گولیاں، پھلکیاں اور پتے تلے جا رہے ہیں۔ جھولوں میں مرد کھڑے پینگیں بڑھا رہے ہیں۔ بعض جھولوں میں پڑیوں کے نیچے دس دس پندرہ پندرہ سیر کے پتھر بندھے ہوئے ہیں۔ یہ اس لئے کہ جب جھولے کی پینگ خوب بڑھ جائے تو جھولا اُلٹنے نہ پائے، جھولے کا لنگر قائم رہے۔ دوستوں میں شرطیں لگی ہوئی ہیں کہ پینگ اتنی اونچی جائے کہ سامنے والے درخت کا پتہ توڑ لیا جائے۔ خاصا جان جوکھوں کا کام ہے۔ مگر جھولنے والے جھولتے ہیں اور شرط بھی جیتتے ہیں۔

امریوں میں دوسری طرف پورے پورے گھر اترے ہوئے ہیں۔ عورتوں کے لئے دُہرے جھولے پڑے ہوئے ہیں۔ دو ان میں بیٹھتی ہیں اور آمنے سامنے ہو کر جھولتی ہیں، اور جھولنے والیاں اور جھلانے والیاں سب مل کر گا رہی ہیں......

چھا رہی کاری گھٹا جیا مورا لہرائے ہے
سن ری کوئل باوری تو کیوں ملہار گائے ہے
آ پپیہا آ ادھر، میں بھی سراپا درد ہوں
آم پہ کیوں جم رہا، میں بھی تو رنگِ زرد ہوں
فرق اتنا ہے کہ اس میں رس ہے مجھ میں ہائے ہے
چھا رہی کاری گھٹا جیا مورا لہرائے ہے

اللہ کا کرنا کیا ہوا کہ اسی وقت ایک زور کا چھینٹا آیا۔ اونٹتے تیل میں جو پانی کی بوند پڑی تو تیل چٹخا اور ''اُوئی اُوئی'' کہتی سب دور دور ہو بیٹھیں۔ جلدی سے کڑہائی پر تسلا ڈھانکا۔ چلتا ہوا ابر تھا، ذرا دیر میں کھل گیا۔ گرم گرم پکوان اترنے لگا۔ سب نے سیر ہو کر کھایا اور جھول جھول کر اور گھوم پھر کر ہضم کیا۔ لڑکیوں نے آنکھ مچولی کھیلی۔ کسی بڑی بوڑھی کو دائی بنایا۔ چور کی آنکھیں میچی گئیں۔ جو لڑکی چور بنی تھی آنکھیں کھلنے پر اوروں کو تلاش کرنے لگی۔ ڈھونڈتے ڈھونڈتے اس نے ایک کو تاک لیا اور اس کی طرف جھپٹی۔ اس نے چور کو اپنی طرف آتے دیکھ کر بھاگنا چاہا مگر چور لڑکی اس سے زیادہ تیز تھی۔ جب اس نے دیکھا کہ چور سے بچنا مشکل ہے تو چیخیں مارتی دائی کی طرف بھاگی۔ اتنے میں برابر اور لڑکیاں بھی قہقہے لگاتی اپنی اپنی اوٹ سے نکل کر کدکڑے لگانے لگیں۔ چور لڑکی کبھی ایک کے پیچھے بھاگتی، کبھی دُوسری کا پیچھا کرتی۔ اگر ایک ہی کے پیچھے لگی رہتی تو شاید اسے پکڑ لیتی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سب نے کاوے کاٹ کاٹ کر دائی کو چھو لیا اور یہ بچاری دوبارہ چور بنی۔

کہیں اندھا بھینسا کھیلا جا رہا ہے۔ ایک لڑکی کی آنکھوں پر ڈوپٹہ باندھ دیا گیا ہے۔ باقی لڑکیاں چپکے چپکے آ کر اُسے ستاتی ہیں۔ وہ غریب اندھوں کی طرح ہاتھ پھیلائے ان کی آواز پر دوڑتی ہے۔ مگر بھلا کون اس کے ہاتھ آتا ہے؟ سب خوب ہنستے ہنساتے ہیں۔

کہیں کوڑا جمال شاہی کھیلا جا رہا ہے اور بھاگتے چور کے کوڑے لگائے جا رہے ہیں۔

آج کا پورا دن امریوں ہی میں گزرا۔ خوب دھما چوکڑی رہی۔ جو کچھ کھایا پیا تھا سب ہضم ہو گیا۔ جب لوٹ کر اپنے ٹھکانے پر آئے تو وہاں سے خربوزے اپنے ساتھ لیتے آئے۔ دھول کوٹ، دو ہی مزے، پھیکا یا میٹھا۔ چار آنے کی پنسیری۔ ٹانکیاں لگا لگا کر میٹھے میٹھے کھائے، پھیکے ایک طرف اچھال دیئے۔ قطب کا پانی بڑا ہاضم ہے۔ ابھی کھاؤ ابھی پھر بھوک لگنے لگی۔ دلی والے جتنے دن یہاں رہتے ہین خوب ڈٹ کر کھاتے ہیں۔ سچ ہے، ایک ڈاڑھ چلے، ستر بلا ٹلے۔ اچھا، اب انہیں یہیں چھوڑ یئے۔ دن بھر کے تھکے ہوئے ہیں، لمبی تانیں گے، چل کر آپ بھی آرام کیجئے۔

○○

پھول والوں کی سیر

امریّوں میں پورا دن گزار کر جب آغا نواب مہرولی میں اپنے بالاخانے پر پہونچے تو سب تھک کر چور ہو رہے تھے۔ بڑے تو خیر بیٹھے سیر دیکھا کئے مگر بچوں نے کچھ کم ادھم مچائی تھی؟ جب رات کا کھانا کھا کر لیٹے تو ایسے گھوڑے بیچ کر سوئے کہ بس صبح کی خبر لائے۔ قطب صاحب میں ابھی بہت سی چیزیں دیکھنی باقی تھیں، اس لئے سب نے منہ ہاتھ دھو پوریوں کچوریوں کا ناشتہ کیا۔ دودھ کا ایک ایک پیالہ سب کو ملا۔ یہاں کا دودھ ایسا عمدہ اور گاڑھا ہے کہ جی چاہے تو اس میں سیک کھڑی کر لو۔ بھلا شہر والوں کو یہ دودھ کہاں نصیب؟ ایک ہی جوش میں اس پر یہ موٹی ملائی آجاتی ہے۔ ناشتے سے فارغ ہو کر سب سیر کو نکل گئے۔ یہاں سواری کا نہیں پیدل پھرنے کا مزہ ہے۔ یہاں اکے دکے تانگے، پالکی گاڑیاں سب موجود۔ اگر کہیں دور جانا ہو تو چند ٹکوں میں دم کے دم پہونچا دیتے ہیں۔

امریوں میں صبح ہی سے آج رونق ہے۔ مور جھنگار رہے ہیں۔ پپیہا پی کہاں کی ٹیر سنا رہا ہے۔ کوئل کوک رہی ہے۔ دیگیں دندنا رہی ہیں۔ پتیلیاں ٹھنٹھنا رہی ہیں، کڑہائیاں چڑھی ہوئی ہیں۔ ان میں تیل اونٹ رہا ہے۔ پکوان کی تیاری ہو رہی ہے۔ جھولے پڑے ہوئے ہیں، پینگیں بڑھ رہی ہیں، آم کا ٹپکا لگ رہا ہے، جامنیں ٹپا ٹپ گر رہی ہیں۔ بھمیری آوازوں میں بادشاہ کا گیت فضا میں گونج رہا ہے......

جھولا کن نے ڈالو ہے امرّیاں

باگ اندھیرے تال کنارے

مرلا جھنکارے، بادر کارے

برسن لاگیں بوندیں پھیّاں پھیّاں

جھولا کن نے ڈالو ہے امرّیاں

دو سکھی جھولیں، دو ہی جھلا ویں

چاروں مل گیاں بھول بھلیاں

بھولی بھولی ڈولیں شوق رنگ سیاں

جھولا کن نے ڈالو ہے امرّیاں

امرّیوں سے نکل کر گندھک کی باؤلی پر پہونچے، اس کا پانی ذرا سیاہی مائل ہے اور اس میں گندھک کی بو ہے۔ پھوڑے پھنسیوں والے اس میں نہاتے ہیں اور شفا پاتے ہیں۔ باؤلی میں کودنے والے لڑکے لنگر لنگوٹ سے تیار کھڑے ہیں۔ انہیں روپیہ، اٹھنّی، چونّی، حد یہ کہ چھوٹی دونی دکھا کر باؤلی میں پھینکیے، یہ اس کے ساتھ ہی چھلانگ لگائیں گے اور جب پانی میں سے اُبھریں گے تو ان کے دانتوں میں آپ کا پھینکا ہوا سکہ ہوگا۔ یہ آپ کو سلام کر کے پھر باؤلی پر جا کھڑے ہوں گے کہ کوئی اور سیلانی آئے اور ان کا کرتب دیکھے۔

سیلانی ناظر کے باغ میں گئے۔ اس کے چاروں حوضوں کی سیر کی۔ بارہ دری میں لیٹے بیٹھے۔ یہیں دن کا کھانا کھایا، بازار دور نہیں ہے۔ ہمہ نعمت مل جاتی ہے مگر جو مزہ روے میدے کے پراٹھوں اور گولے کے کبابوں میں ہے وہ اور کسی کھانے میں نہیں ہے۔ بیسیوں تندور گرم رہتے ہیں۔ برابر والی دکان سے روا میدہ اور گھی خریدیے اور نان بائی کے حوالے کیجیے۔ ایک کونے میں آٹا گوندھنے کا کونڈا گڑا ہوا ہے۔ اس پر ایک ڈالتا ہے، حسب ضرورت پانی اور گھی ڈال کر مکّیاں لگاتا ہے اور چشم زدن میں گوندھ گاندھ نان بائی کے حوالے کرتا ہے۔ آٹا ٹھہر جاتا ہے تو نانبائی سیر کے پانچ یا سیر کے چھ پیڑے توڑتا

ہے اور پتھر کی سل پر رکھتا جاتا ہے۔ پھر ایک ایک پیڑا اُٹھاتا ہے اور خشکی لگا کر پیڑے کو پھیلاتا ہے۔ گھی لگا کر اسے بیچ میں سے نصف چاک کر دیتا ہے اور اسے لپیٹ کر لمبا سا سانپ بنا لیتا ہے۔ اس سانپ کا پھر پیڑا بناتا ہے۔ یہ اس لئے کرتا ہے کہ پراٹھے کے کئی پرت بن جائیں اور اندر سے کچا نہ رہے۔ پراٹھا بڑھا کر رفیدے پر رکھتا ہے اور تندور کے کنارے پر بایاں ہاتھ رکھ کر دائیں ہاتھ سے جھک کر تندور میں پراٹھا لگا دیتا ہے۔ اتنے میں یہ تیار ہو، دُوسرا پیڑا اُٹھا لیتا ہے اور اس کے ساتھ بھی یہی عمل کرتا ہے۔ اِدھر دوسرا پراٹھا تیار کر کے تندور میں لگایا اُدھر تندور میں دو کانٹیاں ڈال پہلا نکال لیا اور چنگیر میں ڈال دیا۔ دس منٹ میں دو سیر کے پراٹھے تیار کر کے آپ کے حوالے کر دیتا ہے۔ اگر آپ کے ساتھ بھنا ہوا قیمہ اور ہری مرچیں ہیں تو سبحان اللہ، ورنہ لگاون کے لئے آم کا اچار، سیخ کے کباب، دہی یا ربڑی سامنے سے خرید لیجئے اور اللہ عزیز کیجئے۔ سیلانی شام تک ناظر کے باغ میں رہے اور آس پاس کے کھنڈروں کی سیر کرتے رہے۔ شام کا جھٹ پٹا ہوا تو اپنے اپنے ٹھکانوں پر جا پہونچے۔

اگلے دن قطب صاحب کی لاٹ پر گئے۔ جوانوں نے شرط لگائی کہ ایک سانس میں پانچوں کھنڈ طے کر کے اوپر پہونچیں گے۔ جو دمدار ہوتے ہیں وہ بغیر رکے سیڑھیاں طے کرتے چلے جاتے ہیں، باقی پھسڈی کہلاتے ہیں۔ لاٹ پر فرّاٹے کی ہوا کھائی، چاروں طرف نظر دوڑائی۔ دلی کی عمارتوں کو جانچا اور اتر آئے۔ آس پاس کے کھنڈروں میں گھومے پھرے، بھیم کی چھٹنکی پر پتھر کو ہلایا، کڑوا نیم چکھا، واپسی میں بھول بھلیاں میں ٹھکی لی۔ اس میں بھی سیلانی اترے ہوئے ہیں۔

تیسرے دن چہل من پر پہنچے۔ ان کی چالیس قبریں کبھی پوری نہیں گنی جاتیں۔ تعداد یا تو گھٹ جاتی ہے یا بڑھ جاتی ہے۔ بکاوَلی کے قلعے، جمالی کمالی کے مزار اور اندھیرے باغ کی سیر کی۔ لیجئے تین دن میں ساری سیر ہو گئی۔

ساون کی جھڑی ختم ہوئی اور بھادوں کی پھوار شروع ہوئی۔۔ اسی قطب صاحب میں پھول والوں کی سیر کے نام سے ایک بڑا اور صاف ستھرا میلہ ہوتا تھا۔ حضرت خواجہ

بختیار کاکیؒ کی درگاہ یہیں مہرولی میں ہے۔ اسی کی وجہ سے اس جگہ کا نام قطب صاحب پڑ گیا ہے۔ یہ ہمیشہ سے ایک صحت افزا مقام سمجھا جاتا ہے۔ اکبر شاہ ثانی اور بہادر شاہ ظفرؔ نے اسی وجہ سے یہاں اپنے محل بنوائے۔ جب بھی معاملاتِ سلطنت سے اُنہیں فرصت ملتی، قطب صاحب جا براجتے۔ یہ میلہ اکبر شاہ ثانی کے زمانے میں شروع ہوا۔ اس کی ابتداء یوں ہوئی کہ اکبر شاہ ثانی کے ایک چہیتے بیٹے تھے مرزا جہانگیر۔ بادشاہ کے اصل ولی عہد تو تھے بہادر شاہ ظفرؔ مگر اکبر شاہ ثانی مرزا جہانگیر کو اپنا ولی عہد بنانا چاہتے تھے مگر فرنگیوں نے اسے نہیں مانا۔ بادشاہ فرنگیوں کے دبیل تھے کیونکہ راج تو بادشاہ کا تھا مگر حکم فرنگیوں کا چلتا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ فرنگیوں سے انہیں دولاکھ روپے ماہوار وظیفہ ملتا تھا، اور ایک ریزیڈنٹ قلعۂ معلیٰ میں رہتا تھا جس کی مرضی بغیر بادشاہ کوئی حکم جاری نہیں کر سکتے تھے۔ مرزا جہانگیر کا لاڈ پیار میں ستیاناس ہو گیا تھا۔ ایک دن ریزیڈنٹ سے ان کا آمنا سامنا ہوا تو مرزا نے کہا۔ ''لولو ہے بےلولو ہے''۔ سٹین صاحب شہزادے کی بیہودگی کو سمجھ تو گئے مگر چندرا کے مرزا کے ساتھیوں سے پوچھا کہ ''صاحب عالم کیا کہتا ہے؟'' ساتھیوں نے رفع شر کے لئے کہا۔ ''حضور، صاحب عالم آپ کو لولو یعنی موتی کہتے ہیں۔'' سیٹن نے زہر خند کر کے کہا۔ ''ہم صاحب عالم کو لولو بنائے گا۔'' صاحب عالم سمجھتے تھے اپنے باپ کی حکومت ہے۔ اس فرنگی کی یہ مجال کہ یہ ہمیں لولو بنائے؟ انہوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ جھٹ سٹین پر طمنچہ داغ دیا۔ زندگی تھی جو وہ بچ گیا۔ سٹین نے اس واقعہ کی رپورٹ کمپنی بہادر کو کی اور مرزا جہانگیر کو نظر بند کر کے الہ آباد بھیج دیا اور بادشاہ سلامت سے عرض کیا کہ شہزادے کو تربیت کی ضرورت ہے۔ جب ان کی تربیت پوری ہو جائے گی تو الہ آباد سے واپس آجائیں گے۔ زبردست کا ٹھینگا سر پر، چاروناچار بیٹے کی جدائی گوارا کرنی پڑی۔ مرزا جہانگیر کی والدہ نواب ممتاز محل نے منت مانی کہ جب مرزا چھٹ کر آئیں گے تو قطب صاحب میں حضرت خواجہ بختیار کاکیؒ کے مزار پر پھولوں کا چھپر کھٹ اور غلاف چڑھاؤں گی۔

خبر نہیں الہ آباد میں مرزا پر کیا گزری۔ بارے جب وہ الہ آباد سے چھٹ کر آئے

تو الہ آباد سے دلی تک ہر شہر میں ان کا بڑا شاندار استقبال ہوا۔

اب خواجہ ناصر نذیر فراقؔ دہلوی سے منت بڑھانے کا حال سنئے......

''برکھا رُت، ساون کا مہینہ۔ بادشاہی خیمے، مخملی، باناتی، اطلسی، سبز، سرخ، زرد، ریشمی، کلابتونی، سوتی طنابوں سے جکڑے کھڑے تھے۔ ان کے سنہری کلس اور شمشے سورج میں چمک رہے تھے۔ اوپر نیلا آسمان، نیچے زمین پر سبزے کا فرش۔ خیموں کا سلسلہ اور جا بجا پانی میں ان کا عکس طلسمات کا عالم پیدا کر رہا تھا۔ بادشاہی خیمے سے لے کر قطب صاحب بندہ نواز کی درگاہ تلک جہاں مستورات جا سکتی ہیں دورویہ قناتیں کھڑی تھیں کیونکہ ملکۂ دوراں مرزا جہانگیر کو لے کر منت ادا کرنے کے لئے درگاہ میں حاضر ہوں گی۔ تیاری تو صبح سے ہو رہی تھی مگر دن کے تین بجے حضرت ظل سبحانی نے کہا۔ ''پنکھا چڑھانے کا وقت آگیا۔'' ملکہ دوراں نے پچاس خوان اندر سے کی گولیوں اور پھینیوں کے آراستہ کئے۔ ایک چاندی کی کشتی میں سونے کا پنکھا، جس میں پنّا، پکھراج، نیلم، یاقوت اور سچے موتی جڑے تھے، جس کی بالشت بھر نیچی جھالر کو بیگم نے جوہی کی کلیوں سے خود گوندھا تھا۔ مرزا جہانگیر کو دولہا بنا کر سہرا پھولوں کا، بدّھی طرّہ عطر میں بسا کر، اس کے سر پر بندھوا کر وہ کشتی صاحب عالم کے سر پر بسم اللہ کہہ کر بیگم نے رکھی اور بادشاہ زادے کی بلائیں لے کر کہا۔ ''اماں میرا منہ نہ تھا کہ تو فرنگیوں کے چنگل سے نکل کر شاہ جہاں آباد میں آئے اور میں تجھے دیکھوں۔ یہ سب حضرت کا صدقہ ہے۔ جان من منت کی کشتی سنبھال کر اور سر ادب نیاز سے جھکا کر درگاہ کو چلو۔ آؤ۔''

غلاف شریف کی سینی بادشاہ نے اپنے سر پر، اور صندل اور عطردان بیگم نے اپنے سر پر، اور مٹھائی کے خوان بادشاہ زادوں نے اپنے سروں پر رکھ کر سب نے مل جل کر آستانۂ پاک کی راہ لی۔ بیگمیں، بادشاہ زادیاں ٹلوااں جوڑے پہنے تھیں۔ گوکھرو کے جال، سلمہ ستارہ، کلابتوں کی تمامی زری، بوٹی، زربفت، کمخوابِ زری، ماچھ، اطلس، دلدائی، بابرینٹ، بنارس، گجرات، سورت، احمد آباد شریف، لاہور کے شاہی کارخانوں کے ریشمی اور زریں کپڑوں کے لباس پہن کر آراستہ ہو رہی تھیں۔ لاکھوں روپے کا جڑاؤ

گہنا ہاتھ گلے میں تھا۔ پور پور نارنول کی مہندی رچی ہوئی تھی۔ ڈھیلے پائچوں کو دولونڈیاں اٹھائے چلتی تھیں تو دو باندیاں پیچھے دوپٹے کو سنبھالے چلتی تھیں۔ آگے آگے روشن چوکی اور نفیری بجانے والیاں سب عورتیں تھیں۔ بیگموں کے جھانجن، چوڑیوں اور پازیب کی جھنکار سے زندوں اور مردوں کے دل کانپتے تھے۔ قنات درقنات یہ سب درگاہ شریف پہونچے، باجے گاجے سب آستانے کے باہر ہی تھمادیئے۔ ملکۂ جہاں اور سب عورتیں فرخ سیر والی جالیوں تک جا کر رک گئیں۔ اگرچہ ساری درگاہ کا زنانہ ہو رہا تھا عورتوں کے لئے ہمیشہ سے یہی حد ادب ہے۔ بادشاہ اور مرزا جہانگیر اور سب مرد مزار شریف پر گئے اور پہلے غلاف اور پھر صندل چڑھایا، اوپر سے عطر لگایا۔ پنج آیت پڑھی گئی۔ شیرینی تقسیم ہوئی نقد نذرانہ جھجری میں بھر دیا گیا۔ بادشاہ زادے کو قدم بوس کرایا، اور سب حاجتی دُعا کر کے قنات کے اندر پلٹ کر سراپردۂ شاہی میں داخل ہوئے۔''

رعایا نے بھی اس خوشی میں بادشاہ کا ساتھ دیا۔ خوب خوشی منائی اور پھولوں کا ایک چھپر کھٹ حضرت بختیار کاکیؒ کے مزار پر چڑھایا۔ پھول والوں نے پھولوں کا ایک بڑا سا پنکھا چھپر کھٹ میں لٹکا دیا تھا۔ یہ رسم اور روایت بعد میں بھی قائم رہی۔ بادشاہ کو یہ تقریب اس قدر پسند آئی کہ یہ میلہ ہر سال ہونے لگا۔ دربار شاہی سے پھول والوں کے دوسو روپے سالانہ مقرر ہو گئے تھے۔ یہ میلہ ''پھول والوں کی سیر'' کہلایا۔ شاہی ختم ہوئی، فرنگیوں کا راج بھی ختم ہوا۔ مگر دلی کے منچلے اب بھی ہر سال برکھارت میں یہ میلہ مناتے ہیں اور خواجہ صاحب کے مزار پر پھولوں کا چھپر کھٹ اور پنکھا چڑھاتے ہیں۔

پہلے یہ غریبوں اور امیروں سب کا میلہ تھا، بعد میں غریبوں کا رہ گیا۔ امیر اپنی موٹروں میں دلی سے قطب صاحب جاتے اور دو چار گھنٹے جی بہلا کر چلے آتے۔ مگر دلی کے غریب بڑے حوصلہ مند تھے۔ خوب جی کھول کر خرچ کرتے، کچھ دنوں پہلے سے اس کی تیاری شروع کر دیتے، قرض دام سے بھی نہ چوکتے۔ انہوں نے اپنی آن کے پیچھے لاکھ کا گھر خاک کر دیا۔

لیجئے، میلے کی تاریخ مقرر ہو گئی۔ دستکاروں نے کرخنداروں سے دھیا نگیاں اور

پیشگیاں لیں۔ نئے جوڑے سلوائے۔ چکن کے کرتے بیلوں بھرے، آڑے پاجامے جن میں آدھی پنڈلی تک چوڑیاں، پاؤں میں سلیم شاہی سر پر سلمہ ستارے کی گول ٹوپی پھڈّی باڑ کی۔ تیل پھلیل لگایا۔ منہ میں گلوری دبائی۔ الائچی کی خوشبو اُڑتی ہوئی۔ کندھے پر چادرہ یا شالی رومال۔ دائیں بائیں دیکھتے عجیب شان سے چلے جاتے ہیں۔ کیوں نہ ہو دلی کے دل والے ہیں۔ یہ صرف آج کے آرام کو دیکھتے ہیں، کل کی کل دیکھی جائے گی، جس نے دیا ہے تن کو وہی دے گا کفن کو......

ہاں تو آج چودہویں تاریخ ہے۔ مہرولی کے بازاروں میں وہ ریل پیل ہے کہ کبھی تھالی پھینکو تو سروں ہی سروں پر جائے۔ کھوے سے کھوا چھل رہا ہے۔ کمزور کے چلنے کا بھرم ہی نہیں۔ ابھی یہاں کھڑے تھے، ابھی جو ریلا آیا تو وہاں پہونچے۔ دکانیں روشنی سے بقعہ نور بنی ہوئی ہیں۔ سقے کٹورے بجارہے ہیں اور ہر آنے جانے والے سے پوچھتے ہیں۔ ''میاں آب حیات پلاؤں؟'' مشک میں کنوئیں کا پانی ہے جس میں برف پڑی ہے۔ جی چاہا تو پانی پیا اور پیسہ دو پیسہ ہاتھ پر رکھ دیا۔

گگڑوالے کی عجب شان ہے۔ قدآدم حقے میں کئی گز لمبی نے لگی ہے۔ حقہ کیا ہے دُولہا ہے کہ سر سے پاؤں تک پھولوں میں لدا ہوا ہے۔ چاندی کی زنجیریں اور لٹو آویزاں ہیں۔ نے نیچی ہوتی ہے تو بازاروالے باری باری کش لگاتے ہیں، اور اوپر ہوتی ہے تو بالاخانوں پر برآمدوں میں بیٹھے ہوئے لوگ دو دو کش لیتے ہیں۔ خمیرے کی لپٹیں اٹھ رہی ہیں اور سارا بازار مہک رہا ہے۔

مغرب کے بعد جھرنے سے نفیری کی آواز آئی اور ساری خلقت اُدھر ڈھل گئی۔ پنکھا جھرنے سے اُٹھایا۔ یہ پھولوں کا بڑا سا پنکھا ہے جس میں مقیش اور پنّیاں لگی ہوئی ہیں۔ ہنڈوں کی روشنی میں پنکھا جگر جگر کر رہا ہے۔ آگے آگے ڈھول تاشے والے۔ ان کے پیچھے دلی کے اکھاڑے۔ ہر اکھاڑے کے آگے اُستاد اور پٹھے ہیں جو اپنے اپنے کمالات دکھاتے چلے آتے ہیں۔ کوئی لیزم ہلا رہا ہے۔ کوئی تلوار کے ہاتھ دِکھا رہا ہے، کوئی خنجر کے وار کر رہا ہے۔ کہیں بانک، پٹہ، بنوٹ کے کرتب ہیں۔ اکھاڑوں کی ایک

لمبی لین ڈوری چلی گئی ہے۔ ان کے پیچھے نفیری والے ہیں۔ کٹورے بجانے والے سقوں کی ٹولیاں بھی ہیں۔ یہ سقے موٹے برنجی کٹورے ایک ایک ہاتھ میں دو دو لے کر بجاتے ہیں اور بجانے میں لَے کی ایسی تراش خراش کرتے ہیں کہ بے اختیار منہ سے سبحان اللہ نکل جاتا ہے، ڈھول تاشے کے ساتھ مٹکتے اور پینترے بدلتے جاتے ہیں۔ یہی کیفیت ڈنڈے والوں کی ہے۔ بڑے ناز و انداز سے گھیرے میں گھومتے اور ایک دوسرے سے ڈنڈے ٹکراتے ہیں، دیکھنے والے ان کے مٹکنے پر ریجھے جاتے ہیں۔

سب سے آخر میں پنکھا ہے جس کے آگے شہنائی بجتی آتی ہے۔ اس کے پیچھے پھول والوں کے غول ہیں۔ یہ جلوس آہستہ آہستہ بازار میں گزرتا ہے بالا خانوں سے پھول برستے ہیں، گلاب چھڑکا جاتا ہے۔ ہنرمند فنکاروں کو لال سبز دوپٹے دئے جاتے ہیں۔

کوئی بارہ بجے تک یہ جلوس جوگ مایا کے مندر پہنچتا ہے۔ ایک بجے تک پنکھا چڑھا کر لوگ واپس آتے ہیں۔ اگلے دن اسی دھوم دھام سے حضرت خواجہ بختیار کاکیؒ کی درگاہ میں پنکھا چڑھتا ہے۔ اس سے فارغ ہوکر سب کے سب شمسی تالاب پر پہونچتے ہیں۔ یہاں آتش بازی چھوڑی جاتی ہے۔ دلی کے آتش بازوں کو اپنا ہنر دکھانے کا اس سے بہتر موقع بھلا اور کب مل سکتا ہے۔ جہاں پر مہتابی کے چھٹتے ہی طرح طرح کی آتش بازی چھوٹنے لگتی ہے اور وہ روشنی ہوتی ہے کہ رات کو دن ہو جاتا ہے، اور شمسی تالاب کا پانی پگھلا ہوا سونا بن جاتا ہے۔ چار پانچ گھنٹے تک یہ آتشیں گل بوٹے کھلتے رہے۔ آتش بازی کے ساتھ میلہ ختم ہوا اور تھکے ہارے سیلانی صبح ہوتے اپنے اپنے ٹھکانوں پر واپس آئے۔ اتنے میں فجر کی اذان ہوگئی۔ اب سونے کا بھلا کیا وقت رہ گیا؟ اپنے رب کا شکر ادا کرو کہ اس نے یہ بہار دکھائی۔ نور ظہور کا وقت ہے۔ آغا نواب اور ان کے سب گھر والوں نے وضو کیا، نماز پڑھی، ناشتہ کیا اور سب کے ساتھ اپنی سواریوں میں دلی روانہ ہو گئے۔

بڑی ننھی نے کہا۔ ''نانی اماں، یہ سیر تو بڑے مزے کی رہی۔''

نانی اماں بولیں۔ ''ہاں بیٹی غنیمت ہے۔''

چھوٹی ننھی نے تنک کر کہا۔ ''نانی اماں آپ کو تو آج کل کے زمانے کی کوئی بات پسند نہیں آتی۔''

نانی:۔ بیٹی آنکھوں نے جو کچھ دیکھا ہے اور ان کانوں نے جو کچھ سنا ہے اس کے آگے آج کل کی کوئی بات نہیں جچتی۔ اب اس سیر ہی کو لے لو، جیسی ہمارے بچپن میں ہوتی تھی ویسی ہم نے بھی نہیں دیکھی۔

بڑی ننھی:۔ اچھی، تو اگلے وقتوں میں اس میں کیا چار چاند لگے ہوئے تھے؟

نانی:۔ ہاں بیٹی چار چاند ہی لگے ہوئے تھے۔ یہ میلہ بادشاہ کی سرپرستی میں ہوتا تھا، اور بادشاہ خود اس میں شریک ہوتے تھے۔ وہ دھوم دھام ہی کچھ اور تھی۔ لال قلعہ کی کوکھ ہری تھی، الغاروں دولت بھری پڑی تھی۔ لڈو ٹوٹتا ہے تو سبھورا سبھورا سبھی کو پہنچتا ہے۔

چھوٹی ننھی:۔ اچھا تو بتایئے نا کہ آپ کے زمانے میں سیر کیسی ہوتی تھی؟

نانی:۔ یہ شہر آبادی کا ذکر ہے، غدر پڑنے سے پہلے کا۔ مجھے پورا سا ہوش بھی نہیں تھا۔ ہاں ہمارے ہاں ایک مغلانی آیا کرتی تھیں۔ بڑی بڑی غلافی آنکھیں، گالوں کی ہڈیاں ابھری ہوئیں، منہ میں کوئی دانت نہ تھا۔ سر پر روئی کے گالے سے بال، دھان پان سی آدمی تھیں، وہ سنایا کرتی تھیں اس سیر کا حال۔ کہتی تھیں کہ......

''مہینوں پہلے بادشاہ کے ہاں پنکھے کی تیاریاں ہو جاتی تھیں۔ بادشاہی محل جھاڑ جھوڑ، فرش فروش، چلمنوں پردوں سے آراستہ کر دیا جاتا۔ ایک دن پہلے محل کا تانتا روانہ ہوتا۔ خاصگی رتھوں میں تورے واریں۔ تصرفی میں سب کارخانے والیاں، نوکریں، چاکریں، لونڈیاں، باندیاں ہوتیں۔ خواجے سپاہی ساتھ چلے جاتے۔ دوسرے دن بادشاہ سوار ہوتے۔ بیگمات اور شاہزادے پالکی اور عماریوں میں ساتھ ہوتے۔ شہر کے باہر سواری آئی، جلوس ٹھہر گیا، سلامی اُتار کر رُخصت ہوا۔ چھڑی سواری ہوادار یا سایہ دار تخت یا چھ گھوڑوں کی بگھی میں خواجہ صاحب میں داخل ہوئے۔ سنہری بگھی اور پالکی نما بنگلہ، اوپر چھجہ، ان پر کلسیاں ہیں، کوچبان لال لال بانات کی قمریاں، پھندنے دار گردان ٹوپیاں کلابتونی کام کی پہنے ہوئے، گھوڑوں کی پیٹھ پر بیٹھے ہانکتے جاتے ہیں۔

آگے آگے سانڈنی سوار، پیچھے سواروں کا رسالہ آبدار جھنڈا لئے، چوبدار عصا لئے، گھوڑوں پر سوار، بگھی کے ساتھ ساتھ اُڑے جاتے ہیں بادشاہی محل سے لے کر تالاب اور جھرنے اور امریوں اور ناظر کے باغ تک زنانہ ہو گیا۔ جا بجا سراپچے کھنچ گئے، سپاہی اور فوجوں کے پہرے لگ گئے، کیا مقدور غیر مرد کے نام ایک پتہ بھی کہیں دکھائی دے جائے۔ محل کی جنگلی ڈیوڑھی سے بادشاہ ہوادار میں اور ملکہ زنانی تام جھام میں اور سب ساتھ ساتھ سواری کے جھرنے پر آئے۔ بادشاہ اور ملکہ زمانی بارہ دری میں بیٹھے اور سب اِدھر اُدھر سیر کرنے لگے۔ کڑھائیاں چڑھ گئیں، پکوان ہونے لگے۔ امریوں میں جھولے پڑ گئے۔ سودے والیاں آ بیٹھیں۔

ایک کھڑی، ایک کو بُلسا رہی ہے۔ ''اے بی زناخی'' اے بی دشمن، اے بی جان من! اچھی چلو پھسلنے پتھر پر سے پھسلیں۔'' وہ کہتی ہیں ''اے بی ہوش میں آؤ۔ اپنے حواسوں پر سے صدقہ دو۔ اپنے عقل کے ناخن لو، کہیں کسی کا ہاتھ منہ تڑاؤ گی۔'' انا ددا سمجھانے لگیں۔ ''واری، کہیں بیویاں، بادشاہ زادیاں بھی پتھروں پر سے پھسلتی ہیں۔ لونڈیوں اور باندیوں کو پھسلواؤ اور آپ سیر دیکھو۔''

''چلو بی، میں تمہارے پھلاسڑوں میں نہیں آتی۔ تم یوں ہی پھپڑ لا لے کیا کرتی ہو۔ نہیں نہیں ہم تو آپ ہی پھسلیں گے۔''

شام ہو گئی، جسولنی نے آواز دی۔ ''خبردار ہو، بادشاہ سوار ہوئے۔''

وہ سب کچھ پھینک پھانک سواری کے ساتھ ہوئیں۔ نوکریں چاکریں گٹھری مٹھری سمیٹ سنبھال پیچھے للو پتو کرتی دوڑیں۔

پندرہ دن تک روز اسی طرح جھرنے اور تالاب اور لاٹھ کا زنانہ ہو گا۔

تین دن سیر کے باقی رہے، پھول والوں نے بادشاہ کو عرضی دی، دو سو روپے جیب خاص سے ان کو پنکھے کی تیاری کے لئے مرحمت ہوئے۔ تاریخ ٹھہر گئی۔ شہر میں نفیری بج گئی۔ جھرنے کا زنانہ موقوف ہوا۔

اب شہر کی خلقت آنی شروع ہوئی۔ جمعرات کے دن سارے شہر کے امیر

وغریب، دکاندار، بزاری بزاری جمع ہو گئے۔ شہر سنسان ہو گیا۔

اب تیسرا پہر ہوا۔ ادہر شاہزادوں کی سواری، ادہر پنکھے کی تیاری ہونے لگی۔ شہر کے امیر وغریب اچھے اچھے رنگ برنگے کپڑے پہن کرنئی سج دھج، نئی نرالی انوکھی انوٹ، انوکھی وضع سے اپنے اپنے کمروں، برآمدوں، چھجوں، کوٹھوں اور چبوتروں پر ہو بیٹھے۔

اہاہا! دیکھنا، وہ پھول والوں کے پنکھے کس دھوم سے آئے۔ کیا بہار کے پنکھے ہیں! آگے پھولوں کی چھڑیاں، ہزارے چھوٹتے، نفیری والے ٹھنکتے ٹھکاتے، روپے رولتے چلے آتے ہیں۔ پیچھے شہزادے ہاتھیوں پر سوار، آگے سپاہیوں کی قطار، تاشہ مرفہ بجاتے ہوئے، پیچھے خواص میں مختار بیٹھے مورچھل کرتے ہوئے، نقیب چوبدار پکارتے ہوئے ''صاحب عالم پناہ'' چلے آتے ہیں۔ ان کے پیچھے اور امیر امراء کے ہاتھی چلے آتے ہیں۔ اس دُھوم دھام سے شام کو شاہی محلوں کے نیچے پنکھے آئے۔ اب نفیری والوں کی سیر دیکھو، کیسی جان توڑ توڑ کر نفیری بجا رہے ہیں۔ خواجے اوپر سے ان کی جھولیوں میں چھنا چھن روپے پھینک رہے ہیں۔ انعام لے لے کر رخصت ہوئے۔ پنکھے جا جا کر درگاہ میں چڑھادئے۔

رات بھر ناچ رنگ کی محفلیں ہوئیں۔ ڈھولک، ستار، طنبورہ کھڑکتا رہا۔ صبح کو سونے چاندی کے چھلے، انگوٹھیاں، اکے، نونگے، پوتھوں کے لچھے، موتیوں کے ہار، اور لال، سبز، اودے، پچرنگے سوت کے ڈورے، پنکھیاں، پراٹھے، پنیر، کھویا، یہاں کی سوغاتیں لے لِوا چلنا شروع کیا۔ شام تک سب میلہ بھڑی ہو گیا۔

بادشاہ ساری برسات یہیں گزاریں گے۔ سیر و شکار، کل سلطنت کے کاروبار سرانجام ہوتے رہیں گے۔

جو بیگماتیں سیر میں نہیں آئیں انہوں نے اپنے چھوٹوں کو قلاقند، موتی پاک، لڈو کی ہنڈیاں آٹے سے منہ بند کر کے چٹھیاں لگا اور بٹوؤں میں اشرفیاں روپے ڈال کر چوبداروں اور خواصوں کے ساتھ بھنگیوں میں بھیجیں۔ سب نے پانچ پانچ، چار چار، دو دو روپے چوبداروں اور خواصوں کو انعام میں دئے، اور ان کے لئے سوغاتیں یہاں سے بھیجیں۔ لو صاحب! پھول والوں کی سیر ہو چکی۔'' (اقتباس اَز ''بزم شاہد'')

OO

شام کی چہل پہل

جامع مسجد کے جنوبی رخ کی سیڑھیوں پر کوئی بازار نہیں تھا۔ اکثر فقیر اور کنگلے ان پر پڑے رہتے تھے۔ ایک مجذوب ہیں مادر زاد ننگے، نابینا ہیں، حافظ جی کہلاتے ہیں۔ خاک میں لوٹتے رہتے ہیں۔ ہم نے جب سے ہوش سنبھالا حافظ جی کو ایک سا ہی دیکھا۔ انہیں دِلّی والے بڑا جلالی بتاتے تھے۔ طرح طرح کی روایتیں ان کے بارے میں مشہور ہیں۔ پولیس نے انہیں کئی بار جیل میں بند کیا مگر سنا ہے کہ وہ باہر نکل آتے ہیں۔ ابھی کلکتہ میں موجود اور ابھی دلی میں آ گئے۔ منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑایا کرتے ہیں۔ ضرورتمند اور عقیدتمند انہیں گھیرے رہتے ہیں۔ کوئی دُودھ کا افورا ہاتھ میں لئے اُنہیں پلانے کی کوشش کر رہا ہے۔ کوئی دونے میں مٹھائی لئے حاضر ہے۔ مگر حافظ جی نہ تو کچھ کھاتے ہیں اور نہ پیتے ہیں۔ سب کو دھتکارتے ہی رہتے ہیں۔ شہر کے بعض رئیس بھی ان کے معتقد ہیں۔ جو بات ان کے منہ سے نکلتی ہے ہو کر رہتی ہے۔ جواری اور سٹے باز انہیں گھیرے رہتے ہیں۔ ان کی بڑ سے ہی اپنے مطلب کی بات نکال لیتے ہیں۔ لگ گیا تو تیر ورنہ تکا۔ دو کہار انہیں ڈولی میں ڈال کر مقررہ گھروں پر لے جاتے ہیں اور صاحب خانہ کہاروں کو دو دو روپے دیتے ہیں۔ حافظ جی کے آنے کو یہ لوگ باعث برکت سمجھتے ہیں۔ ہم نے ان کی کوئی کرامت تو دیکھی نہیں البتہ یہ ضرور دیکھا کہ دلی کی بربادی سے پہلے حافظ جی خاک بہت اُڑانے لگے تھے۔ مٹھیاں بھر بھر کے خاک اُڑایا کرتے تھے۔ لوگ پوچھتے......

"حافظ جی، یہ کیا کر رہے ہو؟"

وہ کہتے۔ "اب تو خاک ہی اڑے گی۔"

اور ۴۷ء میں جیسی خاک اڑی وہ ہم نے بھی دیکھی اور آپ نے بھی۔ دلی کو لوکا ہی لگ گیا۔

ان سیڑھیوں کے مغربی پہلو میں تہہ بازاری ہے۔ سامنے ٹرام کا ٹکٹ گھر ہے۔ سارے شہر کی ٹرامیں یہاں آ کر دم لیتی ہیں۔ ایک بوڑھا نابینا فقیر خواجہ میر دردؔ کی غزل......

جس لئے آئے تھے سو ہم کر چلے
تہمت چند اپنے ذمّے دھر چلے

بڑی دردناک دُھن میں سناتا رہتا تھا۔ اس کی آواز دور ہی سے سنائی دینے لگتی ہے۔ اس نے مطلع میں خاصی تحریف کر لی ہے۔ مگر اس تصرف میں مزہ آ گیا......

کس لئے آئے تھے ہم کیا کر چلے
تہمتیں چند اپنے ذمّے دَھر چلے

خواجہ میر دَرؔد کے جانشین خواجہ ناصر نذیر فراقؔ دہلوی اس فقیر کو ایک روپیہ دے کر یہ غزل سنا کرتے تھے۔ مودب بیٹھ جاتے اور ہر شعر پر جھومتے رہتے۔ جب وہ یہ شعر پڑھتا......

ساقیا یاں لگ رہا ہے چل چلاؤ
جب تلک بس چل سکے ساغر چلے

تو ان کی ایک آنکھ ساون اور ایک بھادوں بن جاتی۔ عجب کیف کا عالم اُن پر طاری ہو جاتا تھا۔ فراقؔ مرحوم نے اس مطلع کی تحریف پر نابینا کو کبھی متوجہ نہیں کیا۔ اس کی صدا سنتے اور آنکھیں چھلکنے لگتیں۔

○○

''کباب آہو۔''

چوک کے شور کو چیرتی ہوئی ایک آواز گونجی۔ اس آواز میں کوہ ندا کی سی کشش ہے۔ دیکھئے یہ صاحب جو بجلی کے ہنڈے کے نیچے اپنا خونچہ لئے بیٹھے ہیں یہ آواز انہی کی ہے۔

''کیوں بھئی تم کیا بیچتے ہو؟''

''حضور، کباب آہو۔''

یہ کہہ کر انہوں نے جو منہ اوپر کو اٹھایا تو ان کی کوڑیوں جیسی آنکھیں ہنڈے کی روشنی میں چمکیں۔

''ارے یہ بچارا تو اندھا ہے۔''

خوانچے والے نے سن لیا۔ بولا......

''بچپن میں سیتلا نکلی تھی، آنکھیں جاتی رہیں۔''

''اچھا تو تم ہی کباب بناتے ہو۔''

''جی نہیں حضور۔ سودا سلف بازار سے لے آتا ہوں۔ گھر والی کباب تیار کر دیتی ہے۔ ہم بس دو ہی دم ہیں۔ اللہ کی مہربانی سے گزارہ ہو جاتا ہے۔''

''بھئی تم بڑے ہمت والے غیرت مند آدمی ہو۔ کوئی کم ہمتا ہوتا تو بھیک مانگنے لگتا۔''

''جی حضور، چلتے ہاتھ پاؤں کسی کے آگے ہاتھ پسارنا اچھا نہ لگا۔''

''اچھا، اپنے کباب تو کھلاؤ۔''

اندھے نے دو طشتریوں میں دو دو شامی کباب رکھ ایک طرف چٹنی کی لگدی رکھ دی۔ اوپر سے پیاز کا لچھا ڈال گاہکوں کے حوالے کیا۔ بولا......

''حضور، آج واقع میں ہرن ہی کے کباب ہیں۔''

''اچھا! ہرن کا گوشت تم کہاں سے لائے؟''

''جی ہمارے پڑوس میں ایک شکاری رہتے ہیں۔ اُن سے مجھے ہرن کا گوشت مل جاتا ہے۔''

''اور جب نہیں ملتا تو؟''

''تو حضور، بازار سے بکری کا گوشت لے لیتا ہوں اور شامی کباب کی آواز لگاتا ہوں۔''

''بھئی تم ایماندار آدمی ہو۔ یہ لو۔''

گاہکوں نے ایک روپیہ دیا اور چلنے کو ہوئے تو اندھے نے کہا......

''بابو جی تھمیئے۔'' اور خوانچے میں سے ٹٹول کر بارہ آنے انہیں واپس دے دیئے۔

''نہیں نہیں، تم یہ بارہ آنے بھی اپنے پاس رکھو۔''

''نہیں حضور، یہ نہیں ہوسکتا۔ چار کبابوں کے چار آنے ہی ہوتے ہیں۔''

''مگر ہم تو خوشی سے تمہیں ایک روپیہ دے رہے ہیں۔''

''اللہ آپ کو خوش رکھے۔ یہ مجھ سے نہ ہوگا۔''

بہت کہا مگر اندھا نہ مانا۔ ہار کر بارہ آنے اس سے واپس لینے پڑے۔

بھئی یہ دِلّی ہے۔ یہاں بڑا بڑا اکڑھ مغزا پڑا ہے۔ بھلا وہ کسی کی خیرات زکواۃ کیوں لینے لگا؟ چلو اپنی راہ لو۔

○○

جہاں ہم اب کھڑے ہیں وہ ایک چھوٹا سا چوراہا ہے۔ جامع مسجد کے جنوبی رخ ہماری پشت ہے۔ دائیں ہاتھ کو ایک راستہ سنگھاڑے سے لگا لگا چاوُڑی بازار کو چلا جاتا ہے۔ یہ وہی چاوُڑی ہے جس کے بارے میں راسخ نے کہا ہے......

چاوُڑی قاف ہے یا خلد بریں ہے راسخ
جمگھٹے حوروں کے، پریوں کے پرے رہتے ہیں

تیس پینتیس سال پہلے تک چاوُڑی کے سارے بالا خانے آباد تھے اور تیسرے پہر ہی سے بجنے شروع ہو جاتے تھے۔ ادھر شام کا جھٹ پٹا ہوا اور ادھر اندر کا اکھاڑا چاوُڑی میں اترا۔ پیشہ ور عورتیں بن سنور کر بالا خانوں کے برآمدوں میں آ بیٹھتیں۔ یہ عموماً باہر والیاں ہوتی تھیں، پاتریں کہلاتی تھیں۔ خاندانی یا ڈیرے دار طوائفیں سر بازار

نہیں بیٹھتی تھیں۔ ان کے علیحدہ کمرے ہوتے تھے، یا مکان ہوتے تھے۔ ان کے ہاں ایرے غیرے نتھو خیرے جا بھی نہیں سکتے تھے۔ یہ پیسہ بھی نہیں کماتی تھیں۔ کسی ایک رئیں کی پابند ہوتی تھیں، البتہ جانے پہچانے شرفا ان کے ہاں جایا کرتے تھے۔ گھنٹہ دو گھنٹہ بیٹھتے، شائستہ گفتگو ہوتی۔ شعروشاعری، بولی ٹھولی، ہنسی مذاق کی باتیں ہوتیں، گانے کی محفل ہوتی۔ خیال، ٹھمری، دادرا، غزل گائی جاتی۔ ڈیرہ دارنیوں میں شرفا کے گھروں کا ماحول ہوتا تھا۔ کوئی بیہودگی، کوئی بدتمیزی روا نہیں رکھی جاتی تھی۔ جبھی تو دلی کے اگلے شرفا اپنے بچوں کو تمیز و شائستگی سیکھنے کے لئے ان کے ہاں بھیجا کرتے تھے۔

غروب آفتاب کے بعد چاوڑی کے بالا خانے بقعۂ نور بن جاتے۔ طبلے کھڑکنے لگتے، تانیں اڑنے لگتیں، تھئی ناچ ہوتا۔ شوقین مزاج من چلے کمروں پر جا کر گانا سنتے، ناچ دیکھتے اور حسب توفیق پان کی تھالی میں روپے رکھ کر چلے آتے۔ یہ گانے ناچنے والیاں اچھے اُستادوں سے فن سیکھتی تھیں۔ گھر گھر ان کے مجرے ہوتے تھے۔ کئی کئی سو کی پشوازیں پہن کر ناچتی تھیں۔ ان کی کسی محفل کا حال بھی ہم کبھی آپ کو سنائیں گے۔ یہ بازار چونکہ جامع مسجد کے مغربی رخ پر تھا اس لئے دیندار مسلمانوں کو اس پر اعتراض تھا۔ برسوں اسے یہاں سے اُٹھوانے کی کوشش کی گئی مگر اس بازار میں جائداد ہندوؤں کی زیادہ تھی، اور میونسپل کمیٹی میں بھی ہندو ممبروں کی تعداد زیادہ تھی، اس لئے یہ بازار مدتوں تک یہیں جما رہا۔ مگر جب لاہوری دروازے سے اجمیری دروازے تک دونوں طرف کے پہلوؤں کی زمین نیلام ہوگئی اور ایک نیا بازار بن گیا تو اسے آباد کرنے کے لئے کرایہ داروں کی ضرورت پیش آئی۔ اب جو مسلمانوں نے چاوڑی سے رنڈیوں کو ہٹانے کا مطالبہ پیش کیا تو ہندوؤں نے بھی ایک یہ نئی تحریک چلائی کہ شہر کے وسط میں رنڈیوں کا رہنا خطرے سے خالی نہیں ہے، لہٰذا انہیں اُٹھا دینا چاہئے۔

یہاں سے اُٹھا کر انہیں کہاں جگہ دی جائے؟

نئے بازار میں۔

لو صاحب، چاوڑی خالی ہوگئی اور نیا بازار آباد ہوگیا۔ اس کا نام نئی چاوڑی پڑ گیا

تھا۔ سڑک کا نام برن بسچین روڈ تھا۔ اس لئے آگے چل کر یہ نیا رنڈی بازار صرف ''روڈ'' کہلانے لگا۔ دیکھتے ہی دیکھتے جنگل میں منگل ہوگیا۔ سارے کرشمے پیسے کے ہیں۔

جامع مسجد کے جنوبی چوراہے کے سامنے والا راستہ ٹمیا محل کا بازار ہے۔ بائیں ہاتھ کو مچھلی والوں کا بازار ہے۔ اس میں پہلے صرف انڈا، مرغی، مچھلی اور گوشت کی دکانیں تھیں۔ کوئی چالیس سال سے اس میں کتابوں کی دکانیں کھلنی شروع ہوگئی تھیں۔ رفتہ رفتہ اس بازار میں کتابوں کی دکانوں کی کثرت ہوگئی۔ خواجہ حسن نظامی مرحوم نے بھی اسی بازار میں ایک بہت بڑا کتب خانہ ''دی حسن نظامی ایسٹرن لٹریچر کمپنی'' کے نام سے قائم کیا تھا۔ خواجہ صاحب کی سرکردگی میں تمام کتب فروشوں نے کوشش کر کے اس بازار کا نام پلٹوا کر ''اُردو بازار'' رکھوایا۔ شاہ زمانے میں اسی کے قریب ایک اُردو بازار تھا بھی جو خانم کے بازار وغیرہ کے ساتھ کھد گیا اور ان بڑے بڑے بازاروں کی جگہ پریڈ کا میدان بن گیا۔

اُردو بازار کی بڑی بڑی دکانوں میں کتابوں کی ایک بڑی دکان ''کتب خانہ علم و ادب'' کہلاتی تھی۔ ۴۷ء میں دِلّی کے اُجڑنے تک مغرب اور مغرب کے بعد اس کتب خانے پر شہر کے اکثر شاعر اور ادیب جمع ہوتے تھے۔ کتب خانے کے مالک سید وصی اشرف صاحب ادیب دوست اور متواضع آدمی تھے۔ شام کو اپنا کاروبار چھوڑ کر اہل علم و ادب کی خاطر تواضع میں لگ جاتے تھے۔ شاہ جہانی دیگ کی کھرچن بھی شام کو یہیں مل سکتی تھی۔

وہ دیکھئے اُستاد بیخود دہلوی اپنی ہزارہ تسبیح دونوں ہاتھوں میں گھماتے خراماں خراماں چلے آتے ہیں۔ ٹمیا محل سے یادگار تک ٹہلنے جاتے ہیں۔ واپسی میں کتب خانے پر ٹھیکی ضرور لیتے ہیں۔ انہیں روزانہ ایک ناول پڑھنے کے لئے چاہئے ہوتا ہے۔ کتب خانے سے ان کی یہ ضرورت پوری ہوتی رہتی ہے۔ ٹکسالی زبان اور ٹنٹالی محاورے بولتے ہیں، خاص دلی والوں کے لہجے میں۔ ان کی گالیوں میں بھی ایک چٹخارہ ہوتا ہے۔

نواب سراج الدین احمد خاں سائل دہلوی بھی روزانہ جامع مسجد اور اُردو بازار کا پھیرا کرتے ہیں۔ عجب شاندار بزرگ ہیں۔ چوگوشیہ، انگرکھا، آڑا پاجامہ اور پاؤں میں

انگوری بیل کی سلیم شاہی۔ سائل صاحب کو دیکھ کر منہ سے بے اختیار سبحان اللہ نکل جاتا ہے۔ آخر عمر میں کولہے کی ہڈی ٹوٹ گئی ہے۔ چلنے پھرنے سے اینڈ ہو گئے ہیں مگر شام کو اُردو بازار میں اپنی رکشا میں بیٹھ کر ضرور آتے ہیں۔ بیخود صاحب اسّی سے اوپر ہو گئے ہیں اور سائل بھی اسّی ہی کے پیٹے میں ہیں۔ یہ دونوں بزرگ اُستاد داغ کی یادگار ہیں۔ دلی کی شاعری کا وقار ان ہی دونوں کے دم قدم سے قائم ہے۔

ایک اور اسّی سال کے بزرگ میر ناصر علی ''صلائے عام'' والے ہیں۔ فراش خانے سے روزانہ چوک تک پیدل آتے ہیں اور پرانی چیزیں دیکھ بھال کر چلے جاتے ہیں۔ پیدل چلنا ان کی وضعداری میں داخل ہے۔ پیچھے پیچھے ایک ملازم حاضر رہتا ہے۔ کچھ خریدتے ہیں تو اس کے حوالے کرتے ہیں۔

ان بزرگوں سے کم عمر والوں میں علامہ راشد الخیری ہیں، قاری سرفراز حسین ہیں، واحدی صاحب ہیں اور عارف ہسوی ہیں۔ ان کا جی چاہتا ہے تو کبھی چوک پر بھی آجاتے ہیں ورنہ ان کی نشست شام کو یادگار میں رہتی ہے۔ خواجہ حسن نظامی بستی نظام الدین میں رہتے ہیں مگر روزانہ شہر ضرور آتے ہیں اور اُردو بازار میں سے ضرور گزرتے ہیں۔ ان کی لٹریچر کمپنی تو کبھی کی ختم ہو چکی مگر ایک چھوٹی سی دکان میر قربان علی بسمل کی ہے۔ میر صاحب خواجہ صاحب سے کچھ بڑے ہی ہیں، صرف خواجہ صاحب کی کتابیں بیچتے ہیں۔ کبھی ایک رسالہ دلی سے ''اُردوئے معلیٰ'' نکالتے تھے۔ خواجہ صاحب نے ان کی دوستی کو آخر تک نبھایا۔ خواجہ صاحب کا ایک بہت اچھا مکان اُردو بازار کے پرلے سرے پر ہے جس کا نام انہوں نے ''اُردو منزل'' رکھا ہے۔ اس مکان کے لئے انہوں نے اپنے ٹائیل الگ بنوائے ہیں جن پر ''ہر گھر اُردو'' اور ''گھر گھر اُردو'' لکھوایا ہے۔ دلی کی آخری بہار انہی بزرگوں کے دم سے تھی۔ ان کا مفصل حال بھی انشاء اللہ آپ کو کبھی سنائیں گے۔

لیجئے وہ مغرب کی اذان ہو رہی ہے۔ نمازی جامع مسجد میں داخل ہونے لگے۔ چوک کی رونق چھٹنے لگی۔ خونچے والوں نے دوشاخے روشن کر لئے۔ تہہ بازاری میں بجلی کے قمقمے روشن ہو گئے۔ سیلانی جیوڑے تو ابھی کہیں اور ہوا کھائیں گے۔ اڈے پر سے

تانگے کریں گے، دلی دروازے کی سڑک پر دوڑ لگائیں گے، فرّاٹے کی ہوا کھائیں گے۔ چٹور پن سے پیٹ تو بھرا ہوا ہے ہی، رات گئے گھر آئیں گے۔ جنہیں جلدی گھر پہونچنے کی عادت ہے انہوں نے گھر کا رخ کیا۔ ٹیامحل کے بازار کے نکڑ پر ہونچتے ہی خوشبو کا بھبکا آیا۔ سامنے پھول والوں کی دکانیں ہیں۔ بڑی بڑی چھبڑیوں اور چنگیروں میں لال لال گیلا قند بچھا ہوا ہے۔ اس پر چنبیلی کا ڈھیر پڑا مسکرا رہا ہے۔ ایک طرف گجراتی موتیا کی لپٹیں آرہی ہیں۔ چھبڑی میں مکھانے سے پھیلے ہوئے ہیں۔ جوہی کی بالیاں قرینے سے بھری رکھی ہیں۔ مولسری کی لڑیاں ہیں۔ منہ بند کلیوں کی چمپا کلیاں ہیں۔ پھولوں اور مقیش کے جھومر ہیں۔ کلیوں اور بادلے کی سراسریاں ہیں، کرن پھول ہیں، ٹیکے ہیں، مانگ پٹیاں ہیں، سیس جال ہیں، طرّے ہیں، بدّھیاں ہیں، کنگن ہیں، کلیوں کی چوہے دتیاں ہیں، پہونچیاں ہیں، آرسیاں ہیں، ہار ہیں، گجرے ہیں، چمپا کی گنڈیاں ہیں۔ ایک ٹوکرے میں گلاب اور گیندے کے پھول بھرے ہیں۔ بیلا، موگرا، اور زرد چنبیلی کی کچھ اور ہی بہار ہے۔ ہرے ہرے ڈھاک کے پتوں کے دونوں میں تول تول کر پھول ڈالے جارہے ہیں۔ پھولوں کی گہنے اُگواں بکتے ہیں۔ دلی والے تیل پھلیل اور پھولوں کے عاشق ہیں۔ منوں کے مول پھول تلتا اور بکتا ہے۔ منڈیوں اور دکانوں کے علاوہ پھیری والے چھبے بھرے محلے محلے اور گھر گھر پھول بیچتے پھرتے ہیں، اور سب پھول بک جاتے ہیں۔

پھول لے کر آگے بڑھے کہ حلوائیوں کی دکانیں شروع ہو گئیں۔ سجی سجائی دکانوں میں بیسوں طرح کی مٹھائیاں تھالوں میں چنی ہوئی ہیں۔ حلوائی کے ہاں سے دو ایک ٹوکریاں بندھوائیں اور لدے پھندے گھر پہونچے۔ بچے دوڑ کر لپٹ گئے۔ بیوی کی باچھیں کھل گئیں۔ سچ ہے ''ہنستے ہی گھر بستے ہیں۔''

OO

چٹور پن

دِلّی والے بڑے چٹورے مشہور تھے۔ انہیں زبان کے چٹخاروں نے مار رکھا تھا۔ کچھ مردوں ہی پر موقوف نہیں، عورتیں بھی دن بھر چرتی رہتی تھیں، اور کچھ نہیں تو پان کی جگالی ہی ہوتی رہتی تھی۔ بنگلہ پان تو غریب غربا بھی نہیں کھاتے تھے۔ جب دیسی پان افراط سے ملتا ہوتو موٹے پتے کون چبائے؟ دو ڈھائی آنے میں ڈھولی ملتی تھی۔ یہ بڑے بڑے پان، اور ایسے کرارے کہ پان اگر ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر گرے تو اس کے چار ٹکڑے ہو جائیں۔ ۴۶ء تک چھالیا پرانی رول کی روپے کی چار سیر آتی تھی۔ کتھا کلکتہ کا دو روپے سیر۔ چونے کی گلھیاں پان والوں کے پاس رکھی رہتی تھیں۔ چونے کے دام نہیں لئے جاتے تھے۔ پان خریدیئے اور چونا مفت لیجئے۔ پان والے گلی گلی پھر کے بھی پان بیچا کرتے تھے۔ ایک پیسے کے چھ، ایک پیسے کے آٹھ۔ پٹاری ہر گھر میں ہوتی تھی۔ فوری خاطر پان ہی سے کی جاتی تھی۔ پان کی تھالی میں عموماً کوئی شعر کندہ ہوتا تھا۔ مثلاً......

دست نازک بڑھایئے صاحب
پان حاضر ہے، کھایئے صاحب

یا......

برگ سبز است تحفۂ درویش
چہ کند؟ بے نوا ہمیں دارو

اتنے اچانک آ جانے والا پان ختم کرے بازار سے مٹھائی، کچھ سلونا اور موسم کا میوہ آ جاتا۔ پھر مہمان کی خوب خاطر تواضع کی جاتی۔ دلی والے متواضع بھی بہت تھے۔ قرض کریں دام کریں مہمان پر اپنا بھرم کھلنے نہیں دیتے تھے۔ دلی کے غریب کماتے بھی خوب تھے مگر اپنی عادتوں کے پیچھے محلے کے بنیئے کے قرضدار اکثر رہتے تھے۔ گروی گانٹھا بھی یہی بنیا کرتا تھا۔ اصل چیز اس کے پاس رکھنے کے بعد پھر ہاتھ نہیں آتی تھی۔ سود در سود میں برابر ہو جاتی تھی۔ یہ گھونس اکثر امیروں کے گھروں میں بھی لگی ہوئی تھی۔ مسلمانوں کی بڑی بڑی حویلیاں بنیوں نے چپ چپاتے ہڑپ کر لی تھیں، مگر خوش باشوں اور بےفکروں کو اس کی بھی پرواہ نہیں تھی۔ ہم نے اکثر لاکھ کے گھر خاک ہوتے دیکھے۔ لال کنوئیں پر ایک مسلمان رئیس کا بےمثل کتب خانہ برسوں کوڑیوں کے مول بکتا رہا۔

جزرس اور کنجوس آدمی کو دلی والے منحوس سمجھتے تھے اور اس کی شکل تک دیکھنے کے روادار نہ تھے۔ جو کبھی صبح ہی صبح کسی ایسے کی شکل اتفاقاً دکھائی دے جاتی تو کہتے "خدا خیر کرے، دیکھئے آج کیا افتاد پڑتی ہے۔" اکثر ہوتا بھی یہی تھا کہ ان کے وہم کی وجہ سے کوئی نہ کوئی پریشانی پیش آ جاتی۔

کہتے ہیں کہ بادشاہ کے زمانے میں ایک ایسا ہی منحوس شہر میں تھا جس کے بارے میں مشہور تھا کہ اگر اس کی صورت دیکھ لی جائے تو دن بھر روٹی نہیں ملتی۔ شدہ شدہ بادشاہ تک اس کی شکایتیں پہونچیں تو بادشاہ نے کہا۔ "نہیں جی، کہیں ایسا بھی ہو سکتا ہے؟" شکایت کرنے والوں نے کہا۔ "حضور ہوتا ہے۔ ہاتھ کنگن کو آرسی کیا، تجربہ کر دیکھئے۔" چنانچہ ایک دن صبح کو بادشاہ برآمد ہوئے تو لگانے والوں نے اس شخص کو بادشاہ کی نظر سے گزار دیا۔ اللہ کی شان اس دن دو مقدمے آ کر ایسے اڑے کہ دن کا تیسرا پہر ہو گیا اور خاصا تناول فرمانے کا وقت نکل گیا۔ بادشاہ سلامت کو جب جتایا گیا تو انہوں نے فرمایا۔ "اماں ہاں، یہ شخص تو واقعی میں منحوس ہے۔ پیش کرو اسے ہمارے حضور میں۔" حکم کی دیر تھی اس غریب کو عصا برداروں نے پکڑا اور کشاں کشاں لے آئے۔ بادشاہ نے فرمایا۔ "اماں تم بڑے منحوس ہو۔ جو تمہیں دیکھ لیتا ہے اسے روٹی نہیں

ملتی۔لہذا تمہیں موت کی سزا دی جاتی ہے۔''

آدمی تھا حاضر جواب۔ بولا ''حضور والا، میں تو اتنا منحوس ہوں کہ مجھے جو دیکھ لیتا ہے اسے روٹی نہیں ملتی۔مگر میں نے آج حضور کے دیدار کئے تو اپنی جان ہی سے چلا۔''

بادشاہ ہنس پڑے، اوراس کی جان بخشی فرمائی۔

دِلّی والوں کی ایک کہاوت تھی کہ ''ایک ڈاڑھ چلے، ستر بلا ٹلے۔'' کھانے کا تھک جانا ہی روگ کی جڑ ہے۔ دلی والے گھر میں بھی اچھا کھاتے تھے اور باہر بھی۔ غریبوں میں تو سبھی گھر والیاں خود کھانا پکاتی تھیں۔ اوسط درجے کے گھروں میں بھی سالن کی ایک دو ہنڈیاں گھر والی بی بی خود پکاتی تھیں۔ البتہ روٹی ڈالنے کے لئے ماما رکھی جاتی تھی۔ بغیر گوشت کے غریبوں کے حلق سے بھی روٹی نہیں اترتی تھی، اور گوشت ہی کونسا مہنگا تھا؟ چھوٹا گوشت چار آنے سیر اور بڑا چھ پیسے سیر۔ جمعہ کو گوشت نہ ہونے کے باعث دال پکتی تو اس پر بھی دو دو انگل گھی کھڑا ہوتا۔ خالص گھی روپے سیر تھا۔ اُڑد کی دال اور کھچڑی پر گھی کا ڈلا رکھ دیا جاتا۔ سادی ترکاری کو ہندوؤں کا کھانا بتایا جاتا۔

اس زمانے میں دلی میں ہوٹلوں اور چائے خانوں کا رواج بالکل نہیں تھا۔ بھٹیار خانے البتہ ہوتے تھے جن میں پائے اور اوجھڑی پکائی جاتی تھی۔ دو پیسے میں پیالہ بھر کے ڈھب ڈھب شوربہ مل جاتا تھا۔ دو پیسے کی دو خمیری روٹیاں لے کر اس میں چوری جاتیں اور غریب مزدور چار پیسے میں اپنا پیٹ بھر کر کام پر سدھار جاتا۔ مگر دلی کے دستکار یا محنت کش ان چیزوں کو پسند نہیں کرتے تھے۔ جاٹوں اور رانگڑوں کا یہ من بھاتا کھاجا تھا۔ دلی کے غریب بھی کچھ کم نک چڑھے نہیں تھے۔ پوریوں، کچوریوں، مٹریوں اور حلوے مانڈوں کا ناشتہ کرتے تھے۔ کہتے تھے کہ ''میاں جب ہمارے ہی دھڑ میں کچھ نہیں پڑے گا تو پھر کمائے گا کون؟''

شام ہوتے ہی چوک کی بہار شروع ہو جاتی۔ جامع مسجد کے مشرقی رُخ جو سیڑھیاں ہیں ان پر اور ان کے پہلوؤں میں ہر قسم کا سودا بکتا تھا۔ یہیں شام کو چٹور پن بھی ہوتا تھا۔ سستے سمے تھے، ایک پیسے میں چار سودے آتے تھے۔ دستکار شام کو

دھیا نگیاں لے کر آتے، دھیلی پاؤلا گھر میں دیتے، باقی اپنی انٹی میں لگاتے۔ کارخانے یا کام پر سے گھر آنے کے بعد میلے کپڑے اتارتے اور نہا دھو کر اجلا جوڑا پہنتے اور چھیلا بن کر گھر سے نکلتے۔

میاں شبو کی سج دھج تو ذرا دیکھئے! سر پر چنی ہوئی دو پلی، بالوں میں چنبیلی کا تیل پڑا ہوا، کان میں خس کا پھویا، بیچ کی مانگ نکلی ہوئی، چکن کا کرتہ، اس کے نیچے گلابی بنیان۔ سیدھے بازو پر سرخ تعویذ بندھا ہوا کرتے میں سے جھلک رہا ہے۔ چست پاجامہ، لاہور کا ملا گیری ازار بند، ڈھکا چھپا ہونے پر بھی اپنی بہار دکھا رہا ہے، پاؤں میں انگوری بیل کی سلیم شاہی، ٹھمک چال، اپنے ڈنڈ قبضوں کو دیکھتے چلے آرہے ہیں۔ انہیں دیکھ کر بھلا کون کہہ سکتا ہے کہ دن بھر لنگوٹ کسے ہتھوڑا چلاتے ہیں تو شام کو دو روپے پاتے ہیں۔ مگر نیتیں اچھی تھیں اس لئے پیسے میں بھی برکت تھی۔ شب برات پر پیدا ہوئے تھے، یوں نام شب براتی رکھا گیا تھا جو مخفف ہو کر شبو رہ گیا۔

ہاں تو میاں شبو سلام جھکاتے اور سلام لیتے ''میاں والیکم سلام۔ میاں جیتے رہئے، میاں سلامت رہئے۔'' کہتے سوئی والوں سے چتلی قبر اور ٹمیا محل کے بازار میں سے نکلتے ہوئے چوک پر پہونچ گئے۔ یہاں ان کے دو چار یار مل گئے۔ انہیں دیکھ کر ان کے چہرے پر شفق سی پھول گئی بولے۔ ''ابے خوب ملے۔ میں تو دل میں کہئے ہی رہا تھا کہ اپنا کوئی یار مل جائے تو مزہ آجائے۔

یاروں کی ٹولی ہنستی بولتی آگے بڑھی تو سامنے میاں سجانہ قیمے کی گولیاں بنا بنا کر کڑھاؤ میں اوپر کے رخ سے ڈالتے جاتے ہیں۔ جب آٹھ دس اکٹھی ہو جاتی ہیں تو ایک ڈنڈی سے انہیں اونٹتے ہوئے تیل میں کھسکا دیتے ہیں۔ یاروں نے میاں سجانہ سے صاحب سلامت کی۔ میاں شبو نے کہا۔ ''اُستاد، کیا موتے ہو رہئے ہیں؟''

سجانہ بولے۔ ''میاں آؤ جی کرخندار۔ آج تو کئی دنا پیچھو تم نے صورت دکھائی۔ خیر تو ہے۔''

شبو بولے۔ ''کرخندار نے ناواں نہیں دیا تھا، ورنہ اب تو ڑی تو تمہارے ہاں

کے کئی پھیرے ہو جاتے۔ اچھا لاؤ، چار دونے تو بنا دو۔''

''گولیاں ہی لو گے یا کچھ اور بھی رکھ دوں؟''

''اماں تم دینے پر آؤ گے تو بھلا کیا رہنے دو گے۔''

اس ضلع جگت کے بعد میاں سبحانہ نے ڈھاک کے ہرے پتوں کے دونے بنا بنا کر دینے شروع کئے۔ قیمے کی گولیاں، مچھلی کے کباب، لونگ چڑے، تئی کے کباب، پانی کی پھلکیاں۔ ان پر چٹنی کا چھینٹا مارا اور بولے۔ ''آج بڑا توفہ مال ہے، مزا آجائے گا۔'' اور واقعی میں مزا آ گیا۔ آنکھ اور ناک دونوں سے پانی ساون بھادوں کی طرح بہنے لگا۔

شبوسی سی کرتے ہوئے بولے۔ ''اماں اُستاد، آج تو تم نے آگ لگا دی۔ دیکھتے ہو کیا حال ہو رہا ہے؟''

سبحانہ نے کہا۔ ''کرخندار، یہ نزلے کا پانی ہے نزلے کا۔ اس کا نکل جانا ہی اچھا۔ میاں سو بیماریوں کی جڑ ہے نزلہ۔''

اتنے میں سقہ کٹورا بجاتا ہوا آ گیا۔ ''میاں آب حیات پلاؤں؟ صابر صاحب کے کنوئیں کا ہے۔''

سب نے کہا۔ ''بھئی اچھے وخت آ گئے۔ لاؤ۔''

برف جیسا ٹھنڈا پانی پیتل کے موٹے موٹے کٹوروں میں ڈال کر سب کو دیا۔ سب نے ڈگڈگا کر پیا تو منہ کی آگ کچھ بجھی۔ پیسے دو پیسے سقے کو دے کر آگے بڑھے تو کھیر والا دکھائی دے گیا۔

ان بڑے میاں کی کھیر بھی سارے شہر میں مشہور ہے۔ بھئی واہ! ان کی تو ہر چیز سفید ہے! بڑے میاں کے بال، بھنوئیں، پلکیں، داڑھی، کھیر، لگن پوش، سب سفید براق۔ ایک ایک دو دو پیالے سب نے کھائے۔ جو سوندھ پن اور داغ کا مزا ان کی کھیر میں آتا ہے کسی اور کے ہاں نہیں آتا۔

آگے بڑھے تو پہلوان کو دیکھا کہ سنگھاڑے کے کونے پر ایک مونڈھے پر خود بیٹھے ہوئے ہیں اور ایک چھوٹے الٹے مونڈھے پر ایک بڑا سا ہنڈا دھرا ہوا ہے۔

ہنڈے پر لال کھاروا پانی میں تر بتر پڑا ہوا ہے، اور پہلوان آواز لگا رہے ہیں۔ ''آنے والا دو دو پیسے۔''

یاروں کی ٹولی ان کے پاس پہونچی۔ ''کیوں پلوان، کیا سارے گاہکوں کا مول دو دو پیسے لگا دیا ہے؟''

پہلوان بولے۔ ''میاں میرے، میں تو اپنی قلفیوں کی آواز لگا رہا ہوں، تمہارے تیئں کچھ نہیں کے ریا۔''

شبو نے کہا۔ ''اماں ہم سمجھے تم نے ہماری سبھی کی اوقات ٹکے کی سمجھ لی۔''

پہلوان بولے۔ ''جی بھلا میں ایسی غستا کی آپ کی شان میں کر سکتا ہوں؟ آؤ بیٹھو۔ مونڈھا لو۔ آج میں تمہیں پستے کی کھلاؤں گا۔''

یہ کہہ کر پہلوان نے ہنڈے میں ہاتھ ڈالا اور ٹٹول کر ایک بڑی سی مٹی کی قلفی نکالی، چکو سے اس کے منہ پر سے آٹا ہٹایا اور ڈھکنا الگ کر کے برف میں ایک چمچہ کھڑا کر دیا اور بولے۔ ''لو تم یہ اخورا لو۔'' چاروں کو انہوں نے اخورے کھول کھول کر تھما دئے۔ بولے ''نرے پستے ہیں دودھ میں گھٹے ہوئے۔''

بہت عمدہ برف تھی، سچ مچ ہونٹ چاٹتے رہ گئے سب کے سب۔ چلتیوں کو جب دام پوچھے تو ایک روپیہ! شبو بولے۔ ''آ کا یہ کیا؟ تم تو دو دو پیسے کی آواز لگا رہئے تھے؟''

پہلوان نے کہا۔ ''میاں میرے، دو پیسے والی بھی ہے میرے کنے، شربت کی۔ بھلا وہ تمہارے لاحق ہے؟ رئیسوں کے کھانے کی یہی پستے کی ہوتی ہے۔ سارے شہر میں ہو آؤ، جو ایسی کہیں مل جائے تو اپنے پیسے واپس لے جانا۔'' شبو اور ان کے یار بھلا اپنے آپ کو غریب کیسے تصور کر لیتے؟ بولے۔ ''پلوان سچ کہتے ہو۔ تم جیسا مجاز دان اور ہم جیسا قدر دان بھی کم ملے گا۔ لو، تھامو یہ روپیہ۔''

چھنکتا ہوا روپیہ پہلوان کی گود میں آ پڑا۔

شبو نے آگے بڑھ کر کہا۔ ''بھئی اب منہ سلونا کرنا چئے۔''

ایک ساتھی نے کہا۔ ''چڑیا والے کے ہاں چلو۔''

دوسرا بولا۔ ''اماں کل ہی تو میں نے وِس کے ہاں کے تکے کھائے تھے۔ آج کہیں اور چلو۔''

تیسرے نے کہا۔ ''اچھا تو چچا کے ہاں چلو۔''

یہ وہی چچا ہیں جن کا ذکر خیر ہم پہلے بھی کر چکے ہیں۔ چلئے ان کرخنداروں کے ساتھ بھی چل کر دیکھیں ان پر کیا گزرتی ہے۔

چچا کبابی پائے والوں کے رخ جامع مسجد کی سیڑھیوں کے پہلو میں اکیلے بیٹھتے تھے۔ پرانے زمانے کے آدمی تھے، بڑے بد دماغ، منہ پھٹ۔ یار لوگوں کو انہیں چھیڑ کر گالیاں کھانے میں مزا آتا تھا۔ یاروں کی چوکڑی نے اُدہر کا رُخ کیا۔ شام کا جھٹ پٹا ہو چکا تھا۔ چچا کے ٹھیئے پر دوشاخہ جل رہا تھا۔ چچا سیخیں بھر بھر کر رکھتے جا رہے تھے اور ان کا لڑکا بندو پنکھا جھل رہا تھا۔ پانچ سات گاہک کھڑے تک رہے تھے اور چچا کو ٹروا س لگی ہوئی تھی۔ میاں شبو کو شرارت سوجھی، آگے بڑھ کے روپیہ چھنکا کر چچا کی طرف اچھالا۔ ''بڑے میاں ایک روپے کے کباب دے دو، زلدی سے۔''

چچا نے انہیں سر سے پاؤں تک دیکھا، روپیہ اٹھایا اور اسی طرح سڑک پر اچھال دیا۔ پھر بغیر ان کی طرف دیکھے بولے۔ ''میاں، بھائی، بنے، تمہیں زلدی ہے تو کہیں اور سے لے لو۔ میں تو لمبر سے دوں گا۔ پہلے ان میاں کی دونی آئی ہوئی ہے، انہیں نہ دوں تمہیں دے دوں؟ کل بھی تم سری کے ایک حرامی آئے تھے، میں نے وِن سے کیا۔ ''دیکھو میاں، ودہر میرا بھائی اے وز بیٹھتا ہے، ویں سے لے لو۔ سیخ بھی بھاری بھرتا ہے، فائدے میں رہوگے۔ بلکن کوئی اور چیز کھالو بنے۔ یہ آگ کا کام ہے، گرم چیز ہے، تمہیں نقصان کرے گی۔'' کوئی باہر والے تھے۔ وِن کی سمجھ میں آ گئی۔ روپیہ اُٹھا کر چل دئے۔''

شبو بولے۔ ''مگر چچا ہم تو مریم تو ٹلیم نہیں۔ تم ہی سے کھا کے جائیں گے۔''

''اے میرے میاں، میں کب کہتا ہوں کہ جاؤ؟ مگر ذرا چھری تلے دم تو لو، تم تو ہوا کے گھوڑے پر سوار ہو اور میں زلدی کا کام کرتا نہیں۔ ان گاہکوں کو پہلے بھگتا دوں۔

ابے لمڈے، قالین بچھا دے ان کے لئے۔ چین سے بیٹھو، ہمیشہ کے آنے والے ہو، پھر بھی ایسی نے دانی کی بات کرے ہو۔ چلو بیٹھو۔''

لمڈے نے چھپے ہوئے ٹاٹ کا ٹکڑا چچا کے ٹھئے کے پیچھے بچھا دیا۔ ٹاٹ میلا اور گندہ تھا، چاروں اس پر اکڑوں ہو بیٹھے۔ کچھ دیر بعد چچا نے پلٹ کر ان کی طرف دیکھا۔ بولے۔ ''میاں، بھائیو، ٹک کر بیٹھو اشرافوں کی تریوں یوں اٹھاؤ چولہا کب تک بیٹھوگے؟ آگ لینے آئے ہو؟ ہاں بولو کیا کیا دوں؟''

''چچا تم تو جانتے ہی ہو، چار آدمیوں کے لئے بنا دو اپنا نسخہ۔''

''بس تو چار سیخیں، چار بھیجے اور چار گھی کئے دیتا ہوں۔ چل بے لمڈے دو پیسے کی برف لے آ لپک کے، اور لا کر بالٹی میں پانی بنا دے۔ ابے آ گیا؟ سالے ابھی یہیں انیڈ ریا ہے۔ ابے تیتری ہو جا۔'' اور بندو سر پر پاؤں رکھ کر بھاگا۔

چچا کے باپ دادا سب اسی جگہ بیٹھتے تھے۔ ان کے کباب بادشاہ کے دستر خوان پر جایا کرتے تھے۔ انہی کا نسخہ سینہ بہ سینہ چچا کو پہونچا تھا۔ قیمے میں کچھ اس حساب سے مسالے ملاتے تھے کہ جو بات ان کے کبابوں میں ہوتی تھی دلی کے کسی اور کبابی کے ہاں نہیں ہوتی تھی۔ چچا نے نسخے میں یہ اور اضافہ کیا کہ جو بیٹھ کر یہیں کھانا چاہیں ان کے لئے بھیجے اور گھی کا انتظام بھی کر لیا۔ بھیجا بکری کا ہوتا تھا۔ سیخیں جب سنک جاتیں تو انہیں غوری میں اتار کر ان کے ڈورے نکال دیتے۔ پھر ایک بادیئے میں چار کٹوریاں گھی کی ڈالتے۔ جب پیاز سرخ ہو جاتی تو چاروں سیخیں اور چاروں بھیجے اس میں ڈال کر گھونٹ دیتے۔ چنگیر میں خمیری روٹیاں رکھ کر کبابوں کی غوری انہوں نے میاں شبو کو تھما دی۔ پھر ایک چھوٹی سی غوری میں پیاز کا لچھا، ہری مرچیں، پودینہ، کیری کا لچھا، ادرک کی ہوائیاں رکھ دیں۔ ایک طرف نیبو اور گرم مسالہ رکھ دیا اور بولے۔ ''میاں یاد کروگے چچا کو۔ ہم تو چلنہاروں میں ہیں۔ ایک دن سن لوگے کہ چچا لد گئے۔ پھر تمہارے تئیں معلوم ہوگی قدر چچا کی۔''

شبو بولے۔ ''چچا، ایسی دل پھٹنے کی باتیں مت کرا کرو۔''

چچا نے کہا۔ ''نہیں میاں، میں سچ کہتا ہوں۔ بہت گئی تھوڑی رہی۔ اب تو میرے میاں چپلی کواب کا زمانہ ہے۔ کدی نام بھی سنا تھا اس کا؟ دلی والے اب گولے کے کباب نہیں جوتیاں کھائیں گے جوتیاں۔''

اس کے بعد چچا کا ناریل چٹخا اور مغلظات کا ایک دریا ان کے منہ سے رواں ہو گیا۔ میاں شبو اور ان کے ساتھیوں نے آپس میں اشارے کئے اور چپکے سے وہاں سے کھسک آئے۔

○○

دِلّی کے حوصلہ مند غریب

میاں شبو اور ان کے دوست جب چچا کے ٹھیئے سے چلے تو شبو بولے۔ ''میاں یہ بڈھا بڑا وضع دار ہے۔ تم اس کے میلے کپڑوں اور مفلسی کو نہ دیکھو۔ اس نے اپنی ضد کے پیچھے لاکھ کا گھر خاک کر رکھا ہے۔ بھلا یہ بھی کوئی جگہ ٹھیا لگانے کی ہے؟ ادھر تو رستہ ہی نہیں چلتا۔ آس پاس کوئی دکان نہیں ہے مگر بڈھا ہے کہ جما ہوا ہے۔ لگے بندھے گاہک ہیں۔ مشکل سے تین چار روپے روز کی دھیانگی ہوتی ہوگی، اسی میں خوش ہے۔ مگر وہ کیا کہ دکان اچھی سجا رکھی ہے۔ بیس پچیس روپے روزانہ اٹھاتا ہے۔ یہ سامنے دیکھتے ہو کس کی دکان ہے۔ یہ ہاتھی دانت محل کہلاتا ہے۔ اس کا مالک دلی کا بہت بڑا ہندو رئیس ہے۔ چچا کو وِس نے ہزاروں روپے اس بات کے دینے کئے کہ یہاں سے اٹھ جائیں، مگر چچا نے کہا۔ ''میں اپنے بزرگوں کی ہڈیاں نہیں بیچتا۔ ہزار کیا لاکھ روپیہ بھی اگر دو تب بھی میں اپنے باپ دادا کا ٹھیا نہیں چھوڑوں گا۔'' میاں ہم تو چچا کی انہی اداؤں پر مرتے ہیں۔ چچا نے سچ کہا، ان کے بعد دلی والے چپلیں ہی کھایا کریں گے۔''

یہی باتیں کرتے چاروں یار ہرے بھرے صاحب کے سامنے پہونچ گئے۔ یہاں دو قبریں ہیں۔ ایک قبر ہرے بھرے صاحب کی ہے اور ایک سرمد صاحب کی۔ ایک پر سبز چادر اور دوسری پر سرخ چادر پڑی رہتی ہے۔ یہاں فاتحہ پڑھنے کے بعد میاں شبو نے کہا۔ یہ لال قبر والے بزرگ بڑے جلالی تھے۔ انہیں اپنے تن بدن کا ہوش نہیں رہا تھا اور دین دُنیا سے غافل ہوگئے تھے۔ بادشاہ نے ان کا سر اُترواد یا تو یہ اپنا سر ہتھیلی پر

رکھ کر مسجد کی سامنے والی سیڑھیوں پر چڑھنے لگے۔ جو یہ پوری سیڑھیاں چڑھ جائیں تو قیامت ہی آ جائے۔ وہ تو کہو کہ ہرے بھرے صاحب نے روک لیا یہ کہہ کہ فقیر کو اتنا غصہ نہیں کرنا چاہیے۔ بس وہیں گر گئے۔"

ایک ساتھی نے کہا۔ "اماں اُستاد، تم بھی ایسی بات کہتے ہو جو دھری جائے نہ اٹھائی جائے۔ بھلا کہیں ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی کا سر تن سے جدا ہو جائے اور وہ اپنا سر لے کر چلنے لگے؟"

میاں شبو یہ سن کر سٹپٹائے۔ بولے۔ "ابے میں کوئی وہاں کھڑا دیکھ رہا تھا۔ جو بزرگوں سے سنا تمہیں بتا دیا۔ تم لگے ہجے کے بجے کرنے، اماں نہیں مانتے تو جہنم میں جاؤ۔ لو چلو، آگے بڑھو۔"

ٹیا محل کے بازار کے نکڑ پر بائیں ہاتھ کو پان والے کی دکان تھی۔ اس میں بڑے بڑے آئینے لگے ہوئے تھے اور دکان بجلی کے قمقموں سے بقعہ نور بنی ہوئی تھی۔ سامنے برف کی ایک سلی رکھی ہوئی تھی جس پر لگے ہوئے پان دھرے تھے۔ یہ پان والا بھی عجب آن کا تھا۔ صرف دیسی پان اس کے ہاں ہوتے تھے۔ پرانا دیسی۔ چونے میں کیوڑا اور کتھے میں گلاب ملا ہوتا تھا۔ یہ صاحب ایک پان کبھی نہیں بناتے تھے، دو اُوپر تلے رکھ کر بناتے تھے۔ لونگ، اِلا یچی، جوتری، جائفل، بنارس کا مسالہ اور خدا جانے کیا کیا پان میں ڈال کر بیڑا بناتے تھے۔ اس پر چاندی کا ورق لپیٹتے اور خود اپنے ہاتھ سے گاہک کے منہ میں دیتے۔ گاہک کی چٹکی کیوں خراب ہو؟ ان کی یہ ادا سب کو بھاتی تھی۔ چاروں یاروں نے اس دکان سے پان کھایا۔ اتنے میں کگڑ والا اپنا بڑا سا حقہ لئے آ گیا۔ خمیرے کی خوشبو سے بازار مہک گیا۔ ان سے نہ رہا گیا۔ دو دو چار چار کش لئے۔ پیسے دئے اور آگے بڑھ گئے۔

سامنے پھول والے اپنی دکانیں سجائے بیٹھے تھے۔ ان کی سریلی آوازیں گونج رہی تھیں۔ "لپٹیں آ رہی ہیں موتیا میں۔ گجرات کے مکھانے۔" میاں شبو نے کہا۔ "یار میں گھر والی کے لئے جوہی کی بالیاں لے لوں، ورنہ جاتے ہی ٹانگ لے گی کہ

اتنی اویر کیوں آئے؟" یہ کہہ کر پھول والے کی دکان کا رخ کیا۔ لال لال گیلے قند پر موتیا کا ڈھیر پڑا ہنس رہا ہے۔ دوسری طرف چنبیلی کی ڈھیری مسکرا رہی ہے۔ پھولوں کے گہنے بنے رکھے ہیں۔ میاں شبو نے جوہی کی بالیاں لیں۔ پھول والے نے ہرے ڈھاک کے پتوں کا دونا بنایا۔ اس میں بالیوں کا جوڑا رکھا۔ دو چار پھول موتیا کے اور ایک آدھ زرد چنبیلی کا بھی ڈال دیا۔ چار پیسے ہی میں کام ہو گیا۔ چتلی قبر کے چوراہے پر پہونچے تو کلن حلوائی کی دکان پر مٹھائیوں کے تھال سجے ہوئے نظر آئے۔ بجلی کی تیز روشنی میں ورق لگی مٹھائیاں دمک رہی تھیں۔ میاں شبو نظر بچا کر نکلے جا رہے تھے کہ کلن کی نظر اُن پر پڑ گئی۔

"اماں خلیفہ، بات تو سنو، ارے بھئی ایسی بھی کیا بے مروتی کہ منہ پھیر کے نکلے جا رہئے ہو؟"

میاں شبو چونک کر دکان کی طرف بڑھے۔ سلام کیا۔

"سلام ولیکم"

کلن بولے۔ "والیکم سلام۔ لو ذرا یہ قلاقند تو چکھو۔"

قلاقند کا ایک ٹکڑا چھری سے کاٹ کر دیا۔ شبو نے منہ میں ڈالا تو بتاشے کی طرح گھل گیا اور کیوڑے کی خوشبو سے منہ مہک گیا۔

بولے۔ "بھئی واہ، کیا کہنے کلن اُستاد کے۔ لاؤ آدھ سیر باندھ دو۔"

کلن نے پیچھے سے ٹوکری اٹھائی، اس میں کاغذ بچھایا۔ آدھ سیر قلاقند تول کر کچے سوت سے ٹوکری کو باندھ بوندھ شبو کے حوالے کیا۔ چھ آنے سیر مٹھائی بکتی تھی۔ تین آنے کلن کو دے ایک ہاتھ میں پھولوں کا دونا اور ایک ہاتھ میں قلاقند کی ٹوکری لے کر چل پڑے۔ سوئی والوں کے نکڑ پر پہونچ کر یاروں سے رخصت ہوئے۔ گھر پہونچے تو دروازہ بند پایا۔ رات خاصی آ گئی تھی۔ دونا ٹوکری پر رکھ کر کنڈی بجائی تو اندر سے بڑبڑانے کی آواز آئی اور کھٹ سے اندر کی کنڈی گری۔ دروازہ کھولا تو دیکھا کہ گھر والی بپھری ہوئی کھڑی ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ سلواتیں سنائے اور دانتا کل کل ہو میاں شبو

نے کہا۔''اری یہ تو لے۔ کھڑی کیا گھور رہی ہے؟'' بیوی کا غصہ ہوا ہو گیا اور باچھیں کھل گئیں۔ جھٹ دونا اور ٹوکری سنبھالی۔ اتنے میاں شبو کپڑے اتاریں اور تہمد باندھیں بیوی نے دونا کھول بالیاں کانوں میں ڈال لیں، اور تلے دانی میں سے سوئی تاگہ نکال پھولوں کی ایک لڑی بنا گلے میں ڈال لی۔ پھر چھینکے پر سے روٹیوں کی ڈلیا اتاری اور دسترخوان بچھانے لگی۔ میاں شبو نے آواز دے کر کہا۔''اری رہنے دے۔''

بیوی نے تنک کر کہا۔''باہر کھائی آئے۔ میں بھی تو کہوں اتنی دیر کہاں لگائی۔ راہ تکتے تکتے آندھ آگئی۔ چٹور پن کی عادت نہیں جاتی تمہاری، باہر کی چکوتھیاں منہ کو لگ گئی ہیں۔''

''اری کدی برسوں کی برسات میں ایسا بھی ہو جاتا ہے۔ لے ورے آ۔ یہ ناواں سنبھال۔'' دھیانگی کے بچے ہوئے پیسے بیوی نے لے کر ازار بند میں باندھے۔

''اری وہ ٹوکری تو کھول۔ دیکھ وِس میں کیا لایا ہوں تیرے لئے۔''

''اب ان میاں بیوی کو میٹھی میٹھی باتیں کرنے دیجئے۔ آیئے ہم آپ چلیں یہاں سے۔ رات سر پر چڑھتی آرہی ہے۔

صبح سویرے ہی کاریگروں اور دستکاروں کو اپنے اپنے کام پر پہونچنا ہوتا ہے۔ گھر میں ناشتہ یا کھانا تیار کرنا گھر والیوں کے لئے مشکل ہوتا ہے، اس لئے ناشتہ بازار ہی سے آتا تھا۔ جو ذرا آسودہ حال تھے حلوے مانڈے اور پوری کچوریوں کا ناشتہ کرتے تھے۔ بچوں کے لئے مٹریاں منگائی جاتی تھیں، ان کے ساتھ رُوکن میں حلوہ ملتا تھا۔ چائے کا رواج تو اب ہوا ہے۔ پہلے طرح طرح کے شربت پئے جاتے تھے۔ جاڑوں میں گرم دودھ پیا جاتا تھا، بعض گھروں میں کشمیری چائے اور قہوے کے فنجان چلتے تھے۔ مگر غریب غربا نہاری روٹی کھا کر کام پر سدہارتے تھے۔ نہاری سوائے دلی کے اور کسی شہر میں نہیں پکتی تھی۔ دوسرے شہروں میں پائے پکتے تھے اور انہی کو نہاری کہا جاتا تھا۔ دلی کی نہاری ایک قسم کا قورمہ ہی ہوتا تھا۔ اس میں بڑے گوشت کے صرف پارچے ہی ڈالے جاتے تھے، ہڈیاں گڈیاں نہیں ڈالی جاتی تھیں۔ ان مسالوں کے علاوہ جو قورمے

میں پڑتے ہیں شوربے کو گاڑھا کرنے کے لئے الن بھی ڈالا جاتا تھا۔نہاری کی دیگ چولہے میں جمی ہوتی تھی جب دیگ میں پیاز سرخ کرنے کے بعد تمام مال مسالہ پڑ جاتا تو دیگ کے منہ پر کونڈا رکھ کر آٹے سے جما دیا جاتا تھا۔ دیگ کے نیچے موٹے موٹے گندے لگا کر آگ جلا دی جاتی اور میاں بھٹیارے نچنت ہو، دُکان بند کر گھر چلے جاتے۔ صبح منہ اندھیرے دکان پر پہونچ کر دیگ کھولتے تو نہاری پکی پکائی ملتی۔ گاہکوں کا ہجوم موجود ہوتا۔ جھپا جھپ برتنوں میں نکال نکال کر دینی شروع کر دیتے۔ خمیری روٹیوں کے لئے برابر میں تندور لگا ہوتا، گرم گرم روٹیاں تندور میں سے نکلتی رہتیں۔ کام پیشہ لوگ دو پیسے کی نہاری لیتے اور دو پیسے کی دو روٹیاں۔ روٹی کا آدھا پونا ٹکڑا بچ ہی رہتا اور چار پیسے میں ان کا پیٹ بھر جاتا۔ بس اب دن کو انہیں کھانے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی، شام کو گھر آ کر ہی روٹی کھائیں گے۔ یہ تھی نہاری، دلی کے غریبوں کا من بھاتا کھاجا۔ مگر نہاری کے مخصوص ذائقے کی وجہ سے جو گھر کے پکانے میں پیدا ہی نہیں ہوتا امیروں اور رئیسوں نے بھی نہاری کھانی شروع کر دی تھی۔ پیسے کے نخرے اور چونچلے نہاری میں بھی در آئے۔ رات ہی کو برتن اور پیسے دکان پر بھجوا دیئے اور صبح کسی کو بھیج کر نہاری منگوالی۔ مگر جو زیادہ شوقین ہوتے صبح صبح دکان پر پہونچ لیتے اور بالا خانے میں جا براجتے۔ لڑکا آ کر پوچھ جاتا۔ تھوڑی دیر میں دہکتی ہوئی انگیٹھی آ جاتی۔ اس کے بعد بڑے سے بادیئے میں نہاری آتی جس میں بھیجے اور نلیاں پڑی ہوتیں۔ ایک پیالے میں داغ ہوتا، یعنی پیاز ڈال کر کڑ کڑایا ہوا خالص گھی۔ ایک رکابی میں ہری مرچیں، ہرا دھنیا، ادرک کی ہوائیاں، گرم مسالہ اور نمک کی پیالیاں ہوتیں اور ایک کٹا ہوا کھٹا۔ کم مرچیں کھانے والے نہاری کا روغن اتار کر الگ کر دیتے اور اس کے بدلے داغ کیا ہوا گھی ڈالتے۔ اس سے مرچیں کم ہو جاتیں، اور کھانے والے خوب جی لگا کر کھاتے۔ نہاری ذرا ٹھنڈی ہوئی اور غوری انگیٹھی پر رکھی گئی۔ نہاری کھانے کا مزا جاڑوں ہی میں آتا ہے۔ جب چلے کا جاڑا پڑ رہا ہو اور دانت سے دانت بج رہا ہو تو دانتوں پسینہ آ جاتا ہے۔ نہاری کھانے کے بعد گاجر کا حلوہ لازم وملزوم سا ہو گیا تھا۔ دِلّی کے مختلف محلوں میں

نہاری والے تھے جن کے ہاں کی نہاری مشہور تھی۔ کراچی کے بعض اچھے ہوٹلوں میں کچھ اور نزاکتیں بھی پیدا کر لی گئی ہیں۔ مثلاً چھوٹے گوشت کی نہاری پکاتے ہیں، بلکہ مرغ کی نہاری بھی پکاتے ہیں، اور جب آپ کے سامنے آتی ہے تو اس میں ابلے ہوئے انڈے بھی پڑے ہوتے ہیں۔ خدا جب حسن دیتا ہے نزاکت آ ہی جاتی ہے۔ دولت کے ساتھ نفاست آتی جاتی ہے مگر جو مزا سنڈے کے گوشت کی عام نہاری میں ہوتا ہے وہ کسی اور گوشت کی نہاری میں نہیں ہوتا۔ اگر آپ کو مرغ ہی کھانا ہے تو مرغ مسلم کھائیے۔ چرغا کھائیے۔ غریب نہاری کو اس کے حال پر چھوڑیئے۔ غریب اور امیر کا میل ہی کیا؟

دِلّی میں بعض ایسے منچلے نہاری والے بھی تھے جو گھر لیجانے کے لئے نہاری نہیں دیتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ یہ غریبوں کا کھاجا ہے، غریب ہی یہاں آ کر کھاتا ہے۔ اگر ہم امیروں کی پتیلیاں بھرنے لگیں تو غریب بچارے کیا کھائیں گے؟ جاؤ میاں جاؤ، کوئی اور دکان دیکھو۔ یہاں امیروں کے لئے نہاری نہیں پکتی۔ مگر اب ایسے وضعدار لوگ کہاں؟ سب کے سب پیسے کے میت ہو گئے۔ نہاری والے کے ہاں نہاری لینے جایئے تو معلوم ہوگا کہ بک گئی۔ ''اماں اتنے سویرے ہی بک گئی؟'' ''جی ہاں، ایک میاں جی آئے تھے، وہ پوری دیگ ڈیوڑھے دام دے کر خرید لے گئے۔''

دِلّی کے غریبوں میں بھی یہ بات تھی کہ وہ کسی نہ کسی ہنر میں یکتا ہونا چاہتے تھے، چنانچہ جو ہنر یا فن انہیں پسند آتا اسے اس فن کے اُستاد سے باقاعدہ سیکھتے تھے۔ اُستاد اپنے شاگردوں سے پیسہ کوڑی نہیں لیتے تھے، اس لئے بڑے بے نیاز ہوتے تھے۔ شاگرد خدمت کر کے اُستاد کے دل میں گھر کر لیتا تھا، اور کسی بات سے خوش ہو کر اُستاد شاگرد کو دو چار گُر بتا دیا کرتا تھا۔ دراصل خدمت لینے میں یہ گر پوشیدہ تھا کہ اُستاد شاگرد کی خو بو سے اچھی طرح واقف ہو جاتا تھا۔ اُستاد کو اندازہ ہو جاتا کہ شاگرد اس فن کا اہل بھی ہے یا نہیں۔ اطاعت و فرمانبرداری کرتا ہے یا نہیں، جو کچھ ہم کہیں گے اسے مانے گا یا نہیں؟ اگر ہم نے بتایا اور اس نے نہ کیا تو ہماری بات نیچی ہو گی اور شاگرد کا کچا پن ہماری بدنامی کا باعث ہوگا، لہٰذا خوب کس لیتے تھے۔ کوڑی پھیرا بازار کا کراتے، برتن

منجھواتے، گھر کی جھاڑو دلواتے، ہاتھ پاؤں دبواتے۔ جوان ناگواریوں کو گوارہ کر لیتا اسے اس کے ظرف کے مطابق اپنا فن یا ہنر سکھا دیتے۔ نااہل کو کبھی کوئی اُستاد کچھ نہ دیتا تھا۔ اناڑی کے ہاتھ میں تلوار دینا یا بندر کے ہاتھ میں اُسترا دینا ان کے نزدیک گناہ تھا۔

معمولی سی بات ہے پنجہ لڑانا، مگر دِلّی میں اس کے بھی اُستاد تھے۔ پنجہ لڑانا بھی ایک فن تھا اور اس کی بھی کچھ رکانیں تھیں جنہیں اُستاد سے سیکھا جاتا تھا۔ دِلّی کے میر پنجہ کش کا نام بہت مشہور ہے۔ عام خیال یہ ہے کہ پنجہ لڑانے والوں کا خط خراب ہو جاتا ہے، مگر میر پنجہ کش نہ صرف پنجہ کشی کے اُستاد تھے بلکہ اپنے زمانے کے اعلیٰ درجہ کے خوش نویس بھی تھے۔ ان کی لکھی ہوئی وصلیاں دیکھ کر آج بھی آنکھوں میں نور آتا ہے۔ اٹھارہ سال پہلے تک دلی میں بعض نامی پنجہ کش تھے جو اپنے شاگردوں کو زور کراتے اور پنجے کے داؤ پیچ بتاتے تھے۔ ہم نے دیکھا ہے کہ دُبلا پتلا سا نوجوان ہے جو ایک قوی ہیکل دیہاتی سے پنجہ پھنسائے بیٹھا ہے۔ دیہاتی کا چہرہ زور لگا لگا کر سرخ ہوا جا رہا ہے مگر نوجوان کا ہاتھ ٹس سے مس نہیں ہوتا۔ اس نے کچھ اس انداز سے انگلیاں چڑھا رکھی ہیں کہ دیہاتی کی ساری طاقت بیکار ثابت ہو رہی ہے۔ جب دیہاتی کامیاب نہیں ہوتا تو کہتا ہے۔ ''نہیں جی یوں نہیں، میری انگلی اتر گئی تھی۔'' پھر خوب اُنگلیاں جما کر کہتا ہے۔ ''ہاں اب لو۔'' مگر اب کے بھی اس کی پیش نہیں جاتی۔ کہتا ہے۔ ''میاں جی، اب تم موڑو۔'' نوجوان اس کا پنجہ ایسے پھیر دیتا ہے جیسے موم کا ہو۔ دیہاتی حیران ہو کر کہتا ہے۔ ''ٹھیرو میاں جی، مجھے اپنی انگلیاں تو جما لینے دو۔'' ''لے بھئی چوہدری، تو بھی کیا یاد کرے گا، خوب گانٹھ لے۔ اچھا اب ہوشیار ہو جا۔'' اور پھر چوہدری کا پنجہ نہیں رُکتا اور پھرتا چلا جاتا ہے۔ دراصل ہنر اور فن میں گاؤ زوری نہیں چلتی۔ جبھی تو رستم زماں گاما پہلوان اپنے سے دگنے پہلوانوں کو مار لیا کرتا تھا۔

لکڑی یا بنوٹ کا فن بھی ایک ایسا ہی فن ہے جس کا جاننے والا قوی سے قوی حریف کو نیچا دکھا سکتا ہے۔ یہ دراصل ''بن اوٹ'' ہے، یعنی اس کی کوئی روک نہیں ہے۔ اُستاد گھنٹوں اس کے پینتروں کی مشق کراتے ہیں۔ بنوٹیوں میں مچھلی کی سی تڑپ

ہونی چاہئے۔ اگر چستی پھرتی نہیں ہوگی، مار کھا جائے گا۔ لدھڑ آدمی کا کام نہیں ہے۔ یہ اتنا بڑا فن ہے کہ اس پر پوری پوری کتابیں لکھی گئی ہیں۔ مگر یہ فن سر تا پا عمل ہے، اس لئے کسی اُستاد سے سیکھے بغیر نہیں آتا۔ دلی کے ۴۷ء کے فسادات میں یہ تماشہ بھی دیکھا کہ جب ہندو لٹھ بندوں نے کسی محلے پر حملہ کیا تو چند مسلمان لونڈے لکڑیاں لے کر باہر نکلے اور کائی سی پھٹتی چلی گئی، لٹھ دھرے کے دھرے رہ گئے اور ہجوم دیکھتے ہی دیکھتے بھرّی ہو گیا۔ اپنی آنکھوں تو نہیں دیکھا، ہاں کان گنہگار ہیں کہ ایسے ایسے بھی بنوٹیئے ہو گزرے ہیں جو تلواریئے سے تلوار چھین لیتے تھے اور اس کی گٹھری بنا کر ڈال دیتے تھے۔ البتہ یہ کمال ہم نے ضرور دیکھا ہے کہ چارپائی کے نیچے کبوتر چھوڑ دیجئے، کیا مجال جو بنوٹیا اسے نکل جانے دے۔ یہی کیفیت بانک، پٹہ، گتکہ، چھری اور علمی مد کے ہنر مندوں کی تھی۔ بجلی سی چمکی اور حریف ختم۔

تیراندازی کے تو ہم نے قصے ہی سنے ہیں البتہ بعض بڈھوں کی غلیل بازی دیکھی ہے۔ وہ غلیل یہ آج کل کی دو شاخہ والی کی شکل کی غلیل نہیں ہوتی تھی۔ یہ کوئی دو ہاتھ لمبے لچکدار بانس کو چھیل کر بنائی جاتی تھی۔ اس کے دونوں سروں کے درمیان دہرا تانت کھینچ کر باندھا جاتا تھا جس کی وجہ سے اس کی شکل کمان جیسی ہو جاتی تھی۔ دُہرے تانت کے بیچوں بیچ دو انگل چوڑا کپڑا غلہ رکھنے کے لئے ہوتا تھا۔ جب غلیل استعمال میں نہ ہوتی تو اس کا چلّہ اتار دیا جاتا تھا تاکہ بانس کے جھکاؤ کا زور قائم رہے۔ غُلے خاص طور سے چکنی مٹی کے بنائے جاتے تھے۔ اگر زیادہ مضبوط درکار ہوتے تو چکنی مٹی میں روئی ملالی جاتی تھی اور گیلے غلوں کو دھوپ میں سکھا لیا جاتا تھا۔ دلی میں غلیل کا سچا نشانہ لگانے والے آخر وقت تک باقی تھے۔ چور کے پاؤں کی ہڈی غلے سے توڑ دیتے تھے۔

جس زمانے میں مکہ سے مدینہ اونٹوں پر جایا کرتے تھے تو دلی کے ایک غلیل باز بھی حج کو گئے تھے۔ انہوں نے سن رکھا تھا کہ بعض دفعہ بدّو لوگ قافلے کو لوٹ لیتے ہیں۔ یہ صاحب اپنے ساتھ غلیل بھی لیتے گئے تھے۔ سوءِ اتفاق سے ان کے قافلہ پر بدّوؤں نے حملہ کر دیا۔ بڑے میاں نے اپنی غلیل کچھ فاصلے پر پھینک دی اور سب کے ساتھ کجاوے

میں سے اتر آئے۔ جب بدّو قافلے کو لوٹ کر گٹھریاں باندھنے میں مصروف ہوئے تو بڑے میاں نے لٹیروں کے سردار کی پیشانی پر ایسا تاک کر غلہ مارا کہ وہ چلاّ کر گر پڑا۔ اب جو بھی چونک کر دیکھتا کہ یہ کیا معاملہ ہے اس کی کن پٹی پر غلہ لگتا اور وہ ڈھیر ہو جاتا۔ جب کئی جوان لوٹ گئے تو بڑے میاں نے للکار کر کہا۔

''خیریت چاہتے ہو تو مال چھوڑ دو اور اپنے آدمیوں کو اٹھا کر لے جاؤ، ورنہ تم میں سے ایک بھی بچ کر نہیں جا سکے گا۔''

بدوؤں نے کچھ توقف کیا تو انہوں نے اتنی دیر میں دو ایک کو اور لِٹا دیا۔ لہٰذا لٹیروں نے جلدی جلدی اپنے زخمیوں کو اٹھایا اور وہاں سے چمپت ہو گئے۔

دلی میں ایسے بھی غلیل کے نشانہ باز بھی تھے جو ایک غلہ ہوا میں اوپر مارتے اور جب وہ غلہ واپس آنے لگتا تو دوسرا غلہ اس پر مارتے اور دونوں غلے ٹوٹ کر ہوا میں بکھر جاتے۔

OO

دِلّی والوں کے شوق

دِلّی والوں کو اپنی جان بنائے رکھنے کا بڑا شوق تھا۔ اس شوق کو پورا کرنے کے لئے ورزش کیا کرتے تھے اور ورزشی کھیلوں میں شریک ہوتے تھے۔ ہر گھر میں بگ ڈڑ اور مگدروں کی جوڑی ضرور ہوتے تھے۔ بعض لوگ بگ ڈڑ کا کام گھما انیٹوں سے لیتے تھے۔ دیسی ورزش سے سینے چوڑے اور کمر چھلا سی ہو جاتی تھی۔ توند نکلنے نہیں پاتی تھی اور پیٹ چپاتی سا ہو جاتا تھا۔

ورزش کا شوق دلی کے امیر غریب سبھی کو تھا۔ باریک اور چست لباس پہننے کا رواج تھا، اس لئے اپنے جسم کو سڈول بنانے کی دھن سب کو لگی رہتی تھی۔ پھنسے ہوئے انگرکھے اور چست پاجامے اسی وقت اچھے لگتے ہیں جب ڈنڑ، قبضے اور پنڈلیاں بھری بھری ہوں۔ سرکنڈے سے ہاتھ پاؤں بھلا چکن اور ململ میں کیسے بھلے لگ سکتے ہیں؟ بلکہ ایسے سوکھے سہمے لوگوں پر تو "کاغذ کے پٹے باز" کی پھبتی کسی جاتی تھی۔

گلی گلی اُکھاڑے کھلے ہوئے تھے۔ ہر اکھاڑے کے لئے ایک اُستاد رکھا جاتا تھا جو عموماً کوئی بوڑھا پہلوان ہوتا تھا۔ شہر میں کئی تعلیمی اکھاڑے تھے جن میں فن کشتی کے ماہر اپنے پٹھے تیار کرتے تھے اور جمعہ کے جمعہ موتیا کھان میں دنگل ہوتا تھا۔ اس دنگل میں ان اکھاڑوں کے تربیت یافتہ پہلوانوں کی کشتیاں ہوا کرتی تھیں۔ چالیس پچاس سال پہلے تک دلی میں یہ اکھاڑے مشہور تھے۔

گوندی شاہ والے، شیخو والے، بھوری والے، میراں شاہ والے، پیر والے اور

تیلی والے۔ محلوں میں جو اکھاڑے تھے ان کے اُستاد اکھاڑے میں آنے والوں کو طرح طرح کی ورزشیں بتایا کرتے تھے۔ یہ نہیں کہ اندھا دھند ڈنڑ پیلنے پر لگا دیا۔ جی نہیں، کسی کا اوپر کا دھڑ کمزور ہے تو اسے کچھ ورزش بتائی، اور کسی کا نیچے کا دھڑ کمزور ہے تو اسے کچھ اور۔ جسم کی خوبصورتی یہ ہے کہ سر سے پاؤں تک سڈول ہو۔ تمام اعضا، یکساں طور پر تیار ہوں۔ یہ نہیں کہ سینے پر تو گوشت آ گیا مگر ٹانگیں **کھپچیاں** سی دھری ہیں۔ یا پٹیں تو بھر گئیں مگر بازو سرکنڈے سے رہ گئے۔

صبح شام اکھاڑے میں رونق ہوتی ہے۔ دیکھئے کوئی بگ ڈنڑ پر ڈنڑ پیل رہا ہے، کوئی سپاٹے سے بیٹھکیاں نکال رہا ہے۔ ایک سنتولا اٹھا رہا ہے تو دوسرا لیزم سے زور آزمائی کر رہا ہے۔ کوئی عشق اللہ لگا رہا ہے تو کوئی ڈھکیلیاں کھا رہا ہے۔ کوئی مگدر پھرا رہا ہے تو کوئی موگریوں کے ہاتھ نکال رہا ہے۔ اکھاڑے کی مٹی میں تیل ملا کر اکھاڑے کو دونوں وقت ہرا کیا جاتا ہے۔ اکھاڑہ کشادہ بنایا گیا ہے، ایک ہی وقت میں کئی کئی جوڑیں چھوٹی ہوئی ہیں۔ پہلے صرف زور ہو رہے ہیں۔ یہ اسے ریلتا ہوا لے جاتا ہے اور وہ اسے پیلتا ہوا لے آتا ہے۔ جب تک سانس نہ پھول جائے یہی ریل پیل رہے گی۔ دم لینے کے بعد ان کی پکڑ ہوگی۔ اتنے میں دوسری جوڑ لنگر لنگوٹا کس کر سامنے آ گئی۔ اُستاد نے کہا۔ ''ہاں بھئی بسم اللہ۔'' آمنے سامنے ہو کر دونوں نے ہاتھ ملائے، پھر اپنی اپنی ران پر تھپکی دے دونوں گتھ گئے۔

اُستاد کبھی ایک سے کہتے ہیں۔ ''ابے سانٹیاں نکال۔'' کبھی دوسرے سے کہتے ہیں۔ ''ابے بڑا کا پڑا رہ گیا؟ ابے گدھا لوٹ لگا۔'' لو وہ نیچے سے نکل آیا۔ دونوں پھر آمنے سامنے کھڑے ہو گئے۔ اُستاد نے کہا۔ ابے بھّا باندھ کر دھوبی پاٹ پر کھینچ لے۔''

داؤں کچھ ادھورا رہا تو دوسرے سے بولے۔ ''**کھپچڑے** چڑھا لے۔''

اُس نے ایسی قینچی ڈالی کہ بے بس کر دیا۔

اُستاد نے چیخ کر کہا۔ ''ابے اس قلف کو کہنی کی کنجی سے کھول اور قلا جنگ لگا۔'' لو میاں دیکھا؟ ابھی تو بالکل بے بس ہو رہا تھا یا اب دوسرے کے سینے پر چڑھا

بیٹھا ہے۔ ہاں بھئی، جس کا داؤں لگ جائے۔ یہ تو پھرتی کا کام ہے۔ نری طاقت بھلا کیا کرے گی؟ غرض پور پور داؤں ہو رہے ہیں۔ آپ چند نام سن لیجئے:۔

رک لنگڑی۔ چپڑاس۔ سکی، اندری باہر کی۔ اندری اندر کی۔ ڈھنی اندری۔ کھسوٹا۔ دھوبی پاٹ۔ کھوکھا۔ غاز بند۔ گھستا۔ کھڑا گھسا۔ مغلا۔ جھولی۔ دھڑ مارنا۔ روم مارنا۔ سانڈھی۔ اُلٹی پُٹھی۔ سیدھی پٹھی۔ گل لپیٹ۔ ٹانگ لگانا۔ قینچی۔ کنگھی۔ پھرکی۔ لپیٹ۔ ڈھاک۔ مہرہ۔ کیلی۔ گدھالوٹ۔ غوطہ۔ گوؤ مکھ۔ اچھال۔ طباق پھاڑ۔ سواکری۔ قلاجنگ۔ ڈھیکلی۔ دیوبند۔ جھکائی۔ اُکھیڑ میں بیٹھنا۔ بوجھا دینا۔

اُکھاڑے ہی میں ایک طرف تو پرانے وقتوں کا کنواں ہے۔ ڈول کھینچنا بھی ایک ورزش ہے۔ پسینہ خشک کرتے جاتے ہیں اور باری باری نہاتے جاتے ہیں۔ ایک پانی کھینچ کھینچ کر ڈول پہ ڈول ڈال رہا ہے۔ جب وہ نہا چکا تو اس نے دوسرے کو اسی طرح نہلایا۔ جانگئے اتار کر کپڑے پہن، اُستاد کو سلام کر اکھاڑے سے باہر نکلے اور سیدھے دودھ والے کی دُکان پر جا کر سیر سیر بھر اونٹا ہوا دودھ پیا۔ پھر ٹہلتے ٹہلتے جامع مسجد چلے گئے اور چوک کی بہار دیکھی۔ یوں جسم اور صحتیں بنی رہتی تھیں۔ جوان تو جوان بڈھوں تک کے چہروں پر چلوؤں خون نظر آتا تھا۔ سینے گوشت سے پٹے ہوئے، ڈنڑ قبضے بنے ہوئے، رانوں کے مچھلے اُلٹے ہوئے، پنڈلیاں کچالوسی بنی ہوئیں۔ اپنے پرائے کو دیکھ کر جی خوش ہوتا تھا۔ یا اب جوانوں کا یہ حال ہے کہ جس کو دیکھو کانپ ٹھڈے ٹوٹے ہوئے، کمان بنا قبر کے لئے جگہ تلاش کر رہا ہے۔ یہ جوانی اور مانجھا ڈھیلا!

ورزشی کھیلوں میں کبڈی ایک ایسا کھیل تھا جس میں کچھ بھی خرچ نہیں ہوتا تھا۔ ہر محلے میں کہیں نہ کہیں تھوڑی سی کھلی جگہ ہوتی تھی۔ اس میں کبڈی کا پالا جمتا۔ جوڑیاں بگی جاتیں۔ دس بارہ نوجوان ایک طرف اور دس بارہ دوسری طرف ہو جاتے۔ بیچ میں پالا کھنچ جاتا۔ اب ایک طرف کا ایک جوان ''ہل کبڈی'' کا نعرہ لگا کر پالے سے آگے بڑھا۔ اُدھر والے دور دور ہو گئے کہ یہ کسی کو چھو نہ لے۔ یہ ''کبڈی کبڈی'' کہتا ایک ایک کی طرف لپکتا ہے مگر کوئی ہاتھ نہیں آتا۔ اسے یہ بھی خیال ہے کہ کوئی پیچھے سے آ کر پکڑ نہ

لے، یا بیچ میں سانس نہ ٹوٹ جائے۔ چوکنا ہو کر لپکتا پھرتا ہے اور جب سانس ختم ہونے لگتا ہے تو واپس آ جاتا ہے۔ اس کے پیچھے ہی دوسری طرف کا ایک نوجوان لپکتا ہے تاکہ پالا پھلانگتے ہی اسے چھولے، مگر وہ تیتری بنا ہوا ہے، ہاتھ نہیں آتا۔ یہ صاحب گرم جوشی میں کچھ زیادہ ہی بڑھ آئے۔ ادہر کے دونو جوان اس کی اس چوک سے فائدہ اٹھا کر اس کے پیچھے آ جاتے ہیں اور کولی بھر کے اسے ادہر اٹھا لیتے ہیں۔ یہ بہتیرے ہاتھ پاؤں مارتا ہے، بھلا وہ کب چھوڑتے ہیں، ایک کی دوا دو۔ اس کا سانس ختم ہو جاتا ہے اور وہ مر کر الگ جا بیٹھتا ہے۔ جب دوسری طرف کا کوئی کھلاڑی مرے گا تو یہ جی اٹھے گا۔ دونوں طرف کے مرتے جیتے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ ایک فریق کے سارے کھلاڑی مر جاتے ہیں اور وہ فریق ہار جاتا ہے۔ مغرب کی آندھی میں جہاں اور بہت سی کام کی چیزیں اڑ گئیں کبڈی بھی اڑ گئی۔ اس کی جگہ فٹ بال اور رگبی نے لے لی۔

گیڑیاں کھیلنا بھی سستا اور ورزشی کھیل تھا۔ روپے کی چار من جلانے کی لکڑیاں آتی تھیں۔ من من بھر لے کر دو فریق میدان میں آ جاتے۔ بیچ میں پالا کھنچ جاتا۔ چھوٹی لکڑیاں پنچیاں کہلاتی تھیں۔ ایک فریق والے دوسرے فریق والوں کے آگے اپنی پنچیاں ڈالتے جاتے اور اس فریق کا ایک کھلاڑی دنچو سے جو ایک موٹی بھاری لکڑی ہوتی ہے، پنچیوں پر اس طرح تاک کر ضرب لگاتا ہے کہ پنچی پالے کے پار چلی جاتی ہے۔ جب پنچی اوچھے وار کی وجہ سے پار نہ ہوتی تو دوسرے فریق کے پاس آ جاتی۔ آخر میں سنتا پہنایا جاتا اور ہارنے والوں کی ڈولیاں ہو جاتیں۔ اب گیڑیاں کہاں؟ اب تو ہیمر تھرو ہے۔

گِلّی ڈنڈا گلیوں میں نہیں کھیلا جاتا تھا۔ قریب کے میدان میں گُچی کھود لی جاتی۔ کھیلنے والوں کی دو ٹولیاں بن جاتیں۔ ایک ٹولی کھیلتی اور دوسری کھلاتی۔ گُچی پر گُلّی رکھ کر ڈنڈے سے سیدھی اُچھالی جاتی۔ اگر کھلانے والوں میں سے کوئی لپک لیتا تو کھیلنے والا مر جاتا، ورنہ گچی کے پاس ڈنڈا رکھ دیا جاتا اور گِلّی تاک کر ڈنڈے کی طرف پھینکی جاتی۔ اگر ڈنڈے سے چھو جاتی تو کھلاڑی مر جاتا، ورنہ کھلاڑی تین اَنس لگاتا اور جہاں گلی پہنچ جاتی وہاں سے گچی تک اندازے سے لال مانگے جاتے۔ یہ ایک لال ڈنڈے

کے برابر ہوتا تھا۔ فریق مخالف یا تو اس کے مطالبے کو منظور کر لیتا یا نا منظور کر کے گلی سے گچی تک ڈنڈے سے فاصلہ ناپتا۔ اگر لال کم رہ جاتے تو کھلاڑی مرجاتا۔ پٹھو کی تعداد مقرر کر لی جاتی کہ سولال کا ایک پٹّھو ہوگا جس کے پٹھو زیادہ ہوتے وہ فریق جیت جاتا۔ گلی ڈنڈا مغرب کی بھینٹ چڑھ گیا۔ اب تو کرکٹ ہے اور اسکواش۔ جب بلے ٹوٹ جاتے ہیں اور گیندیں پھٹ جاتی ہیں تو گردش ایام ماضی کی طرف لوٹ جاتی ہے اور میدانوں میں بچے گلی ڈانڈا کھیلتے نظر آتے ہیں۔

گھروں میں گنجفہ، شطرنج، چوسر، پچیسی، تاش، نوکنکرا کھیلا جاتا تھا۔ شطرنج کے بعض ایسے کھلاڑی بھی تھے جو غائب کھیلتے تھے۔ ان کے سامنے شطرنج کی بساط اور مہرے نہیں ہوتے تھے۔ انہیں صرف یہ بتا دیا جاتا کہ حریف نے یہ چال چلی ہے۔ یہ فوراً کہہ دیتے ہماری طرف سے فلاں مہرا چل دو۔ ان کے ذہن میں شطرنج کا پورا نقشہ جما رہتا تھا۔ اُدھر کئی کھلاڑی لگے رہتے اور ادھر یہ صرف اکیلے ہوتے، اور پھر جیت بھی انہی صاحب کی ہوتی۔

شطرنج کے کھلاڑیوں کو بازیوں میں اس قدر انہماک ہوتا کہ اُنہیں دِین دُنیا کی خبر ہی نہ رہتی۔ ایک صاحب گھر سے اپنے بیمار بچے کی دوا لینے چلے۔ راستہ میں پھڑ جما ہوا دکھائی دے گیا۔ پہلے کھڑے دیکھتے رہے، پھر خاموش نہ رہ سکے تو چالیں بتانے لگے۔ اس کے بعد بھی ضبط نہ ہو سکا تو ہارنے والے کھلاڑی کو ''اماں ہٹو'' کہہ کر ایک طرف کر دیا اور خود کھیلنے لگے۔ ایک بازی ختم ہوئی تو دوسری، اور دوسری ختم ہوئی تو تیسری۔ غرض دوپہر ہونے کو آئی تو کسی محلے والے نے آ کر اطلاع دی کہ بچے کی طبیعت زیادہ خراب ہوگئی ہے، دوا کا انتظار ہو رہا ہے۔ ''ابھی آتا ہوں'' کہہ کر پھر چالوں میں گم ہو گئے۔ شام ہوتے اطلاع ملی کہ بچے کا انتقال ہو گیا۔ انا اللہ کہہ کر نظر اٹھائی۔ بولے ''اچھا بھئی، کفن دفن کا انتظام کرو۔ بس یہ بازی ختم کر کے میں آیا۔'' وہاں جنازہ تیار ہو گیا۔ بولے۔ ''تم لے کر چلو، میں آیا۔'' پھر اطلاع ملی کہ دفنا بھی آئے بولے۔ ''چلو اچھا کیا۔ بچارا بہت تکلیف میں تھا۔'' لوگوں نے کہا۔ ''میاں اب تو گھر چلو۔'' بولے۔ ''

جب مرنے والا ہی نہیں رہا تو اب میں جا کر کیا کروں گا؟ وہ اچھی جگہ ہے ہم بری جگہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ مغفرت کرے۔ یہ دن تو بھئی سبھی کے لئے آنے والا ہے.....

موت سے کس کو رستگاری ہے

آج وہ، کل ہماری باری ہے

ہاں صاحب، آپ نے کیا چال چلی؟''

ایک صاحب گھر سے گوشت لینے نکلے۔ قصائی سے گوشت لے کر لوٹ رہے تھے کہ قضا عند اللہ راستے میں کسی بیٹھک میں شطرنج ہوتی دکھائی دے گئی۔ ٹھٹک کر کھڑے ہو گئے۔ جب بازی ختم ہوئی تو صاحبِ خانہ نے کہا۔ ''آیئے میر صاحب، آپ سے بھی ایک پکڑ ہو جائے۔'' اندھا کیا چاہے؟ دو آنکھیں۔ جھٹ بیٹھ کر مہرے جمانے لگے۔ اب بازی پر بازی ہوئے چلی جا رہی ہے۔ دو پہر ہوئی، دن ڈھلا، رات ہو گئی۔ بیٹھک میں سڑاند اور بساند پھیلنے لگی۔

''اماں یہ بدبو کہاں سے آ رہی ہے؟''

''کوئی چوہا وہا تو نہیں مر گیا؟''

اِدھر اُدھر سونگھ کر ایک صاحب نے کہا۔

''بدبو، میر صاحب کے پاس سے آ رہی ہے۔''

مگر میر صاحب ہیں کہ شطرنج میں غرق ہیں۔ کسی نے انہیں ہلا جلا کر کہا۔

''اماں میر صاحب، یہ بدبو کہاں سے آ رہی ہے؟''

بولے۔ ''ارے آ رہی ہو گی کہیں سے۔ یہاں لاکھ روپے کی بازی لگی ہوئی ہے، اور تمہیں بدبو کی لگ رہی ہے۔''

مگر بدبو اتنی ناگوار ہو چکی تھی کہ ناک نہیں دی جا رہی تھی۔ ایک صاحب نے اس کا سراغ لگا ہی لیا، اور میر صاحب کی بغل میں سے پوٹلی کھینچ لی۔

''اماں میر صاحب، یہ کیا ہے؟''

میر صاحب نے چونک کر کہا۔ ''اوہو گوشت ہے۔ سڑ گیا۔ اسے پھینک دو۔'' یہ

کہہ کر پھر کھیل میں لگ گئے۔

چوسر کھیلنے والے دانا اور پچیسی کھیلنے والے کوڑیاں شرطیہ پھینکتے تھے۔ یعنی جتنے کہو اتنے پھینک دیں۔ یہی حال تاش کا تھا۔ گڈی کو جتنا چاہے پھینٹ دیجئے، مگر جب بانٹنے والا بانٹے گا تو اچھے اچھے پتے خود لے جائے گا۔

یہ اور اسی قسم کے کھیل دیوان خانوں میں کھیلے جاتے تھے۔ یہ مردانہ گھر ہوتے تھے جن میں نہایت شائستہ صحبتیں ہوا کرتی تھیں۔ ہر محلے میں دو چار بڑے بڑے دیوان خانے ہوتے تھے جن میں رات کو احباب جمع ہوتے تھے۔ دل بہلانے اور وقت گزارنے کے لئے تمام کھیل کھیلے جاتے تھے۔ ان ہی دیوان خانوں میں کبھی کبھی شعرو سخن کی محفلیں بھی ہوتیں، مصرعہ طرح پر مشاعرے ہوتے۔ دلی میں اس وقت کئی اُستاد تھے۔ اُستاد بیخود، نواب سراج الدین احمد خاں سائل، آغا شاعر، پنڈت امرناتھ ساحر اور اُستاد حیدر بہت مشہور تھے۔ انہی کے شاگردوں نے دلی کے چاروں کھونٹ داب رکھے تھے۔ مشاعروں میں پورے ادب آداب برتے جاتے تھے۔ بعد میں مشاعرے شاعروں کے اکھاڑے بن گئے تھے اور بھلے آدمیوں نے ان میں شریک ہونا چھوڑ دیا تھا۔ صرف سالانہ مشاعرہ پنڈت امرناتھ ساحر کا ایک ایسا رہ گیا تھا جس کے لئے خاص انتظام داہتمام کیا جاتا تھا۔ پنڈت جی پنشن یافتہ تحصیلدار تھے۔ ستر سے اوپر ہو گئے تھے مگر صحت اچھی تھی اور کسی عیب میں نہیں تھے۔ لمبی سی چوری نما ڈاڑھی تھی، چغہ پہنتے تھے اور پگڑی باندھتے تھے۔ انہیں اُردو سے عشق تھا۔ شہر میں سبھی ان کا احترام کرتے تھے اور ان کے مشاعرے میں نامی گرامی شعراء دور دور سے آ کر شریک ہوتے تھے۔

دیوان خانے کی ادبی نشست نواب خواجہ محمد شفیع دہلوی کے ہاں اتوار کے اتوار سہ پہر سے مغرب کے بعد تک ہوتی تھی۔ آخر میں ادیبوں اور شاعروں کا یہی ایک ٹھکانا رہ گیا تھا۔ کوئی معروف اور غیر معروف ادیب یا شاعر ایسا نہیں تھا جس نے اس مجلس میں شرکت نہ کی ہو۔ حضرت خواجہ حسن نظامی سے لے کر اُستاد ہلال چغتائی تک سبھی شریک ہوتے تھے۔ اُستاد ہلال وہ تھے جنہیں مرزا غالب نے ایک دن خواب میں آ کر اپنا خلیفہ

بنایا تھا۔ ان کے بے معنی شعروں اور ناموزوں مصرعوں سے سامعین بہت لطف اندوز ہوتے تھے۔ بولی ٹھولی اور فقرے بازی بھی اس مجلس میں خوب ہوتی تھی۔ خود خواجہ محمد شفیع صاحب بڑے پھبتی باز اور چرب زبان آدمی تھے۔ تھے کیا؟ ابھی ہیں۔ اللہ اُنہیں سلامت رکھے، مگر مہاجرت نے ان کی خوش دِلی بہت کچھ چھین لی اور لاہور میں کچھ گوشہ نشین سے ہو گئے ہیں۔

دِلّی والوں کو تیرنے کا بھی شوق تھا۔ تیراکی کے بھی دلی میں کئی اُستاد تھے۔ ان کی تعلیمیں مشہور تھیں۔ تیراکی جمنا میں سکھائی جاتی تھی، بعض باؤلیوں میں بھی سیکھتے تھے، مثلاً اگرسین کی باؤلی میں۔ بعض لوگ کہتے تھے کہ یہ اگرسین نہیں اصغر حسین کی باؤلی ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔ اکثر نام بگڑ کر کچھ کے کچھ ہو گئے تھے۔ مثلاً بوعلی بختیاری کا نام بھوری بھٹیاری بن گیا تھا اور شاہ ابوالعلیٰ کا شاہ بولا بن گیا تھا۔

ہاں تو ڈھائی ڈھوئی کا مینہہ برسا۔ ندی نالے چڑھ گئے۔ جمنا لبالب کناروں تک بھر گئی۔ تیراکی کے میلے کی تاریخ مقرر ہو گئی۔ شاہی کی تو کچھ اور ہی شان تھی۔ بھلا جس کام کی سر پرستی بادشاہ خود کریں اس میں رونق اور برکت کیوں نہ ہو؟ شہر کا شہر اُمنڈ کر میلے میں آ جاتا۔ تہہ بازاریاں لگ جاتیں۔ بادشاہ اور شہزادے جمنا کے رخ سمن برج (مثمن برج) اور دیوان خاص کے صحن میں آ بیٹھتے۔ بیگمات اور شہزادیاں محلوں کے جھروکوں میں سے سیر دیکھتیں۔ جمنا اس زمانے میں قلعہ سے لگی لگی بہتی تھی۔ ٹولیاں کی ٹولیاں جمنا میں اترتیں اور اپنے اپنے کمالات دکھاتیں۔ کوئی پانی پر چت لیٹا ہے، کوئی پالتی چڑھائے بیٹھا ہے۔ کوئی کھڑی لگا رہا ہے، کوئی شیر کی تیرائی تیر رہا ہے۔ کوئی گٹھری بنا بہا چلا آتا ہے، کوئی مردے کی طرح تختہ بنا ہوا ہے۔ وزیر آباد سے تیراک چھوٹتے اور جمنا کے پل پر آ کر دم لیتے۔ بادشاہ کی طرف سے اچھے تیراکوں کو انعام ملتا۔ یہ میلہ اب تک ہوتا تھا مگر وہ دھوم دھام بادشاہ کے دم کے ساتھ گئی۔ سینکڑوں قسم کی تیرائی تھی۔ چند نام آپ بھی سن لیجئے:۔

کھڑی، ملاحی، ٹنگڑی، مورچال، شیر پانی، بھیڑیا پانی، کھڑی ملاحی، ہاتھ پھینک

ملاحی، چپت پٹ، چراغ، گٹھری، دوڑ بھاگ، سُن، کشتی، غوطہ، اکوائی، دوٹنگڑی، آلتی پالتی، فیل، رقص، پیر دکھائی، دست بند، فلک رو، کٹورا، دھارا، بغل گیر، آنکھ مچولی، تہہ آب، پانی چیر، مگر مچھ، الٹی پلٹی، نماز، پلنگ، نوک جھونک، داؤ پیچ، شمشیر۔

دِلّی کے پتنگ باز بھی مشہور تھے۔ بڑے بڑے ہاتھ لگتے تھے۔ قلعہ والوں اور شہر والوں کی تکلیں لڑتیں۔ اس موقع کے لئے دنوں پہلے سے اہتمام کیا جاتا تھا۔ کانپ ٹھڈے بڑی محنت سے تیار کئے جاتے، مانجھے سونتے جاتے۔ ذرا ڈور سے ڈور ملی اور ایک نہ ایک کٹی۔ لو وہ دو تکلوں کے منہ ملے اور دونوں نے ڈھیل دینی شروع کر دی۔ دونوں نے سیروں ڈور پلا دی۔ تکلیں تارا ہو گئیں۔ اب چٹکی ہی سے تکل کی کیفیت معلوم ہو رہی ہے۔ ایک نے ذرا پٹیا چھوڑا کہ دوسری نے وہیں غوطہ مارا۔ ''وہ کاٹا وہ کاٹا'' کا شور مچ گیا۔ کٹی ہوئی تکل کی ڈور ہاتھ پر سے توڑ دی گئی اور لوٹنے والوں نے جھٹ ساری ڈور لوٹ لاٹ انٹیاں بنالیں۔ اس دن اس کثرت سے گڈیاں اُڑتیں کہ آسمان چھپ جاتا۔ دمڑ چل، ڈھیل چل، پیسیل۔ اڈھا، کلڈ ما، للڈ ما، چپ، پری، شکر پارہ، پٹیل، بھیڑیا، کلیجہ جلی، سینکڑوں قسم کی گڈیاں اڑتیں۔ کوئی ڈھیل دے کر کاٹتا، کوئی کھنچائی کرتا۔ کسی کی دال چپو ہو گئی، کوئی آنچم کئے لئے جاتا ہے۔ کوئی اپنی نوشیرواں پتنگ پر پھولا نہ سماتا۔ غرض دن بھر خوب لطف رہتا۔ ایسے پتنگ باز دلی میں اب تک موجود تھے جو پتنگ میں گجرا لٹکا کر اڑاتے اور پتنگ کو غوطہ دے کر جس کے گلے میں گجرا ڈالنا چاہتے ڈال دیتے، اور رات کو پتنگ میں قندیل باندھ کر اُڑانا تو ایک عام بات تھی۔

○○

بھانڈ اور طوائفیں

شاہی اور شہر آبادی کا تو ذکر ہی کیا، اب سے چالیس پچاس سال پہلے تک دلی میں ایک سے ایک منچلا رئیس تھا۔ ریاست تو خیر باپ دادا کے ساتھ ۱۸۵۷ء میں ختم ہو گئی تھی مگر فرنگی سرکار سے جو گزارہ انہیں ملتا تھا اس میں بھی ان کے ٹھاٹ باٹ دیکھنے کے لائق تھے۔ انہیں میں سے ایک بگڑے دل رئیس تھے جو اپنی شاہ خرچیوں کی وجہ سے نواب صاحب کہلانے لگے تھے۔ انہیں نت نئی سوجھتی تھی۔ قمری مہینے کی چودھویں رات کو ان کے ہاں شب ماہ منائی جاتی تھی۔ کبھی بیت بازی ہوتی، کبھی مشاعرہ ہوتا، کبھی تاش، پچیسی اور شطرنج کی بازیاں ہوتیں۔ کبھی میر باقر علی داستان گو طلسم ہوشربا کی داستان سناتے۔ کبھی گانے بجانے کی محفل ہوتی اور کبھی ناچ نرت کی سبھا جمتی۔ رات کو کھانا سب نواب صاحب ہی کے ہاں کھاتے۔ نواب صاحب کھانے کے شوقین تھے، ایک آدھ چیز خود بھی پکاتے تھے اور دوستوں کو کھلا کر خوش ہوتے تھے۔ دیوان خانے میں کھانے سے فارغ ہونے کے بعد کھلی چھت پر سب آ گئے۔ دری چاندنی کا فرش ہے۔ چاروں طرف گاؤ تکئے لگے ہوئے ہیں، مہمان ان کے سہارے ہو بیٹھے۔ حقے اور پیچوان لگ گئے۔ خمیرے کی لپٹیں آنے لگیں۔ گلاب پاش سے گلاب چھڑکا گیا، موتیا کے گجرے کنٹھے گلوں میں ڈالے گئے۔ چنگیروں میں چنبیلی کے پھول اور عطر میں بھیگی ہوئی روئی رکھی ہے۔ چاندی کے خاصدانوں میں لال قند کی صافیوں میں دیسی پان کی گلوریاں رکھی ہیں۔ چوگھڑا الائچیاں، زردہ اور قوام علیحدہ رکھا ہے۔ پان کھائے گئے، حقے کے کش لگائے گئے۔

آپس میں بولیاں ٹھولیاں ہوئیں، آوازے توازے کسے گئے، ضلع جگت اور پھبتی بازی ہوئی۔ اتنے میں چاند نے کھیت کیا۔ چاند کے چڑھنے تک یونہی خوش گپیاں اور نوک جھونک ہوتی رہی۔

جب چاندنی خوب پھیل گئی تو نواب صاحب نے میر کلو کی طرف دیکھا۔ یہ میر کلو دیوان خانے کے مختار کل تھے۔ تمام انتظامات میر کلو ہی کیا کرتے تھے۔ نواب صاحب نے کہا:

''کیوں صاحب، کیا دیر دار ہے؟''

میر کلو نے کہا۔ ''حضور، حکم کا انتظار ہے۔''

وہ بولے۔ ''تو شروع کرو۔''

پہلو کے کمرے سے سبز رنگ کی پشواز پہنے ایک اُجلے رنگ کی حسین عورت خراماں خراماں آ کر سینے پر دونوں ہاتھ رکھ کر کھڑی ہوگئی۔ محفل پر اس نے ایک نظر ڈالی اور پھر نہایت ادب سے مجرا عرض کیا۔ اوہو! یہ تو موتی بھانڈ ہے! پیچھے دو سارنگی والے، ایک طبلہ نواز اور ایک مجیرے والا، اُجلی پوشاکیں پہنے آ کھڑے ہوئے۔ طبلے پر تھاپ پڑی، سارنگیوں پر لہرا شروع ہوا، طبلہ نواز نے پیش کار لگایا، موتی بھانڈ نے گت بھری تو یہ معلوم ہوا کہ اِندر کے اکھاڑے کی پری اتر آئی۔ تین سلاموں پر چکر دار گت ختم ہوئی تو سب کے منہ سے ایک زبان ہو کر نکلا ''سبحان اللہ!'' موتی بھانڈ نے تسلیمات عرض کی۔ کوئی ایک گھنٹے تک کتھک ناچ کے مشکل توڑے سنائے، پھر لئے کی تتھیم ایک سے سولہ تک دکھائی، آخر میں تتکار کا کمال دکھایا۔ سب نے جی کھول کر داد دی۔ واقعی میں موتی بھانڈ نے اپنے فن میں کمال حاصل کیا تھا، اور جب اس نے مور کا ناچ دکھایا تو اس کے تھرکنے پر محفل لوٹ گئی۔ نواب صاحب نے ناچ ختم ہونے پر اسے بلایا اور کہا۔

''موتی، تم پر یہ فن ختم ہے۔ مور کا ناچ سبھی ناچتے ہیں مگر جس سلسلے سے تم ناچتے ہو یہ اور کسی کے بس کی بات نہیں۔ بالخصوص ناچتے ناچتے جب مور اپنے پیروں کو دیکھتا ہے اور اس کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو جاتے ہیں، اس کیفیت کو جس خوبی اور سچائی سے تم

ادا کرتے ہو بس یہ تمہارا ہی حصہ ہے۔" نواب صاحب نے یہ کہہ کر ایک اشرفی اور چند روپے انعام دیے۔ موتی بھانڈ نے انعام لے کر مودبانہ تین سلام کیے اور ہاتھ جوڑ کر کہا۔

"حضور کی ذرہ نوازی اور فن کی قدر دانی ہے کہ اس غلام کو یوں سراہتے ہیں۔ ورنہ میں کیا میری بساط کیا؟ من آنم کہ من دانم۔"

یہ شائستگی اور یہ علم مجلسی دلی کے فنکاروں میں اب سے نصف صدی پہلے تک موجود تھا۔ جب فنکار اور فن کی ناقدری ہونے لگی تو فنکار کا وقار اور فن کا اعزاز جاتا رہا۔ موتی کے بعد دِلّی میں نوری اور کلن جیسے بھانڈ رہ گئے تھے جو بھنڈیلوں اور نقالوں کے سہارے زندہ تھے، اور کمینوں میں اُن کا شمار ہوتا تھا۔ جس زمانے میں گانے بجانے کو عیب نہیں ہنر سمجھا جاتا تھا، دِلّی کے شرفا اسے فن کی حیثیت سے سیکھتے تھے۔ دلی میں اچھے اُستادوں کی کمی نہیں تھی۔ کوئی ستار سیکھتا، کوئی طبلہ، کسی کو گانے کا شوق ہوتا تو راگ راگنیاں سیکھتا اور کسب و ریاض سے اس علم وفن میں اتنی مہارت حاصل کر لیتا کہ پیشہ ور بھی اس کا لوہا ماننے لگتے۔

گانے بجانے کے سلسلے میں دلی کی ڈیرہ دار طوائفوں کا مختصر سا تذکرہ بے جا نہ ہوگا۔ نئی تانتی اب سے پچاس سال پہلے کی طوائفوں کا صحیح تصور بھی نہیں کر سکتی۔ ڈیرے دار طوائفیں پیشہ نہیں کماتی تھیں، اور نہ عام طوائفوں کی طرح مجرے کرتی تھیں۔ ان کے ٹھکانے دراصل تہذیبی ادارے ہوتے تھے جن میں تمیز، اخلاق اور شائستگی سکھائی جاتی تھی۔ ہر کس و ناکس ان کے ہاں جا بھی نہیں سکتا تھا۔ یہ ہمارے ہوش سے پہلے کی بات ہے کہ شرفاء ان کے ہاں اپنے بچوں کو تہذیب سیکھنے کے لئے بھیجا کرتے تھے۔ دوائی جان اور چونّی جان کی یادگار موتی جان اور نوشابہ جان البتہ ۱۹۴۷ء تک دلی میں موجود تھیں جو نہایت مہذب مشہور تھیں۔ دوانی جان وہی تھیں جن کے بارے میں توتلے شہزادے مرزا چپاتی نے یہ شعر کہا تھا......

دھتے دھتے ہو دئی اتنی ملت
تھات پیسے تی دوانی رہ دئی

یعنی......

گھستے گھستے ہو گئی اتنی ملٹ
ساٹ پیسے کی دوائی رہ گئی

نوشابہ جان کا نام گانے اور ناچنے میں بھی نکلا ہوا تھا۔ دلی کے گنے چنے شرفا کے گھرانوں میں جایا کرتی تھیں اور اپنے کمال فن کا مظاہرہ کرتی تھیں۔ شعر بھی کہتی تھیں۔ دلی کی بیگماتی زبان بولتی تھیں۔ بولی ٹھولی اور ضلع جگت میں بھی نہیں چوکتی تھیں۔ اگر کبھی باہر سے قابل تکریم فنکار شہر میں آتے تو ان کی دعوت کرتیں، سو پچاس شرفا کو بھی بلاتیں۔ پہلے دسترخوان بچھایا جاتا۔ عمدہ کھانا کھلایا جاتا۔ اس کے بعد پان، حقہ، سگریٹ سے تواضع ہوتی۔ سب گاؤ تکیوں کے سہارے ہو بیٹھتے۔ فقرے بازی ہوتی، پھبتیاں کسی جاتیں۔ کسی کو نقل محفل بنایا جاتا، یہ عموماً کوئی ثقہ بزرگ ہوتے۔ برجستہ شعر پڑھے جاتے، ہنسی مذاق کی باتیں ہوتیں، مگر کیا مجال جو ذرا سی بھی بیہودگی کسی سے ہو جائے۔

پھر بی جان کا اشارہ پاتے ہی سفردا (سپٹر دار) آگے آ کر سب کو سلام کرتے۔ سارنگئے غلاف اتار کر طربیں ملاتے، طبلہ نواز اپنی گٹھڑی کھول کر دائیں کو چھوٹی سی ہتھوڑی سے ملانے لگتے۔ ساز مل جاتے تو بی جان سامنے آ کر بیٹھ جاتیں۔ دونوں سارنگئے دائیں بائیں ہو بیٹھتے۔ طبلہ نواز پیچھے بیٹھتا۔ پھر ایک خادم تانپورہ لا کر بی جان کے سامنے پیش کرتا۔ وہ پہلے دائیں کان کو چھوتیں، پھر تانپورہ سُر کرنے لگتیں۔ سارنگیوں نے شدھ ٹھاٹ ملایا ہے۔ بی جان نے پنچم کا تانپورہ ملایا۔ جب چاروں تار مل گئے تو سب نے کہا۔ ''ماشاءاللہ''۔ طبلے والے نے تھاپ دی۔ دونوں کی لَو مل گئی۔ بی جان نے سب سے اجازت چاہی اور وقت کا راگ بہاگ الاپنا شروع کیا۔

نوشابہ جان شاہی گائیک اُستاد تان رس خاں کے بیٹے اُستاد امراؤ خاں کی شاگرد ہیں۔ بھمیری آواز، درو دیوار سے سُر برسنے لگے۔ الاپ ختم کر کے بلمپت خیال ''کیسے سکھ سوں'' چار دم کے تلواڑے میں گایا۔ سب نے ان کے دم سانس کی تعریف کی۔ اس کے بعد درت خیال ''اب رے لالن میکو'' تین تال میں سنایا۔ ایک تان آتی اور ایک

جاتی۔ کسی نے مومن خاں کا شعر پڑھا......

اس غیرت ناہید کی ہر تان ہے دیپک
شعلہ سالپک جائے ہے آواز تو دیکھو

بی جان آداب بجالائیں۔ بولیں۔

"بزرگوں کا صدقہ ہے۔ یہ گائیکی خاص دلی کی ہے۔ اگر اجازت ہوتو بادشاہ کی دو ایک بندشیں سناؤں۔"

سامعین نے کہا۔ "نیکی اور پوچھ پوچھ؟ ضرور سنایئے۔"

بی جان نے بہادر شاہ ظفرؔ کا بنایا ہوا باگیسری بہار کا خیال سنایا......

رت بسنت میں اپنی امنگ سوں
پی ڈھونڈن میں کسی گھر سوں
رت بسنت میں......
ملے تو لال گروا لگالوں
پاگ بندھاؤں پیلی سرسوں
رت بسنت میں......
رنگ ہے سبزہ نرگسی یاں کا
کہے شوق رنگ، رنگ ہے واکا
ان بھیدن کو کوئی نہ جانے
واقف ہوں میں واکی جڑ سوں
رت بسنت میں......

سب نے تعریف کی کہ واقعی میں شوق رنگ کی بندشیں سب سے الگ ہیں۔ بادشاہ موسیقی کے بھی بادشاہ تھے۔ ایک صاحب نے فرمائش کر دی کہ تان رس خاں کا درباری کا وہ ترانہ بھی سنا دیجئے جس سے انہوں نے کدو سنگھ پکھاوجی کو نیچا دکھایا تھا۔ بی جان نے اپنے دادا اُستاد کا ترانہ "تانانانانانانا بیابیا، یارمن" سنایا، اور اتنا تیار کہ ساری

محفل عش عش کر اٹھی۔

اُستادی گانے کے بعد ٹھمری اور دادرے کی فرمائش ہوئی۔ بی جان نے کھماچ کی ٹھمری شروع کی ''ناہیں پرت مُئی کو چین۔''

ایک صاحب بولے۔ ''اگر زحمت نہ ہو تو بتایئے بھی۔''

اب جو بی جان نے اس کے بھاؤ بتانے شروع کئے تو محفل تڑپ تڑپ اٹھی۔ دادرا ''موری بندیا چمکن لاگی۔ بھی اسی انداز سے گایا۔ آخر میں مرزا غالب کی غزل......

دل سے تری نگاہ جگر تک اُتر گئی

......سنانی شروع کی۔ جب اس شعر پر پہونچیں......

وہ بادۂ شبانہ کی سر مستیاں کہاں
اُٹھئے بس اب کہ لذّتِ خوابِ سحر گئی

......تو ایک بزرگ نے دونوں زانو پیٹ کر کہا۔ ''ہے، ہے!''

اور جب مقطع سنایا......

مارا زمانے نے اسداللہ خاں تمہیں
وہ ولولے کہاں، وہ جوانی کدھر گئی

تو ان بزرگ کی حالت غیر ہو گئی۔ آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور منہ پر رومال ڈال کر سسکیاں لینے لگے۔ انہیں دیکھ کر ساری محفل افسردہ ہو گئی۔

بی جان نے خادم کو اشارہ کیا۔ ''چائے لاؤ''۔ اور اپنی جگہ آکر بیٹھ گئیں۔ قریب بیٹھنے والوں نے کہا۔

''نوشابہ بائی، آج تو تم نے غضب کر دیا۔ کہتے ہیں کہ گانا چلتا ہوا جادو ہے۔ تم نے اس کہاوت کو سچ کر دکھایا۔''

بائی جی نے کہا۔

''یہ آپ لوگوں کا حسن سماعت اور اللہ کا کرم ہے۔''

خشک میوے اور تازہ پھلوں کے تھال آنے لگے۔ چائے آئی اور بی جان

نے سب کو خود پیالیاں بنا بنا کر دیں۔ پھر وہی قہقہے چہچہے شروع ہو گئے۔۔ رات گئے محفل برخاست ہوئی۔ یہ ۱۹۳۰ء کی ایک یادگار محفل تھی جس کا نہایت مختصر آنکھوں دیکھا حال پیش کیا گیا۔

موتی جان پاکستان بننے کے بعد لاہور چلی آئیں۔ چند سال ہوئے ان کا انتقال ہوگیا۔ نوشابہ بائی دلی ہی میں ہیں۔ گوشہ گیری اور گمنامی کی زندگی بسر کر رہی ہیں۔ جب دلی اجڑ گئی تو اس کی محفلیں کیسے آباد رہتیں؟

ان کے جانے سے یہ کیا ہوگئی گھر کی صورت
نہ وہ دیوار کی صورت ہے، نہ در کی صورت

مشہور گانے والیوں میں امیر جان پانی پت والی، کالی جان، کیٹی جان، شمشاد بائی، اللہ دی غازی آباد والی، نواب تتلی۔ محبیدن بائی اور کئی اونچے درجے کی گانے والیاں تھیں جن کے ہاں شرفاء کی مخصوص نشستیں ہوتی تھیں۔ جب باہر بلائی جاتیں تو ہزار روپے روزانہ پر جاتی تھیں اور آئے دن ریاستوں اور رئیسوں میں بلائی جاتی تھیں۔ یہی ان کے تموّل کا راز تھا۔

ان میں سے دو ایک کو چھوڑ کر باقی سب شکل وصورت کے اعتبار سے واجبی واجبی ہی سی تھیں۔ مگر گانے کے وقت یہ معلوم ہوتا تھا کہ اِندر کے اکھاڑے کی پریاں زمین پر اتر آئی ہیں۔ کیٹی جان کا رنگ کالا تھا مگر نور کا گلا پایا تھا۔ شامت اعمال ایک دن سبز رنگ کی ساڑی پہنے لال کنویں سے گزریں تو ایک کرخندار نے آوازہ کسا۔

''ابے شابو، دیکھ ریا ہے لونگی کیری کو؟''

یہ پھبتی ایسی چپکی کہ چپک کر رہ گئی اور بی جان بھی اس پر جھوم گئیں۔

○○

بسنت کی بہار

دِلّی والوں کی ایک مثل ہے ''تمھیں کچھ بسنت کی بھی خبر ہے؟'' انتہائے بے خبری کے موقع پر یہ مثل بولی جاتی ہے۔ یعنی موسم پلٹ گیا، رت بدل گئی، زمین آسمان بدل گئے، مگر آپ کو ان کی کچھ خبر ہی نہیں، کانوں میں تیل ڈالے اور آنکھوں پر ٹھیکری رکھے بیٹھے ہیں! غضبِ خدا! ایسی بھی کیا بے خبری؟ مرزا غالبؔ نے ایسی ہی بے خبری، بے اعتنائی، بے نیازی کی شکایت کی ہے......

بے نیازی حد سے گزری بندہ پرور کب تلک
ہم کہیں گے حالِ دل، اور آپ فرمائیں گے ''کیا؟''

بسنت رُت آئی اور جاڑے سے ٹھٹھری ہوئی دُنیا جیسے انگڑائی لے کر جاگ پڑی، غنودگی کا طلسم ٹوٹ گیا اور ہر شے میں ایک جان سی پڑ گئی۔ ننگے بُچے کالے کلوٹے درختوں نے اپنی کالی کالی کینچلیاں اتارنی شروع کر دیں اور سبز پوشاکیں پہننے لگے۔ جوشِ نمو سے ٹہنیوں میں کونپلیں پھوٹنے لگیں، اور دیکھتے ہی دیکھتے ہرے ہرے پتوں سے سارے درخت لد گئے۔ پوَن کے نرم نرم جھونکوں کے ساتھ درختوں نے جھوم جھوم کر تالیاں بجانی شروع کر دیں۔ زندگی اور مسرت کا آج بڑا خوشنما سنجوگ ہوا ہے، پھولوں نے خوشبوؤں کے قرابے لُنڈھا دیے ہیں اور پرندوں نے اس معطر فضا میں اپنے بیشمار نغمے بکھیر دیے ہیں۔ کیوں نہ ہو! آج بہار نے خزاں پر فتح پائی ہے۔ یہ جشن بہاراں ہے جبھی تو چاروں طرف قہقہے اور چہچہے گونج رہے ہیں۔ ایک سیلابِ نغمہ ہے، ایک طوفانِ

سرخوشی ہے جس میں ہر چیز گا رہی ہے، ہر چیز ناچ رہی ہے، فطرت نے بھی آج اپنا بوقلموں جوڑا پہن لیا ہے۔ بہار نے فطرت کا حسن نکھار دیا ہے......

پھر اس انداز سے بہار آئی
کہ ہوئے مہر و مہ تماشائی
دیکھو اے ساکنان خطۂ پاک
اس کو کہتے ہیں عالم آرائی
کہ زمیں ہو گئی ہے سرتاسر
روکشِ سطحِ چرخِ مینائی
سبزے کو جب کہیں جگہ نہ ملی
بن گیا روئے آب پر کائی
سبزہ و گل کو دیکھنے کے لئے
چشمِ نرگس کو دی ہے بینائی
ہے ہوا میں شراب کی تاثیر
بادہ نوشی ہے باد پیمائی

دن گزرتے رہتے ہیں۔ مہینے گزرتے رہتے ہیں۔ شب و روز کا رقص جاری رہتا ہے اور پھر سال گھومتا گھامتا ایک خاص نقطے پر لوٹ آتا ہے، یہی اس کا نقطۂ عروج ہوتا ہے۔ فطرت اپنی تجدید کرتی ہے۔ اپنی زندگی کا ثبوت دیتی ہے۔ انسان فطرت کا معصوم بچہ، اس جشن بہاراں میں سب کچھ بھول جاتا ہے۔ سرمدی نغمے سن کر مست و بیخود ہو جاتا ہے، زندگی کا دکھ حرف غلط کی طرح مٹ جاتا ہے۔ سرمدی نغموں میں لپٹی ہوئی کائنات نشاط و سرخوشی میں رقص کرنے لگتی ہے۔

کائنات تاریکی کے پردے میں لپٹی سو رہی تھی۔ گہرے اندھیرے فضا پر چھائے ہوئے تھے۔ کہرے نے اپنے شبنمی پردے روئے زمین پر تان رکھے تھے۔ سناٹا اور ہو کا عالم۔ رات بھر جاگنے کے بعد ستاروں کی آنکھیں جھپک چلی تھیں کہ

مشرق سے ایک سنہری کرن نے جھانک کر دیکھا اور اپنی ہمجولیوں کو ساتھ لے کر آگے بڑھی۔ اس چمکیلے جھرمٹ کے آگے اندھیرا سمٹنے لگا۔ کائنات نے انگڑائی لی۔ مشرق میں شہاب پھیلا، شبنم نے کلیوں کا منہ دھلایا۔ نسیم نے گدگدایا، پھول کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ چمن میں صوت ہزار گونجی۔ ایک نئی زندگی ہمہمانے لگی۔ نسیم سحر کے ایک معطر جھونکے نے نوید بہار سنائی۔

بہار نے زندگی میں سرخوشی گھول دی ہے۔ غم و اندوہ کافور ہو گئے، دلوں کی کدورت دھل گئی۔ درودیوار سے نغمے پھوٹ رہے ہیں۔ فضا میں گلاب حل ہو رہا ہے، خشک بنجر زمین کا سینہ جوشِ نمو سے پھٹا جا رہا ہے۔ سبزہ لہک رہا ہے، چمن مہک رہا ہے۔ بہار کی دیوی آج سبزہ روندنے نکلی ہے۔ شاعر کے دل میں ایک نئی امنگ پیدا ہو رہی ہے۔ اس کی آنکھوں کے آگے سبزے کا فرش پھیلا ہوا ہے۔ جنگل میں منگل ہو رہا ہے۔ شہر کی ہنگاموں بھری زندگی نے اسے اداس کر دیا تھا۔ اس نشیلی رُت نے اس کے دل کا کنول کھلا دیا۔ نغمہ دل سے اٹھ کر لبوں پر آتا ہے اور یوں فضا میں بکھرنے لگتا ہے......

پھر چراغ لالہ سے روشن ہوئے کوہ ودمن
مجھ کو پھر نغموں پہ اُکسانے لگا مرغ چمن
پھول ہیں صحرا میں یا پریاں قطار اندر قطار
اودے اودے، نیلے نیلے پیلے پیلے پیرہن
برگِ گل پر رکھ گئی شبنم کا موتی بادِ صبح
اور چمکاتی ہے اس موتی کو سورج کی کرن

یہ نغمہ ہوا میں ابھی لرز ہی رہا تھا کہ دھانی اور بسنتی جوڑے پہنے، ہاتھوں میں پیلی سرسوں کے گڑوے لئے ہنستی بولتی، گاتی گنگناتی، اینڈتی اِٹھلاتی، اہلی گہلی پھرتی سہیلیوں کا ایک پرا آن پہونچا۔ سہانی رُت نے ان کے دلوں کو گدگدایا ہے۔ قہقہے، چہچہے بہار زندگی کا رسیلا نغمہ ہی تو ہیں۔ دلی کے آخری بادشاہ کا بنایا ہوا بہار کا خیال فضا میں گونج رہا ہے......

سکل بن پھول رہی سرسوں

اموامورے، ٹیسو پھولے

کوئل کوکت ڈار ڈار اور

گوری کرت سنگھار

مالینا گڈوا لے آئی کرسوں

سکل بن پھول رہی سرسوں

طرح طرح کے پھول لگائے

لے گڈوا ہاتھن میں آئے

نظام الدین کے دروازے پر

آون کہہ گئے عاشق رنگ اور

بیت گئے برسوں

سکل بن پھول رہی سرسوں

اور ایک رند سرمست گھر کی چار دیواری سے نکل کر فطرت کی رنگین آغوش میں پہونچ جانا چاہتا ہے۔ نکہت و نور کی بارش ہو رہی ہے اور زندگی کو حیات تازہ مل رہی ہے۔ زمانے کے ستائے ہوئے کو بہار سکون و راحت کا پیام دے رہی ہے۔ اس نے بہت دکھ اٹھائے ہیں، آغوش فطرت ہی میں اسے سکھ مل سکتا ہے......

چلتے ہو تو چمن کو چلئے، کہتے ہیں کہ بہاراں ہے

پات ہرے ہیں، پھول کھلے ہیں کم کم بادو باراں ہے

رنگ ہوا سے یوں ٹپکے ہے جیسے شراب چواتے ہیں

آگے ہو میخانے کے نکلو، عہد بادہ گساراں ہے

دل ہے داغ، جگر ہے ٹکڑے، آنسو سارے خون ہوئے

لوہو پانی ایک کرے یہ عشق لالہ عذاراں ہے

مگر آج ٹوٹے ہوئے دل جڑ رہے ہیں۔ چشم خونابہ بار میں سرخ آنسو نہیں

ہیں۔ رندی و سرمستی کے گلابی ڈورے ہیں۔ آج تو لالہ کے دل کا داغ بھی سویدائے بہار بن گیا ہے، چشم محبوب کا سرمہ دنبالہ دار ہے جسے دیدۂ نرگس حیرت سے تک رہی ہے۔ سنبل و ریحاں گیسوئے فطرت سنوار رہے ہیں۔ عروس بہار کی مانگ میں شبنم کی افشاں چنی ہوئی ہے۔ کھیتوں میں سرسوں پھولی ہے۔ سرسوں کے پیلے پیلے پھول تا حد نگاہ پھیلے ہوئے ہیں۔ آج زمین نے اپنے خزانے اگل دئے ہیں یا کاروان بہار اشرفیوں کی بکھیر کرتا ادھر سے گزرا ہے۔ دولت زر بکھری پڑی ہے جس کا جی چاہے اس سے اپنی جھولیاں بھر لے۔ آج صلائے عام ہے۔ سب کی آنکھوں میں سرسوں پھولی ہے۔ آج دھرتی کے ہاتھ پیلے ہوئے ہیں۔ سہاگ گھوڑیاں گائی جا رہی ہیں......

اری اے ری آج نئی دلہن
دھرتی بن بیٹھی
میگھ دولہا بیاہنے آیا
اری اے ری آج نئی دلہن
اندر کے نقارے باجے
بوندن کا سہرا ساجے
نگر نگر کے بدرا براتی
اری اے ری آج نئی دلہن

دھرتی نے ریت کا بسنتی جوڑا پہنا ہے، آم میں بور آیا ہے۔ مور جھنگار رہے ہیں۔ کوئل نے اپنا نغمہ چھیڑا ہے۔ پپیہا پی کہاں کی رٹ لگا رہا ہے۔ بن میں ٹیسو پھولے ہیں۔ فطرت نے سولہ سنگھار کئے ہیں۔ نک سک سے درست ہو کر دلہن بن گئی ہے، باغوں میں رنگ برنگ کے پھول کھلے ہیں۔ مالن نے گڈوے سجائے ہیں۔ ننھے ننھے پیلے پیلے پھول ان میں ایسے کھلے ہیں کہ انہیں دیکھ کر آنکھوں میں تراوت آتی ہے۔ یہ سرسوں کھلائی ہے یا ہتھیلی پر سرسوں جمائی ہے؟ دیر کا یہاں کام نہیں۔ کب سے اس سہانی رُت کا انتظار تھا۔ اس کا ایک ایک لمحہ دولت بیدار ہے۔

مگر بہار کی شادابی نے دلوں کے زخم بھی ہرے کر دئے ہیں۔ اس خوشی کے لمحے میں کسی کے دل کا روگ بڑھ گیا ہے۔ ورنہ اس من موہنی فضا میں یہ بروگ کی آواز کیسی؟ ہونہ ہو یہ کوئی کرموں جلی ہے۔ اس کا من اداس ہے، اسے کسی کی تلاش ہے۔ جوگیا کپڑے پہنے، انگ بھبوت ملے یہ کون بروگن ہے؟ اس کے چہرے پر زردی کھنڈی ہوئی ہے یا سرسوں کے پیلے پھولوں کا عکس پڑ رہا ہے؟ اوہو! یہ تو جوگن ہے جو اپنے پی کی تلاش میں گھر سے نکلی ہے۔ ذرا سنو تو اکتارے پر یہ کیا گاتی چلی آتی ہے۔ باگیری بہار میں بادشاہ کا گانا گاتی اور دلوں کو برماتی ہے.....

رُت بسنت میں اپنی اُمنگ سوں
پی ڈھونڈن میں نکسی گھر سوں
رُت بسنت میں اپنی اُمنگ سوں
ملے تو لال گروا لگا لوں
پاگ بندھاؤں پیلی سرسوں
رت بسنت میں اپنی اُمنگ سوں
رنگ ہے سبزہ نرگس یاں کا
کہے شوق رنگ رنگ ہے واکا
ان بھیدن کو کوئی نہ جانے
واقف ہوں میں وا کی جر سوں
رُت بسنت میں اپنی اُمنگ سوں

ادہر اس کا یہ حال، ادہر وہ بھی پردیس میں نڈہال۔ ایسے سمے میں پردیس! بھلا کسے چین آ سکتا ہے؟ فلک کج رفتار من مانی کئے جاتا ہے۔ یہ اپنا بِس گھولے جاتا ہے، اسے دوری و مجبوری ہی بھاتی ہے۔

کسی کا اُسے عیش بھاتا نہیں
یہ دو دِل کو یکجا بٹھاتا نہیں

دو دلوں میں بجوگ پڑ گیا جبھی تو اداسی کا پیلا رنگ چڑھ گیا۔ زخمی دل کا نغمہ پُرشکستہ پرندے کی طرح پھڑ پھڑا رہا ہے۔

یہ جشن بہاراں ہے۔ اس میں افسردہ خاطروں کے لئے جگہ نہیں ہے۔ زندگی میں غم روزگار ہی کیا کم ہے کہ غم جاناں بھی اپنی جان کو لگا لیا جائے؟ یہ جشن تو غم کو بھلانے کے لئے منایا جاتا ہے۔ فضا کو دیکھو، اس میں غم کی سیاہی نام کو نہیں ہے۔ صرف تین رنگوں کا امتزاج ہے۔ دھانی، بسنتی اور گلابی۔

آج زندگی گا رہی ہے اور کھلکھلا رہی ہے۔ فطرت مسکرا رہی ہے، اور اس کا حسین تبسم روح کائنات بن کر طاری و ساری ہو گیا ہے۔ مگر عشق کی نیرنگیاں بھی عجیب ہیں۔ پھولوں کے گجروں میں آنسوؤں کی لڑیاں لپٹی ہوئی ہیں۔ فطرت کی رعنائیوں نے دلوں کی ٹیسوں کو تیز تر کر دیا ہے۔ محبوب کی یاد کو نیشتر بنا دیا ہے۔ یہ چبھن بھی نغمے کا روپ دھار رہی ہے۔ غم کے چہرے پر بھی خوشی کا غازہ مل دیا ہے۔ بسنت نے جذبات کو کچھ اور ہی رنگ دیا ہے۔

لیکن فطرت کا تماشائی عام جذبات سے بے نیاز ہے۔ فطرت کی رنگینی اس کی عزیز ترین شے ہے۔ سرسوں کے لہلہاتے تختے، بن میں جھومتے ٹیسو کے پھول، کوئل کی رسیلی کوک، پپیہے کی میٹھی میٹھی ہوک، جہاں تک نظر جاتی ہے، ہریاول ہی ہریاول ہے۔ وہ تو ان ہی مناظر جمیل کا رسیا ہوتا ہے۔ وہ ایک ایسا تماشائی ہے جو فطرت کی رنگینیوں کو آنکھوں سے دیکھتا ہے اور دل میں جذب کر لیتا ہے، اور اس کی روح رنگین ہوتی چلی جاتی ہے اور پھولوں کی خوشبو میں بس کر معطر ہو جاتی ہے، اور یہ رنگین و معطر روح نت نئے نغمے بن بن کر فضا میں رنگ و خوشبو بکھیرتی رہتی ہے......

ہوا خیمہ زن کاروان بہار
ارم بن گیا دامن کوہسار
گل و نرگس و سوسن و نسترن
شہید ازل لالہ خونیں کفن

جہاں چھپ گیا پردۂ رنگ میں
لہو کی ہے گردش رگ سنگ میں
فضا نیلی نیلی، ہوا میں سرور
ٹھہرتے نہیں آشیاں میں طیور
ذرا دیکھ اے ساقی لالہ فام
سناتی ہے یہ زندگی کا پیام

موسم اور زندگی میں اتنی بڑی تبدیلی آجائے اور دلی کے دل والے اس کا کوئی اثر نہ لیں! بھلا یہ کیسے ممکن ہے؟ دیکھئے جگہ جگہ دلی کے بزرگوں کے مزاروں پر **بسنتیں** شروع ہوگئیں۔ دلی کے پیشہ وروں اور کاریگروں کو تو اللہ ایسا موقع دے کہ کام کاج چھوڑ سیر سپاٹے کو نکل جائیں۔ دل بہلاوے کا کوئی موقع ہاتھ آجائے۔ ویسے بھی اس شہر میں آٹھ دن اور نو میلے رہتے تھے۔ بائیس خواجہ کی چوکھٹ عجب برکتوں کا شہر تھا۔ اپنے تو صرف دو ہی تہوار تھے۔ میٹھی عید اور سلونی عید۔ لہٰذا انہوں نے ہندوؤں کی دیکھا دیکھی ان ہی سے ملتے جلتے تہوار بنا لئے۔ رت جگا، بیوی کی صحنک آخری چہار شنبہ۔ حضرت خواجہ بختیار کاکی کا عرس، سلطان جی کی (بڑی) سترھویں، حضرت امیر خسروؒ کی (چھوٹی) سترہویں، مدار صاحب کی چھڑیاں، حضرت خواجہ معین الدین چشتی کی میدنی۔ رجب میں مردوں کی تبارک، جاتے جاڑوں میں بسنتیں۔

بسنت کا موسم وہی ہوتا ہے جو بہار کا۔ ہندو اپنے دیوتاؤں کے مندر میں سرسوں کے پھول چڑھاتے ہیں۔ مسلمانوں نے بھی اپنے بزرگوں کے مزاروں پر عقیدت کے پھول چڑھانے شروع کر دئے۔ دلی میں کئی جگہ بسنت چڑھتی تھی۔ آج بھولو شاہ کی بسنت ہے تو کل رسول نما کی۔ کبھی ہرے بھرے صاحب کی بسنت ہے تو کبھی شاہ بڑے کی۔ کبھی سلطان جی کی بسنت ہے کبھی حضرت ترکمان کی۔ ان بزرگوں کے علاوہ بعض قوالوں اور گائیکوں نے اپنے نامی گرامی باپ دادا کے مزاروں پر بھی بسنت چڑھانی شروع کردی تھی۔ غرض دلی میں بیسیوں جگہ بسنت چڑھتی تھی اور خوب رونق ہوتی تھی۔

بسنتوں کا کوئی اعلان نہیں ہوتا کہ کب اور کس جگہ بسنت ہوگی مگر سب کو خبر ہو جاتی تھی اور ہر بسنت میں سینکڑوں آدمی شریک ہوتے تھے۔ ہوتا یہ تھا کہ عصر کی نماز کے بعد درگاہ کے متولی یا خادم صاحب ختم پڑھتے اور شیرینی تقسیم کرتے۔ پھر پھولوں کی چادریں چڑھائی جاتیں۔ مزار کے پائیں میں سرسوں کے پھول اور گڈوے رکھے جاتے۔ اس کے بعد قوالی ہوتی۔ فرط عقیدت سے طوائفیں بھی اپنے ناچ گانے کا ہنر دکھانے آجاتیں، ان کی وجہ سے اور خلقت ٹوٹ پڑتی۔ تیسرے پہر ہی سے سودے والوں کی دکانیں لگ جاتیں۔ گیس کے ہنڈوں سے رات کا دن بن جاتا۔ شام کے جھٹ پٹے کے بعد ہجوم بڑھنا شروع ہوتا یہاں تک کہ رات ڈھلے تک تل دھرنے کی جگہ نہ رہتی۔ دلی کے منچلوں نے عقیدت کے ان اجتماعوں کو بھی دل بہلانے کا ایک ذریعہ بنا لیا۔ جب طوائفیں ناچنے اور گانے کھڑی ہوتیں تو اُنہیں ہجوم کے مختلف گوشوں سے بیل کے روپے اور نوٹ دکھائے جاتے اور رنڈیاں لانگتی پھلانگتی اُنہیں لینے جاتیں۔ بیل دینے میں مقابلہ اور مسابقت جب شروع ہو جاتی تو سینکڑوں کے وارے نیارے ہو جاتے، یہ لکھ لٹ۔ گھر پھونک تماشہ دیکھنے والے بھلا کب باز آنے والے ہیں؟ جس نے دیا ہے تن کو وہی دے گا کفن کو، غرض **بسنتوں** میں وہ ہنگامہ اور دھماچوکڑی ہوتی کہ اس ہڑبوم میں بھلے آدمیوں نے شریک ہونا چھوڑ دیا تھا۔ حضرت سلطان جی کی درگاہ کے صحن میں اور حضرت امیر خسرو کے مزار کے سامنے بھی رنڈیاں ناچا کرتی تھیں۔ خواجہ حسن نظامی کو اللہ کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے، انہوں نے اس خرافات کو ختم کرایا مگر شہر میں یہ سلسلہ ۱۹۴۷ء تک جاری تھا۔

ہم نے اس کی ٹوہ لی کہ آخر یہ بسنتیں چڑھانے کا دستور کہاں سے شروع ہوا تو دلی کے عاشق زار واحدی صاحب کا ایک نوشتہ ہمیں ملا۔ واحدی صاحب کوئی بات بغیر تحقیق کے نہیں لکھتے، اس لئے......

مستند ہے اُن کا فرمایا ہوا

فرماتے ہیں۔ ''حضرت سلطان المشائخ کی بہن کے پوتے خواجہ سید تقی الدین

نوح دِق کے مرض میں مبتلا رہ کر داغ مفارقت دے گئے تھے، حضرت سلطان المشائخ اس سے بے حد متاثر تھے۔ مخلص مرید طرح طرح سے ان کا غم غلط کرنا چاہتے تھے لیکن کامیابی نہ ہوتی تھی۔ ایک روز ہندوؤں کی خانقاہ کے پاس سے ہندوؤں کا ہجوم ہاتھوں میں سرسوں کے پھول لئے نکلا، یہ کالکاجی جارہے تھے۔ اس منظر نے حضرت امیر خسروؒ کے دماغ میں پیر کو ہنسانے کی تدبیر پیدا کردی۔ حضرت امیر نے بھی سرسوں کے پھول اٹھا لئے اور حضرت سلطان المشائخ کے گھر کا رستہ لیا۔ راستے میں خواجہ محمد امام اور خواجہ سید موسیٰ اور امام احمد ایازمل گئے۔ وہ بھی ساتھ ہوگئے۔ گھر پر معلوم ہوا کہ حضرت سلطان مشائخ خواجہ سید نقی الدین نوح کی قبر کے نزدیک کوشک لال والے گنبد میں تنہا بیٹھے ہیں اور حضرت کا خادم مبشر گنبد کے دروازے پر کھڑا ہے۔ یہ جماعت وہاں حاضر ہوئی۔ حضرت سلطان المشائخ ایک چھر پر تشریف فرماتھے۔ سر جھکا رکھا تھا اور نگاہ زمین پر تھی۔ حضرت امیر نے خواجہ سید محمد امام کو اشارہ کیا اور اپنی ٹوپی ذرا ٹیڑھی کرلی اور رقص کے انداز میں جھومنا شروع کیا۔ حضرت سلطان المشائخ مسکرائے اور بولے۔ ''کیا ماجرا ہے؟'' حضرت امیر نے جھٹ بڑھ کر سرسوں کے پھول قدموں میں ڈال دئے اور کہا کہ......

''عرب یار توری بسنت منائی۔''

آج ہندو اپنے بُت پر بسنت کے پھول چڑھانے جارہے ہیں، میں بھی اپنے بت پر پھول چڑھانے لایا ہوں۔'' اس کے بعد حضرت امیر نے یہ شعر پڑھا......

''اشک ریز آمد و ابر بہار
ساقیا گل بریز بادہ بیار''

خواجہ سید محمد امام اور خواجہ سید محمد موسیٰ نے بھی حضرت امیرؒ کے ساتھ گانے میں شرکت کی، حضرت سلطان المشائخ محظوظ ہوئے۔ حضرت سلطان المشائخ خود بار بار فرماتے......

اشک ریز آمدو ابر بہار

تینوں نے دوبارہ اس شعر کی تکرار شروع کردی۔

حضرت خاموش کھڑے رہے، پھر خانقاہ واپس آئے اور حضرت امیر سے پوچھا "گھر جاؤ گے یا میرے ساتھ چلو گے؟"

حضرت امیر نے برجستہ عرض کیا......

نہ خفت خسرو مسکیں ازیں ہوس شبہا

کہ دیدہ برکف پایت نہد بخواب شود

"غریب خسرو نے اس آرزو میں متواتر تین راتیں جاگ کر کاٹی ہیں کہ حضور کے تلووں سے آنکھیں ملوں تب سوؤں۔"

اس دن سے ۱۹۴۷ تک یہ بسنت اسی طرح منتی رہی۔

بسنت پنچمی کی شام کو ٹھیک چار بجے اسی جگہ حضرت سلطان المشائخ کے نام لیوا جمع ہوتے تھے اور قوال یہی گاتے تھے......

"عرب یار توری بسنت منائی"

......اور......

اشک ریز آمد و اَبرِ بہار

ساقیا گل بریز بادہ بیار

کالکا میں ہندو اور درگاہ حضرت سلطان المشائخ میں مسلمان ایک ہی دن بسنت کے میلے کی ابتدا کرتے، پھر ساری دلی پر بسنت چھا جاتی۔ کون تھا جو بسنت سے بے خبر اور بے تعلق رہتا؟ لڑکپن میں سوئی والوں اور شاہ بڑے اور کوٹلہ فیروز شاہ کی بسنتیں میں نے بھی دیکھی ہیں اور بڑھاپے میں یہ تاریخی بسنت دیکھنے جایا کرتا تھا۔

درگاہ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی اور درگاہ حضرت نصیر الدین چراغ دہلی میں بھی بسنت پہلے ہی دن درگاہ حضرت سلطان المشائخ کے ساتھ منائی جاتی تھی۔ دلی کی دوسری درگاہوں میں بعد میں منتی رہتی تھی۔

وہ گنبد تو باقی نہیں رہا جس کے اندر حضرت امیر نے سلطان المشائخ کی خدمت میں پھول پیش کئے تھے لیکن وہ پتھر موجود ہے جس پر سلطان المشائخ پھول قبول کرتے

وقت اور اس میلے میں مسلمانوں کی شرکت جائز سمجھتے وقت بیٹھے تھے۔ پہلے اس پتھر پر پھول چڑھائے جاتے اور پھر خواجہ سید تقی الدین نوح کے مزار پر۔ وہاں سے جلوس حضرت سلطان المشائخ کے مزار کے سامنے آکر کھڑا ہوتا اور وہاں سے حضرت امیر خسرو کے مزار کے سامنے۔

OO

سترھویں کی سیر

ایلو! آج چاند کی چودھویں تاریخ تو ہوگئی، سترھویں میں اب دن ہی کتے رہ گئے؟ دِلّی کے دل والوں میں سرسراہٹ شروع ہوگئی، کرخنداروں میں تو جیسے عید ہی آگئی، دلی کے یہ دستکار بڑے سیلانی جیوڑے ہوتے ہیں۔ انہیں تو اپنی ''سیل'' کے لئے کوئی نہ کوئی بہانہ چاہئے، محنت مزدوری سے تھک بھی تو جاتے ہیں، جبھی تو میلوں ٹھیلوں کی اتنی اللہ آمین کرتے ہیں، کاریگروں اور کرخنداروں میں ناویں پر جھک جھک ہو رہی ہے۔

کاریگر:۔ میاں کرخندار ناواں دلواؤ نا۔

کرخندار:۔ ابے کائے کا ناواں مانگ ریا ہے، کیا توائی ہے؟

کاریگر:۔ میاں اللہ نہ کرے توائی کیوں ہوتی میں تو اپنی دھیانگی مانگ ریا ہوں دھیانگی۔

کرخندار:۔ ابے کل ہی تو تجھے پاؤلا دیا ہے اور اس سے اگلے دن تو دھیلی لے گیا۔

کاریگر:۔ اماں تو میں اس سے کب نامکر ہو ریا ہوں؟ بازداں سترھویں کے لئے تو کچھ چیئے ہی ہوگا۔

کرخندار:۔ ابے میں نے کوئی تیرا ٹھیکہ لیا ہے کہ ہر بے جر بے ناواں ہی مانگتا رہتا ہے۔

کاریگر:۔ میاں کرخندار میں کوئی تم سے بھیک مانگ ریا ہوں؟ کوئی خیرات

زکواۃ دے رہئے ہو؟ اماں جان پیلتا ہوں صبح سے شام تلک۔

کرخندار:۔ ابے ہاں ہاں بہت دیکھے ہیں تجھ سری کے جان پیلنے والے، نئیں ہے ناواں میرے کنے۔

کاریگر:۔ کرخندار ناواں تو میں تم سے لے کر ہی جاؤں گا، سیدھی خیر سے دھر دو یہاں ورنہ۔

کرخندار:۔ چل چل، لمبا بن یاں سے، بڑا آیا سونٹیا صراف، ورنہ کا بچہ، وہ ریپٹا دوں گا کہ چودہ طبق روشن ہو جائیں گے۔

کاریگر:۔ دیکھو میاں کرخندار، میں تو تمہارا لحاظ کئے جا ریا ہوں اور تم ہو کہ ایکساں سر پر چڑھے جا رئیے ہو، یہ تمہاری اشرافیت ہے؟ ہم تو کہتے ہیں میاں جانے دو جانے دو مگر۔

کرخندار:۔ ابے اگر مگر کے بچے جاتا ہے کہ لوں پاؤں کی ہاتھ میں؟ کیوں تری کھال میں دھواں بھرا ہے، ابے دیکھیو کھوپڑی بھیک مانگتی پھرے گی بھیک۔

کاریگر:۔ بس میاں بس، بہت ہوئی، ایک ساں ٹرٹر کئے جا رئیے ہو، رکھ دو سیدھے ہاتھ سے میرا ناواں ورنہ۔

کرخندار:۔ ورنہ کیا کرے گا بے تو؟

کرخندار تھے ہتھ چھٹ، آؤ دیکھا نہ تاؤ، الٹے ہاتھ کا لپڑ رسید کر دیا۔ کاریگر پر بھی غصے کا بھوت سوار تھا۔ بڑے چھوٹے کا لحاظ بالائے طاق رکھ غب ٹیوں میں بیٹھ گیا اور دھوں دینی سے کرخندار کو دے مارا، ان کی جھک جھک بک بک سن کر جواڑوسی پڑوسی اور راہ گیر جمع ہو گئے وہ ہائیں ہائیں کر کے لپکے اور انہوں نے بیچ بچاؤ کرا دیا۔ اب کرخندار ہیں کہ کاریگر کی سات پشتوں کو کھڑے پُن رہے ہیں اور کاریگر ہے کہ برابر ترکی بہ ترکی جواب دئے چلا جا رہا ہے۔ نہ یہ ان کی سنتے ہیں اور نہ وہ ان کی، جب خوب زبانی جمع خرچ ہو چکا تو بیچ بچاؤ کرنے والوں نے دونوں کو قائل معقول کر کے گلے ملوا دیا، ایلو! گلے ملتے ہی دونوں کے دل صاف ہو گئے جیسے کچھ ہوا ہی نہیں، کرخندار نے انٹی ڈھیلی کی

اور چیکے سے کچھ نکال کر کاریگر کے ہاتھ پر رکھ دیا اور مٹھی بند کرتے ہوئے کہا:۔

''اس وخت تو یہی لے جاؤ، پھر کی پھر دیکھی جائے گی۔''

کاریگر نے بھی سوچا اس سوم سے یہ بھی مل گیا تو بہت مل گیا۔ بھاگتے بھوت کی لنگوٹی بھلی، ڈنٹر پھلائے وہاں سے اپنے گھر آئے، ڈیوڑھی میں قدم رکھتے ہی دو چار گالیاں چٹخائیں۔ گھر والوں نے جان لیا کہ بھونچال آ گیا، مگر ایک دن کا بھونچال ہو، دو دن کا، روز کا یہی وطیرہ تھا، چنانچہ کسی پر کوئی اثر نہیں ہوا، اس کان سنا اس کان اڑا دیا، ان کے ہاں تو ہر وقت در در پھٹ پھٹ ہی رہتی تھی۔

میاں رفو نے روٹی کھائی، کلہ تازہ کیا اور گھر سے نکل کر سیدھے جما مسیت پہونچ گئے، تھڑی پر سے بھاؤ تاؤ کر کے دو گز چکن اور دو گز لٹھا خریدا، بیچ بیل خریدی، پیٹن کا چمکتا ہوا پمپ خریدا، کچھ چکھا چکھی کی اور گھر لوٹ آئے، گھر والی کو کرتا پاجامہ ارجنٹ سینے کو دیا، اس غریب نے راتوں رات کرتا کھڑا کیا اور جھپا جھپ آڑا پاجامہ بھی کچا کر لیا، ادھر میاں کسی کام سے باہر گئے ادھر پڑوس میں بابو جی کے ہاں جا کر کرتے پاجامے پر مشین کا بخیہ کرلائی۔ لو اتی سی دیر میں اس نیک بخت نے کیکری کٹاؤ کا کرتا بھی تیار کر دیا اور چوڑی دار پاجامہ بھی، میاں رفو نکڑ پر خلیفہ کی دکان سے حجامت بنوا کر جب لوٹے تو حاجی احمد کی دکان سے ایک بنیان اور پھول دار موزوں کی جوڑی بھی لیتے آئے۔

تیسرے پہر سلطان جی جانا تھا، ان کا سنگھار دو گھنٹے پہلے سے شروع ہو گیا، سگندا گندھی کے ہاں سے ایک پیسے کا چنبیلی کا تیل لیا، خوب سر پر چپڑا اور جو باقی بچا منہ پر مل لیا، گندھی نے میاں جی کو خوش کرنے کے لئے خس کا ایک پھویا بھی دے دیا، میاں رفو نے خوش ہو کر پھویا کان میں لگایا اور گھر پہونچ کر آنکھوں میں سرمہ کی سلائیاں بھر بھر کر لگائیں، خاصے بھینس کے سے دیدے ہو گئے۔ پھیلا ہوا سرمہ تھوک سے پونچھا، جوزہ کی تلے دانی کھول کر مسی ملی، کتھے کا پان چبایا، پھر لاکھا جمایا، سیدھے ڈنٹر پر چھچھاتا سرخ تعویز باندھا، کرتا پہنا، اپنے ڈنٹر قبضے دیکھے، مسکرائے، نیلے ازار بند پر نظر گئی، اترائے، موزے پہن کر پمپ اڑایا، کھونٹی پر سے جھم جھماتی نیم آستین اتاری اور زیب بر کی سر پر

کھریا سے چنی ہوئی دوپلی آڑی رکھی، کندھے پر چوخانے کا رومال ڈالا، آئینہ دیکھا، خاصے نچ رہے تھے، خوش ہوکر خود اپنی بلائیں لیں، ٹھمک ٹھمک کر چلے، صحن میں آئے، بیوی کو دیکھا کہ میلی چوہیا بنی راکھ سے پتیلی مانجھ رہی ہے مگر اس کا دل باغ باغ ہے اور باچھیں کھلی جارہی ہیں کیوں نہ ہو؟ سر کی بادشاہی قائم ہے۔ سہاگ بنا ہوا ہے، دل میں بولی:۔

''حف نظر...... اللہ نظر بد سے بچائے۔''

اور جب ڈیوڑھی کے پردے پر پہونچ گئے تو بولی:۔

''خیر سے کب تلک لوٹو گے؟ میرا دھیان لگا رہے گا۔''

میاں رفو نے مسکرا کر کہا:۔

''اری کیوں مری جارئی ہے، پرسوں تو ڑی آجاؤں گا۔''

بیوی نے کہا۔

''اچھی اللہ! جیسے پیٹھ دکھا کر گئے ہیں منہ دکھا کر آنا نصیب ہو۔''

آج چاند کی سولہ ہو گئی، یوں تو دنوں پہلے سے خلقت سلطان جی کا رخ کر رہی ہے اور شہر در شہر سے لوگ کھنچے چلے آرہے ہیں مگر دلی والے آج تیسرے پہر ڈھلنے سے جانے شروع ہوتے ہیں۔ جامع مسجد پر تانگوں کی لنگتار اور بسوں کا ہجوم ہے، اُردو بازار میں کھوے سے کھوا چھل رہا ہے، چار آنے سواری عام دنوں میں جاتی تھی، آج آٹھ آنے کی آواز لگ رہی ہے، دلی کے سیلانی جیوڑوں کے لئے چار آنے کیا اور آٹھ آنے کیا؟ گدا گد گدا گد بسوں میں بھر رہے ہیں، تانگے والے روپیہ سواری بٹھا رہے ہیں، چار سواریاں بٹھائیں گے، اس سے زیادہ کی اجازت نہیں ہے، خوب سیر کراتے لے جائیں گے، یہ کیا کہ بس میں بیٹھے اور اندھے بگلوں کی طرح سلطان جی پہونچے؟ نہ کچھ دیکھا نہ بھالا، کیا خاک سیر ہوئی؟ میاں تانگے میں بیٹھو، فراٹے کی ہوا کھاؤ، دلی دروازے سے باہر تو نکلنے دو، پھر دیکھو غازی مرد کے جوہر۔ مزہ آجائے گا، اس وقت تو روپیہ سواری کھل رہی ہے مگر یہ رئیسی شان روپیہ کیا دس روپے میں بھی سستی ہے۔ کرخنداروں کی سیل تو میاں تانگے ہی میں ہوتی ہے، جھپا جھپ تانگے بھرے چلے

جار ہے ہیں، تانگے والے بھی تو آخر اسی دن کی آس مناتے ہیں۔ تیج تہوار پر تو ان کی چاندی ہوتی ہے، ورنہ روز تو ٹکے ٹکے سواری بھرتے ہیں، اور آج تو تانگے اور گھوڑے کے ٹھاٹ بھی دیکھنے کے لائق ہیں، تانگہ پر جگہ جگہ چھوٹے چھوٹے پتیلی گلدانوں میں رنگ برنگ کاغذ کے پھول اور گلدستے لگے ہوئے ہیں، یہی حال گھوڑے کے ساز کا بھی ہے۔ گھوڑے کے سر پر ایک بڑا سا طرّہ ہے، گلے میں موتیا اور گلاب کا کنٹھا پڑا ہے، اس پر ایک سلمہ ستارے کا ہار بھی پڑا ہوا ہے، یہاں سے وہاں تک تانگوں کی لین ڈوری لگی ہوئی ہے، جو تانگہ بھر جاتا ہے روانہ ہو جاتا ہے کہ جھٹ پہونچا کر دوسرا پھیرا بھی کرلے، یادگار سے نکل کر ٹھنڈی سڑک پر پہنچتے ہی سب کو ایک پھریری سی آجاتی ہے، تانگہ والا ٹٹکاری دے کر چابک چھواتا ہے کہ گھوڑا بجلی بن جاتا ہے، مگر "بس بیٹا، بس بٹیا" کر کے وہ گھوڑے کو چمکار لیتا ہے، اسے تو صرف دیکھنا تھا کہ گھوڑا کتنے پانی میں ہے۔ دُلکی ایسی چلتا ہے کہ معلوم ہو جیسے چاندی کے ورق کُٹ رہے ہوں، وہی لے اور وہی بول ہیں، چاہے کہہ کے دیکھ لو......

لب بھر آٹا، مٹھی چنے، ٹکڑا روٹی، گڑ کی ڈلی

لب بھر آٹا، مٹھی چنے، ٹکڑا روٹی، گڑ کی ڈلی

کیوں ہے نا؟ لودلی دروازہ آگیا، کوٹلے کی سڑک پر جہاں تک نگاہ کام کرتی ہے تانگہ ہی تانگہ دکھائی دیتا ہے، یا پھر رہڑیوں کی بھرمار ہے جن میں شوقین بھرے ہیں۔ یہ رہڑیاں بھی تانگوں کی طرح بجی ہوئی ہیں۔ سوت کی موٹی موٹی گنگا جمنی راسیں ہیں، گھوڑے بھی خوب تیار ہیں اور ایسے چکنے کہ مکھی بیٹھے تو پھسل جائے۔ یہ شوقینوں کے جانور ہیں، ان کی کھلائی پلائی کا بھلا کیا مقابلہ؟ چاہے خود نہ کھائیں مگر ان کو دودھ جلیبیاں ضرور ملتی ہیں، جبھی تو ذرا راسیں ڈھیلی چھوڑیں اور گھوڑوں نے ہوا سے باتیں کیں۔ ذرا اس گھوڑے کو دیکھئے، راسیں کھنچی ہوئی ہیں اس لئے گردن کمان کئے سینہ کھولے، کلائیاں مارتا عجیب شان سے چلا آرہا ہے۔ اس کو پیچھے چھوڑا، اس سے آگے نکل گیا اور ابھی رواں سے آگے نہیں بڑھا ہے۔

تانگے میں بیٹھے ہوئے ایک کرخندار نے جھرجھری لے کر کہا۔

''ابے لے ایلیے! وہ تو سب کو مارتا چلا آریا ہے، اماں آ کا دیکھ رہئے ہو۔ آ کا تڑپ کر بولے۔'' ابے او بھائی کیا سوچ ریا ہے؟ تانگہ لکال نا۔''

تانگے والے نے کہا۔ ''میاں چپکے بیٹھے رہو، کیا توائی آگئی۔''

شابو سے بھی نہ رہا گیا، بولے۔ ''پیارے خون ہو جائیں گے یہیں جو یہ آگے نکل گیا، بڑی بیٹی ہو جائے گی اپنی تو۔''

تانگے والا چمک کر بولا۔ ''اماں کیوں بے ناحق میں میرے جانور کو ہلکان کراتے ہو، جو وِن نے آگے بڑھالیا تو میری کیا لپو اُتر جائے گی؟''

کرخنداروں سے ضبط نہ ہو سکا، کلّی نے گالی دے کر کہا۔ ''پیارے، مرا کیوں جاریا ہے، لے تھام یہ روپیہ'' یہ کہہ کر جیب میں سے ایک روپیہ نکال اس کے ہاتھ پر دھر دیا۔ اس نے روپیہ ڈب میں لگا کر کہا۔ ''اچھا یہ بات ہے؟ تو لو میں بھی دیکھوں کونسا مائی کالال ہے جو مجھ سے آگے نکل جائے۔''

یہ کہہ کر اس نے راسیں ڈھیلی چھوڑیں اور دو طرفہ گھوڑے کو چابک سے جھاڑ دیا، وہ کنوتیاں دباشہ گام چلنے لگا، مگر رہڑی بھی بڑھتی چلی آرہی تھی۔

ڈکارا نے بھی ایک روپیہ نکالا اور تانگے والے کی جیب میں ڈالتے ہوئے کہا۔ ''یار ہوگا تو اس کو آگے نکلنے نہیں دے گا۔''

تانگے والے نے جواب دیا۔ ''اماں کیا رکھا ہے ان باتوں میں، جوتیاں لے لو ہاتھوں میں، وِسکی تو جنتی پر طلاق جو اسے لکل جانے دے، میں بھی اسے آج اڈھا پلا کر لایا ہوں۔ ہاں بٹیا، شاباش۔'' یہ کہہ کر ایک چابک چٹخا دیا اور تانگہ ایک جست کے ساتھ کہیں سے کہیں پہنچا۔ مگر وہ کمبخت رہڑی ہے کہ پھر بڑھی چلی آرہی ہے، اور کیا مجال جو رواں میں ذرا فرق آیا ہو، اسی آن سے پھٹ پھٹ کرتا چلا آتا ہے۔ ببر کے تکئے سے نکل کر مٹکوں والے پیڑ تک ان کا تانگہ آگے ہی رہا، پرانے قلعے سے آگے بڑھتے ہی رہڑی نے ان پر بڑھنا شروع کر دیا، سڑک ذرا بہتر آئی تو رہڑی والے نے بھی ذرا سی

ڈھیل دے کر اس کا سرا چھوا دیا۔ لو صاحب! وہ تو آندھی مینہہ کی طرح دم کے دم میں سر پہ آپہونچا، اس میں قصائیوں کی، من چلی ٹولی بیٹھی ہوئی تھی۔ یہ بھی کرخنداروں سے کچھ کم نہیں تھے، ایک نے آوازہ کسا:۔

''ہٹالے آگے سے، ورنہ ٹکڑے اڑادوں گا۔''

شابو، کلی، ڈکارا اور نبو حال سے بے حال ہوئے جارہے ہیں، تانگے والے کو ایک ساں گودے جارہے ہیں اور وہ ہے کہ گھوڑے کو رہ رہ کر سوڑ رہا ہے، مگر گھوڑا بھی دوڑے تو کہاں تک دوڑے؟ سرپٹ تو چل رہا ہے، آخر کوئی حد بھی ہے؟

لو صاحب! وہ قصائیوں کی رہڑی تانگے کے برابر آگئی، اس میں سے ایک شور اُٹھا۔ ''پیری ہے بے پیری ہے۔ ابے تھو ہے بے''

دو ایک نے پیری بجا بھی دی۔ ''ابے گدھا جوت رکھا ہے، ابے اسے تو گولی دکھاؤ۔'' اور نہ جانے کیا کیا اول فول بکتے وہ اپنی رہڑی آگے نکال لے گئے، کرخندار کلس کر گالیاں ہی بکتے رہ گئے۔

تانگے اور رہڑیاں یونہی دوڑ لگاتی نیلی چھتری تک پہونچ گئیں، یہاں تک جنگل میں منگل ہو رہا ہے، آدھی دلی یہاں موجود ہے، دائیں ہاتھ کو سڑک مڑ کر حضرت نظام الدین اولیاء کی درگاہ کو چلی گئی ہے، بائیں ہاتھ کو مڑ کر ہمایوں کے مقبرے کو جاتی ہے اور سیدھی سڑک اوکھلے کی طرف چلی جاتی ہے، دائیں طرف سڑک کے دونوں جانب عارضی دکانیں لگ گئی ہیں۔ مغرب کا جھٹپٹا ہو چلا ہے۔ چراغ روشن ہوتے جارہے ہیں۔ ان دُکانوں اور تہ بازاری میں ہمہ نعمت موجود ہے۔ بیسیوں دُکانیں بھٹیاروں اور نان بائیوں کی ہیں۔ میز کرسی کے ہوٹل ہیں۔ کباب پراٹھے اور حلوے مانڈے والے ہیں، شربت والے ہیں اور چائے والے ہیں۔ سقے کٹورے بجا بجا کر پانی پلاتے پھرتے ہیں۔ گگڑ والا ایک بڑا سا حقہ اٹھائے ایک اک کے آگے منہنال پیش کر رہا ہے۔ پینے والے دو چار کش لیتے ہیں اور پیسہ دو پیسہ دے جاتے ہیں۔ چرخی کا پنکھا چیخ چیخ کر پتہ دے رہا ہے کہ سیخ کے کباب یہاں تیار دھرے ہیں۔ دہی بڑے والے اپنے لگن سجائے

بیٹھے ہیں۔ سفید سفید دہی لال اور ہری مرچیں کاٹ کر اس طرح چھڑکی ہیں کہ انہیں دیکھ کر جی للچانے لگتا ہے۔ گرما گرم پکوان جھپا جھپ اتر رہا ہے۔ تیل کی کچوریاں منوں سے اُتر رہی ہیں اور پیاروں کے پیٹ میں جارہی ہیں۔ ان کا مزہ گرم گرم ہی کا ہے، آلو کی ترکاری کے ساتھ چاہے جتنی کھا جایئے اس وقت کچھ نہیں معلوم ہوتا، بعد کا خدا حافظ۔ پراٹھے والے یوں تو سیکڑوں ہیں مگر پشاوری کی دکان پر وہ بھیڑ ہے کہ وارہی نہیں آتا۔ اس کے پراٹھے کا ایک اک پرت سنکا ہوا ہے۔ کیا مجال جو کہیں سے بھی کچا ہو۔ سیخ کے کباب اور حلوہ بھی اس کے ہاں کا تحفہ ہوتا ہے۔ دلی والے گھر سے توشہ باندھ کر تو چلتے نہیں، سب یہیں آ کر کھاتے ہیں بلکہ پہلے کھانے سے فارغ ہو لیتے ہیں تب کہیں درگاہ میں داخل ہوتے ہیں۔

سلطان جی کی درگاہ تک دورویہ دُکانوں کا سلسلہ چلا گیا ہے۔ یہاں میٹھی کھیلوں اور پھول والوں کی دکانیں زیادہ ہیں، جو بھی درگاہ میں داخل ہوتا ہے پہلے کھیلوں کا پُڑا اور پھولوں کا دونہ بنواتا ہے۔ دروازے پر دونوں طرف دربان بیٹھے ہیں۔ یہ اصل میں دربان نہیں ہیں کفش بردار ہیں جو اپنے آپ کو صاحبزادگان یعنی سلطان جی کی اولاد میں ظاہر کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ دروازے پر جوتیوں کی حفاظت کے لئے ایک فقیر مقرر ہوتا تھا۔ خواجہ حسن نظامی نے بتایا کہ ''میرے پاس ڈیڑھ دوسو برس تک کی بعض پرانی رسیدات ایسی موجود ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ پہلے زمانے میں جوتیوں کے محافظ کو باقاعدہ تنخواہ ملا کرتی تھی اور اس کو ''چرن بردار'' کہتے تھے۔ آج کل تنخواہ نہیں ملتی۔ زائرین خود اپنی جوتیوں کی حفاظت کا معاوضہ دیتے ہیں۔ صاجزادگان میں سے صرف ایک آدمی اپنے بچپن میں کچھ دن یہاں بیٹھے ہیں۔ یعنی میرے دالد حضرت خواجہ حسن نظامی میرے دادا نے ان کو مرتے وقت وصیت کی تھی کہ ''دوسرے پیرزادوں کی طرح تم درگاہ میں کسی کے آگے ہاتھ نہ پھیلانا اور خود اپنی محنت کی روٹی کھانا۔'' چنانچہ بچپن میں محنت کا اور کوئی ذریعہ نظر نہ آیا تو خواجہ صاحب نے جوتیوں کی حفاظت کے لئے فقیر کی جگہ بیٹھنا شروع کر دیا تا کہ والد کی وصیت کے مطابق محنت کی روٹی ملے اور

بزرگوں کے نام کو بھیک کا دھبہ نہ لگے۔ یہ واقعہ خواجہ صاحب نے تفصیل سے اپنی آپ بیتی میں لکھا ہے۔ متعلقین درگاہ کی گزراوقات نذر و نیاز پر رہتی ہے۔ ابتدا میں تو یہ طریقہ تھا کہ سب خانقاہ والے درس و تدریس اور مشن کے کام میں مشغول رہتے تھے اور بے مانگے اور بغیر کسی خواہش کے کوئی کچھ دے جاتا تھا تو قبول کر لیتے تھے لیکن رفتہ رفتہ حالت بگڑتی گئی اور موجودہ حالات یہ ہیں کہ ہر روایت اور خودداری کے ہر طریقے کو ترک کر کے دست سوال دراز کیا جاتا ہے۔ حضرت سلطان جی نے تو شادی ہی نہیں فرمائی تھی۔ البتہ متعلقین درگاہ خود کو حضرت کا خواہرزادہ کہتے ہیں۔''

ہاں تو یہ چرن بردار زائرین کی جوتیوں کے جوڑے تلی سے باندھ کر رکھتے جاتے ہیں اور روپے برابر دو ٹین کے گول ٹکڑے نکال کر ایک ٹکڑے کو جوتیوں میں رکھ دیتے ہیں اور دوسرا بطور رسید زائر کو دے دیتے ہیں۔ جب آپ واپس آئیں تو ایک آنہ دے کر اپنی جوتیاں ان سے واپس لے سکتے ہیں۔ ایک ایک آنہ کر کے ان کے پاس سینکڑوں روپے آجاتے ہیں۔ ان کے پورے پورے کنبے اسی پر پلتے ہیں۔ کیوں نہ ہو صاحب! سب آپ ہی کی جوتیوں کا صدقہ ہے۔

خلقت کی وہ ریل پیل ہے کہ سلطان جی کی درگاہ کے دروازے میں سے داخل ہو کر آگے بڑھنا مشکل ہے۔ ایک سیلاب ہے کہ اندر سے باہر آرہا ہے۔ وہ دھکا پکی ہو رہی ہے کہ الٰہی توبہ!

''اماں ذرا تو ٹھہرو بندہ اللہ کے، ایکساں دھکا دیئے جاتے ہو۔''

''بھئی میں کیا کروں؟ پیچھے سے ریلا آرہا ہے۔ بہتیرا تو روک رہا ہوں۔''

کمزور کی شامت ہے، پسا جارہا ہے، دم گھٹا جاتا ہے، مگر شوق ہے کہ کشاں کشاں لئے جاتا ہے ادہر ادہر حجروں میں صوفی صافی قبضہ کئے ہوئے ہیں۔ کوئی اپنے مریدوں اور عقیدت مندوں کو توجہ دے رہا ہے، کوئی ہو حق کر رہا ہے۔ ایک صاحب ''اللہ ہو'' کی ضربیں لگا رہے ہیں۔ کہیں کسی حجرے میں قوالی کی محفل بھی جم رہی ہے۔

ایلو! یہ کھلی کھلی سی جگہ کیا آگئی۔

اماں یہ میدان نہیں ہے، باؤلی ہے باؤلی۔ جس کے بارے میں ایک روایت مشہور ہے۔ حضرت نے جب اس باؤلی کو بنوایا تو مزدور دن رات کام کرتے تھے۔ بادشاہ وقت حضور سے ناراض ہو گیا تھا۔ اس نے ان کا تیل بند کر دیا تا کہ کام میں خلل پڑے۔ مگر کہیں اللہ کے پیارے بندوں کے کام رکا کرتے ہیں؟ حضور نے فرمایا کہ اس باؤلی کا پانی چراغوں میں جلاؤ۔ اللہ کی شان، پانی تیل کی طرح جلنے لگا اور کام دن رات ہونے لگا۔

جس کسی کو بھی ذرا سا تیرنا آتا ہے وہ اس باؤلی میں ضرور نہاتا ہے۔ اوپر گنبد پر سے اس میں کودتے ہیں۔ تیراک دنادن دنادن ایک کے پیچھے ایک کودے چلے جاتے ہیں۔ سیدھی کدائی کا عام رواج ہے مگر مچھلی لگانے والے بھی کچھ کم نہیں ہیں۔ دونوں ہاتھ جوڑ کر سر کے بل ایسی مچھلی لگاتے ہیں کہ جیسے کمان سے تیر چھوٹے۔ پانی میں پہونچنے کے بعد سب کو اپنے اپنے ہنر دکھانے کی سوجھتی ہے۔ کوئی چت لگا رہا ہے کوئی پَٹ، کسی نے کھڑی لگائی تو ایسی کہ ناف تک پانی سے اُبھر آیا۔ کوئی مردے کی تیرائی تیر رہا ہے کوئی شیر کی۔ جو اناڑی ہیں وہ کتے کی تیرائی ہی میں خوش ہیں۔ غوطے لگائے جا رہے ہیں۔ اوروں کی دیکھا دیکھی یار لوگ انجان پنے میں بھی کود پڑتے ہیں اور جب ڈبکیاں کھانے لگتے ہیں تو ایک ہلڑ مچ جاتا ہے۔ کوئی تیراک لپک کر ان کے پاس پہونچتا ہے اور ان کی ناک پر ٹکر مار کر انہیں بیہوش کر دیتا ہے اور پھر اطمینان سے سیڑھیوں پر پہونچا دیتا ہے۔ جو وہ ٹکر نہ مارے تو ڈوبنے والا گھبرا کر ان کی کولی بھرے اور انہیں بھی اپنے ساتھ تہہ میں لے جائے۔

خیر انہیں تو یہیں چھوڑیئے اور بائیں ہاتھ کے گلیارے سے ہو کر آگے بڑھئے۔ آگے چل کر ایک لمبا سا چھتا پڑتا ہے، اس میں چلئے، یہ پہلے دائیں کو مڑے گا اور پھر بائیں کو۔ بڑی پرانی پرانی قبریں راستے میں پڑتی ہیں۔ ان میں سے راستہ ہو کر ایک اور دروازے پر پہونچتا ہے۔ یہ اصل درگاہ کا دروازہ ہے۔ درگاہ میں ٹھٹھ کے ٹھٹھ لگے ہیں۔ چپہ چپہ بھر زمین دو دو تین تین دن پہلے سے آ کر زائرین نے روک لی ہے۔ صحن میں

خلقت بھری پڑی ہے۔ بیچ میں درگاہ ہے جس پر نور برستا ہے۔ بائیں ہاتھ کو سنگ مرمر کے مُحجّر ہیں۔ ان میں عورتوں نے چھاؤنی چھائی ہے۔ اس طرف قبریں ہی قبریں ہیں مگر آج مُردوں کی بستی میں زندہ بھی آباد ہو گئے ہیں۔ دائیں طرف مسجد ہے جو سلطان جی کے وصال کے بعد بنائی گئی ہے۔ حضرت یہاں سے خاصے فاصلے پر رہا کرتے تھے۔ مقبرۂ ہمایوں کے گوشہ شرق وشمال میں حضرت کی خانقاہ کے کھنڈر اب بھی موجود ہیں۔ اس خانقاہ میں کتب خانے کے برابر، جس میں حضرت کا وصال ہوا تھا، وہ چھوٹا سا حجرہ صحیح سالم ہے، جس کو حضرت کا چلہ یا عبادت گاہ کہا جاتا ہے۔ موجودہ درگاہ کے قریب حضرت نے اپنی زندگی میں چبوترے بنوائے تھے جن کو ''چبوترۂ یاراں کہا جاتا ہے۔ یہ گویا قبرستان تھا جہاں حضرت کے مرید اور اقرباء اور احباب دفن کئے جاتے تھے۔ حضرت بھی کبھی کبھی یہاں فاتحہ پڑھنے تشریف لایا کرتے تھے۔ اس بات کو دیکھ کر عقیدت مندوں نے حضرت کے مدفن کے لئے یہاں عمارتیں بنانی شروع کر دیں۔ چنانچہ روایت ہے کہ موجودہ مسجد کا گنبد بھی اسی مقصد کے لئے تعمیر ہوا تھا۔ جب حضرت کا آخر وقت آیا تو لوگوں نے پوچھا کہ ''آپ کے واسطے متعدد عمارتیں تعمیر کی گئی ہیں، آپ ان میں سے کس میں آرام کرنا پسند فرمائیں گے؟''

حضرت نے جواب دیا کہ ''میں ان میں سے کسی عمارت میں دفن ہونا نہیں چاہتا مجھے آسمان کا گنبد کافی ہے۔'' چنانچہ یہ گنبد مسجد میں تبدیل کر دیا گیا۔ حضرت کا روضہ بعد کی تعمیر ہے اور موجودہ بست دری تو شاہجہاں کے زمانے میں جا کر بنی تھی۔

روضے کے جنوب میں بڑی خوشنما سنگ مرمر کی جالیاں ہیں۔ ان میں سے جھانک کر اندر دیکھئے تو سنگ مرمر کی قبریں دکھائی دیتی ہیں یہ جو سامنے قبر ہے محمد شاہ بادشاہ دہلی کی ہے۔ یہ وہی محمد شاہ ہیں جو ''رنگیلے پیا'' کہلاتے ہیں، اور جن کی رنگ رلیاں یہ رنگ لائیں کہ دلی کی گلیلوں میں نادرشاہ نے ٹخنوں ٹخنوں خون کی ندیاں بہا دیں۔ ان کے مجر کے پہلو میں سے ایک راستہ اور اندر کو کٹتا ہے۔ دو تین سیڑھیاں چڑھ کر اس میں داخل ہونے پر کھلی کھلی سی جگہ آجاتی ہے جس میں چند قبریں ہیں۔ دائیں

پہلو میں ایک بڑی خوشنما درگاہ ہے جس پر چھاجوں نور برس رہا ہے۔ زائرین کا تانتا بندھا ہوا ہے۔ آپ سمجھے بھی یہ کن بزرگ کا مزار ہے؟ اجی صاحب، یہ حضرت امیر خسرو کی درگاہ ہے۔ محبوب الٰہیؒ کے محبوب مرید کی۔ پہلے ان کے مزار پر فاتحہ پڑھی جاتی ہے، پھر سلطان جی کے مزار پر۔ قوالوں کی ایک ٹولی حضرت ہی کی ایک غزل گا رہی ہے......

بخوبی ہمچو مہ تابندہ باشی
بہ ملک دلبری پائندہ باشی

سہانا سماں، شہانے کی دھن، بھمیری آوازیں، ڈھولک کی تھاپ پر جب الفاظ کی تکرار ہوتی ہے تو دل رقص کرنے لگتا ہے اور روح کو وجد آنے لگتا ہے۔ جو لوگ بیٹھے سن رہے ہیں ان میں شاید ہی کوئی ایسا ہو جو جھوم نہ رہا ہو۔ واہ واہ سبحان اللہ کا شور برپا ہے جب اس شعر پر قوال پہونچتے ہیں......

من درویش راکشتی بہ غمزہ
کرم کردی الٰہی زندہ باشی

تو محفل تڑپ اٹھتی ہے اور روپیہ برسنے لگتا ہے۔ لو وہ ایک صاحب کو حرارہ آگیا۔ الا اللہ کا نعرہ مار کر سیدھے کھڑے ہو گئے۔ قوالوں نے شعر کی تکرار شروع کر دی۔ ان صاحب پر کیفیت طاری ہو گئی ہے۔ اب انہوں نے حال کھیلنا شروع کر دیا۔ آہ سرد اور نالۂ گرم کی حدود سے متجاوز ہو کر انہوں نے تو چیخیں مارنی شروع کر دیں، قوال دوسرے مصرع پر جاتے ہیں تو یہ نعرہ لگاتے ہیں ''من درویش راکشتی بہ غمزہ'' اور قوال پھر مصرع اولیٰ کی تکرار کرنے لگتے ہیں تو یہ اس زور زور سے پاؤں پٹختے ہیں کہ زمین دہل دہل جاتی ہے پھر جب مصرع ثانی شروع ہوتا ہے تو یہ صاحب ''یا خواجہ'' کہہ کر اپنے گریبان کو ایک ہی جھٹکے میں اس طرح چاک کر دیتے ہیں کہ دامن کے چاک اور گریبان کے چاک میں کوئی فاصلہ نہیں رہتا۔ اس کے بعد ان پر مذبوحی کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور وہ تڑپ کر سنگین فرش پر دھائیں سے گر پڑتے ہیں اور لوٹ لگانی شروع کر دیتے ہیں۔ جو لوگ حلقہ بنائے کھڑے ہیں کائی کی طرح پھٹ جاتے ہیں اور حلقہ وسیع تر

ہوجاتا ہے۔ قوالوں کی شامت آگئی ہے، بچارے کھڑے ہوکر مصرعوں کی تکرار کر رہے ہیں۔ جب لوٹ لگا لگا کر یہ صاحب تھک گئے تو انہوں نے فرش پر دھمادھم اپنا سر پھوڑنا شروع کر دیا۔ کسی نے اپنا ہاتھ رکھ دیا، کسی نے تکیہ پھینکا کہ فرش پر رکھ دیا جائے۔ اب تو انہوں نے اور بھی زوروں سے اپنا سر پٹخنا شروع کر دیا۔ اُستاد شابو نے رفو سے کہا۔ ''ابے دیک ریا ہے کس طریوں تکیہ پر جانچ کر سر مار ریا ہے؟'' رفو نے کہا۔ ''اُستاد بناوا ہے بناوا۔ کچھ کرو، اب کے یہ ٹکر لے تو اس کا تکیہ کھینچ لو۔ اس کا سارا حال وال غائب ہو جائے گا۔'' اُستاد شابو کی سمجھ میں یہ بات آگئی۔ ''اماں ہاں اور نہیں تو اتنی دیر ہوگئی اور میاں جی ہیں کہ اپنے اوسانوں ہی میں نہیں آتے۔'' اُستاد چپکے سے کھسک کر قریب پہونچے اور ہمدردی میں ہر ٹکر پر تکیہ سامنے ڈالنے لگے اور ایک دفعہ اس نے جو خوب جی جان سے اللہ کہہ کر ٹکر دکھائی تو اُستاد نے جھٹ تکیہ کھینچ لیا۔ ایک دھما کہ ہوا اور جل ٹھنڈے ہو گئے۔ وہ تو لمبا لمبا لیٹ گیا۔ اُستاد نے موقع کی نزاکت کو محسوس کیا اور رفو کو آنکھ مار کر چپکے سے رفو چکر ہو گئے۔ اس غریب کی بھوؤں پھٹ گئی اور خون کی تللی بندھ گئی۔

محبوب الٰہی کی درگاہ کے سامنے صحن میں اتنی بھیڑ ہے کہ تِل دھرنے کو جگہ نہیں، جو کبھی تھالی پھینکو تو سروں ہی سروں پر جائے۔ ڈھولک کی تھاپ سن کر اور بھی لوگ کھنچے چلے آرہے ہیں، قوالوں کی چوکی ابھی ابھی بیٹھی ہے، اس کے سر چوکی اُستاد یعقوب خاں ہیں۔ نہ مونہہ میں دانت نہ پیٹ میں آنت، مارے بڑھاپے کے لپسی ہو رہے ہیں، ان کے ہمنوا بھی انہی کے لگ بھگ ہیں۔ کسی کے گلے میں لرزہ ہے تو کسی کے رعشہ۔ مگر حضرت کے عرس میں قوالی ان ہی کی چوکی سے شروع ہوتی ہے۔ کیونکہ ان کے آبا واجداد سلطان جی کی حضوری کے قوال تھے۔ صامت قوال کے بارے میں روایت ہے کہ وہ گونگے تھے۔ حضرت نے اپنا لعاب دہن اپنی انگلی سے چٹا دیا اور صامت کا تن من روشن ہو گیا......

صامتی از لب او جرعہ چشید
سالہا در خمار خواہد بود!

یہ بڑے میاں اپنے کو صامت قوال کی اولاد میں بتاتے ہیں۔ انہیں درگاہ سے

نیگ کا سوا روپیہ ملتا ہے مگر یہ سوا روپیہ ان کے لئے سوا لاکھ روپے سے زیادہ ہے۔ اُستاد بائیں ہاتھ سے ہارمونیم بجاتے ہیں اور باجے پر سپاٹے سے جب اپنا دست شفقت پھیرتے ہیں تو یہ معلوم ہوتا ہے جیسے انہوں نے باجے کی گدی ناپ دی۔ اللہ ہو کا نغمہ بجانے کے بعد انہوں نے رنگ شروع کر دیا۔ رنگ میں سبھی ٹولیاں شریک ہو گئیں......

آج رنگ ہے اَے ماں رنگ ہے ری

میرے محبوب کے گھر رنگ ہے ری

رنگ سے کچھ ایسا سماں بندھا ہے کہ لوگ زاروقطار رو رہے ہیں۔ گانے کی دھن ہی کچھ ایسی ہے کہ دلوں کو برما رہی ہے۔ بوڑھی کانپتی ہوئی آوازیں سن کر تھرا اُٹھتے ہیں اور بے اختیار آنسوؤں کی لڑیاں بندھ جاتی ہیں۔

''سبحان اللہ اُستاد کیا کہنے۔ یہ سوز اللہ کی دین ہے۔ آپ کے بعد یہ بات کسی کو نصیب نہیں ہوگی۔''

اُستاد نے کھڑے ہو کر تین سلام جھکائے اور ہاتھ باندھ کر عرض کیا۔ ''میاں یہ اِسی آستانے کا فیض اور آپ کا حسن سماعت ہے، ورنہ میں کیا اور میری بساط کیا؟''

اُستاد شابو نے کہا۔ ''میاں اُستاد، تمہارا دم بھی غنیمت ہے۔ یہ تمہاری لائق مندی ہے۔ مرجاؤ گے تو یاد کرو گے۔'' یہ کہہ کر ایک روپیہ اُستاد کی نذر کیا۔

لو صاحب، اب یہاں سے باہر چلو۔ یہاں تو دم گھٹا جا رہا ہے۔ **گھمس** بھی آج غضب کی ہے۔ عرس تو ساری رات جاری رہے گا۔ ایسا ہی ہے تو پھر واپس آجائیں گے۔

درگاہ کے آس پاس بیسیوں پرانی عمارتیں ہیں جن میں قبریں ہیں۔ کھلے میدان میں، گھاس کے بڑے بڑے تختے ہیں اور آگے بڑھ جاؤ تو ہمایوں کا مقبرہ ہے۔ کسی نے رات کہیں کاٹی، کسی نے کہیں، کسی نے رات بھر درگاہ میں قوالی سنی۔ دور دور سے چوکیاں آئی ہوئی ہیں۔ رات آنکھوں ہی آنکھوں میں کٹ گئی، ایلو فجر کا وقت ہو گیا۔ قوالی ملتوی ہو گئی، موذن نے اذان دی۔ بھلے مانسوں نے نماز پڑھی، باقی ادھر ادھر ٹہل گئے۔

لنگر خانے سے لنگر برابر جاری ہے۔ خمیری روٹیاں اور چنے کی دال جس کا جی

چاہے جا کر لے لے۔ اس دال روٹی میں وہ مزہ ہے کہ دُنیا کی نعمت میں نہیں۔ لاکھوں آدمی کھاتا ہے اور برکت کا یہ حال کہ تھڑنے کا تو ذکر ہی کیا اس لنگر میں کمی بھی آتی دکھائی نہیں دیتی۔

اَٹھارویں کو پھراوٗ میلہ ہوتا ہے۔ درگاہ میں پہلے ختم پڑھا جاتا ہے اور قوالی پھر شروع ہو جاتی ہے۔ یہی سلسلہ کل اور پرسوں بھی جاری رہے گا۔ زائرین آتے جاتے رہیں گے۔

آج تو ہمایوں کے مقبرے میں بہار آ رہی ہے، لوگوں نے اس مقبرے کو سیر و تفریح کے لئے منتخب کیا ہے، اس کے چپے چپے پر ٹولیاں بیٹھی ہوئی ہیں۔ کہیں گراموفون ریکارڈوں کا مقابلہ ہو رہا ہے۔ لال لال قند کے غلاف کیکری کٹاؤ کے کام سے لپے ہوئے مشینوں پر سے اتارے گئے۔ ایک ٹولی نے ادھر سے کوئی ریکارڈ بجایا۔ اس کے ختم ہوتے ہی مقابلے کی ٹولی نے جواب میں اپنا ریکارڈ سنایا۔ ایلو یہ تو باقاعدہ میچ ہو رہا ہے۔ چاندی کے کپ رکھے گئے ہیں، اس میچ میں بارہ مشینیں شریک ہوئی ہیں کہیں چوبیس گھنٹے میں جا کر یہ میچ ختم ہوگا۔ پھر جج صاحبان اپنا فیصلہ سنائیں گے اور انعامات دئے جائیں گے۔

وہ سامنے دیکھئے پتنگ بازی کا مقابلہ ہو رہا ہے، آج بڑے بڑے اُستادوں کے ہاتھ لگے ہوئے ہیں، شاگردوں نے اپنی اپنی پتنگیں چڑھائیں، جب ڈیڑھ ڈیڑھ دو دو ریلوں پر پہونچ گئیں تو مونہہ مل گئے، کوئی ڈھیل دے کر کاٹتا ہے کوئی کھنچائی کر کے، مانجھے سے مانجھا ملتے ہی اُستادوں نے اپنی اپنی پتنگ کی ڈور سنبھال لی۔ سیروں سے ڈور پلائی جا چکی ہے اور پتنگیں تارہ ہوگئی ہیں، مگر انہیں تو ڈور سب کچھ بتا رہی ہے۔ لو وہ اوپر والے کل چڑے نے غوطہ مارا۔ ادھر سے پری بھی سینہ تان کر اوپر کو اٹھی۔ چشم زدن میں ''وہ کاٹا، وہ کاٹا'' کا شور مچ گیا۔ جس کی پتنگ کٹ گئی اس نے ہاتھ پر سے ڈور توڑ دی۔ لونڈوں نے ڈور لوٹنی شروع کر دی۔

جیتنے والے کے وارے نیارے ہو گئے۔

ایک طرف ہیجڑوں نے اپنا پھڑ جما رکھا ہے۔ دلی والے انہیں ''جنت کی چڑیاں''

کہتے ہیں، ان سے ٹھٹھول کرتے ہیں اور ان کی بولی ٹھولی کا لطف اٹھاتے ہیں۔ پھٹے بانس کی سی آوازیں، مردوں سے بھی بڑے ہاڑ۔ زنانے کپڑے پہنے چوٹی کنگھی کیے، ہاتھوں میں مہندی، آنکھوں میں کاجل، سولہ سنگھار کیے مٹک مٹک کر گاتے اور ناچتے ہیں۔

اُستاد شابو نے کہا۔ ''کولہے سے ہوگی بے، کولہے سے۔''

لو صاحب اس نے بھی:۔

سروتا کہاں بھول آئی پیارے نندوئیا

کا بول ختم کرتے ہی کولہوں پر ہاتھ رکھے۔ پہلے اکہرا کولہا لگایا اور پھر دوہرا کولہا اس طرح لگایا کہ اس کے ساتھ ہی چکر بھی پورا ہوگیا۔ کرخندار اس ادا پر لوٹ گئے۔ چونی بیل کی دکھائی۔ زنخا اٹھلاتا ہوا آیا اور ان کی انگلی پر سے چونی اس انداز سے اٹھانے لگا کہ اُستاد ریشہ خطمی ہو گئے بولے۔ ''اگر چہ کہ۔''

مگر بوا شہزادی نے تالیاں پٹخار کر کہا......

اگرچہ کی روٹی مگرچہ کی دال
چنانچہ کی چٹنی بڑی مزے دار

یہ کہہ کر اُستاد کی انگلی مروڑی اور چونی لے کر چلتا بنا۔ اُستاد کی ساری شیخی دھری کی دھری رہ گئی۔

''یہاں تو چیخ اور بے ہودگی ہو رہی ہے، دیکھیں وہ مجمع کیسا ہے؟''

آہاہاہا! یہ ہے شوقینوں کی ٹولی۔ بڑا سا گھیرا بنا ہے، سب سلیقے سے بیٹھے ہیں، پان سگریٹ سے تو اضع ہو رہی ہے، بی چھمیا تھئی تھئی ناچ رہی ہیں۔ طبلے والے نے پیشکار شروع کیا اور بی چھمیا نے گت بھری۔ توڑا کہتے ہی انہوں نے پاؤں سے تا تھئی تت تت کہہ کر تھکوں کا توڑا کہا۔ ادھر طبلے کا چکر دار تیا آیا ادھر بی چھمیا نے بھی چک پھیری کھا کھا کر تین سلام ہو گئے۔ سب نے کہا۔ ''واہ واہ، کیا کہنا۔'' اب ان کے نین بھاؤ شروع ہو گئے اور ہاتھ سانپوں کی طرح لہرانے لگے، سینے کا زیر و بم قیامت ڈھانے لگا۔ بی چھمیا تو خود قد آدم قیامت ہیں، ان کی ایک ایک ادا پر واہ واہ سبحان اللہ کا شور برپا

ہو رہا ہے۔ ستھری مجلس ہے اس لئے کوئی بیہودگی نہیں ہونے پاتی، تماشائیوں میں سے بھی کیا مجال جو کوئی آوازہ تاوازہ کس دے۔ دلی کی ڈیرہ دار ہے، ویسے بھی عزت دار ہے۔

کہیں کبڈی کے پالے جم رہے ہیں، کہیں جھولوں کی پینگیں بڑھ رہی ہیں، کہیں تاش ہے، کہیں چوسر، کہیں کہیں گنجفہ بھی کھیلا جا رہا ہے، اگلے وقت کے لوگوں ہی میں اب اس کے کھیلنے والے رہ گئے ہیں، ہماری سمجھ میں تو اس کی بازی خاک نہیں آتی۔ شطرنج کی بساطیں بھی کئی جگہ بچھی ہوئی ہیں۔ حکیم جی کی چال بہت اچھی ہے، کئی کئی چالیں آگے کی سوچ لیتے ہیں اور مدمقابل کو بات کا سان گمان بھی نہیں ہوتا کہ یہ مہرے ڈال دیتے ہیں اور کہتے ہیں۔ ''لو میاں دوسری بچھاؤ۔'' اور واقعی میں ایسا زچ کرتے ہیں کہ اپنی مرضی کی چال چلواتے ہیں اور دس بارہ چالوں میں شہ مات ہو جاتی ہے۔ صاحب ان کا کیا کہنا، یہ تو غایب بھی ایسی ہی کھیلتے ہیں، ان کی جوڑ تو بس مرزا بکرے ہی سے اچھی پھنستی ہے، صاحب عالم پان چباتے جاتے ہیں اور ان کی بکرے کی طرح داڑھی ہلتی رہتی ہے۔ یوں ان کا نام مرزا بکرے پڑ گیا ہے۔

لیجئے اب دونوں وقت ملتے ہیں۔ دلی والے اب واپس کھسکنے شروع ہو گئے ہیں۔ میلے کی رونق اب گھٹنے لگی، اب ہمیں بھی گھر چلنا چاہئے۔ تین دن کی سیر سے تھک کر چور ہو رہے ہیں۔ آنکھوں میں ریتا سا بھر رہا ہے، گھر پہونچیں، نہائیں، دھوئیں، کھانا کھائیں اور خوب ٹانگیں پسار کر سوئیں۔

○○

دِلّی کا آخری تاجدار

مرزا غالبؔ نے کہا ہے......

شمع بجھتی ہے تو اس میں سے دُھواں اُٹھتا ہے

یہی حال مغلیہ سلطنت کا بھی ہوا۔ آخری وقت کچھ اس طرح کا دھواں اٹھا کہ ساری محفل سیاہ پوش ہوگئی۔

یوں تو اورنگ زیب کے بعد ہی سے اس عظیم الشان مغلیہ سلطنت میں انحطاط کے آثار پیدا ہو چلے تھے لیکن ان کے بعد تو وہ افراتفری اور بیراکھیری پھیلی کہ بادشاہ صرف نام کے بادشاہ رہ گئے۔ محمد شاہ رنگیلے پیا'' کہلائے۔ ان کے عہد میں دَر و دِیوار سے نغمے برستے اور شعروشاعری کے اکھاڑے جمتے۔ نعمت خاں سدارنگ انہی کے دربار کا بین کار اور کلاونت تھا جس نے دھرپد کے مقابلے میں خیال کی گائیکی کو فروغ دیا۔ آج تک گویئے اس کے نام پر کان پکڑتے ہیں۔ ولیؔ اپنا دیوان لے کر انہی کے زمانے میں دلی آئے تھے اور ان ہی کے دربار میں انہوں نے اپنے طالع چمکائے تھے۔ گھر گھر شعر اور موسیقی کا چرچا تھا۔ بادشاہ کو ڈوم ڈھاڑیوں نے باور کرادیا تھا کہ آدمی تیر تلوار کا مارا بھی مرتا ہے اور تان تلوار کا بھی۔ لہٰذا ایک فوج گوئیوں کی بھی تیار کر لی گئی تھی۔ ان رنگ رلیوں میں تلواریں لہو چاٹنا بھول گئیں اور نیاموں میں پڑے پڑے سوگئیں۔ نادر شاہ نے اس موقع کو غنیمت جانا اور قہر و غضب کی آندھی بن کر دلی کی طرف جھپٹا۔ پرچہ لگا کہ نادر شاہ دلی کے قریب آپہونچا۔ گوئیوں کی فوج مقابلے کے لئے بھیج دی گئی۔

نادرشاہ کے جانگلو محمد شاہی فوجیوں کی بغلوں میں بڑے بڑے طنبورے دیکھ کر پہلے تو ڈرے کہ خدا جانے یہ کیا ہتھیار ہے مگر جب جاسوسوں نے بھانڈا پھوڑا کہ یہ ہتھیار نہیں ایک ساز ہے تو دم کے دم میں انہوں نے محمد شاہی فوج کو کھیرے ککڑی کی طرح کاٹ کر ڈال دیا۔ نادرشاہ نے دھڑی دھڑی کر کے دلی کو لوٹا اور دلی کھک ہوگئی۔ قتل عام کیا تو ایسا کہ گھوڑوں کے سم خون میں ڈوب گئے۔ آخر وزیر باتدبیر بوڑھے نظام الملک کو نادری جلال فرو کرنے کے لئے نادرشاہ کی خدمت میں حاضر ہوکر کہنا پڑا کہ.....

کسے نہ ماند کہ دیگر بہ تیغ ناز کشی
مگر تو زندہ کنی خلق رادباز کشی

نادرشاہ لوٹ لاٹ کابل چلا گیا، اور اپنے ساتھ شاہ جہانی تخت طاؤس بھی لے گیا۔ شاہ عالم ثانی کی آنکھیں روہیلے نے نکالیں۔ بادشاہ آنکھوں کے ساتھ ساتھ عقل کے بھی اندھے ہوگئے۔ ان کے درباریوں نے انہیں یقین دلایا کہ حضور والا بیٹھے بیٹھے ایک دم سے غائب ہو جایا کرتے ہیں۔ جب چاہتے ہیں دلی سے مکہ مدینہ پہونچ جاتے ہیں۔ ایلو! بادشاہ سلامت بھی یہ سمجھنے لگے کہ واقعی میں مجھ میں یہ کرامت سما گئی ہے۔ پیری مریدی کرنے لگے اور مریدوں کے وظائف مقرر ہونے لگے۔ حکومت تباہ اور خزانے ویران ہو گئے۔ مثل مشہور ہوئی کہ ''سلطنت شاہ عالم از دہلی تا پالم۔'' یعنی صرف چند میل کی بادشاہت رہ گئی۔ سودا نے اپنے شہر آشوب میں ان کے زمانے کا خاکہ اڑایا۔ اکبر شاہ ثانی جاٹوں کے حملے سے ایسے ناچار ہوئے کہ انگریزوں کے وظیفہ خوار ہو گئے۔ یہی لیل ونہار تھے کہ بہادر شاہ عالم وجود میں آئے۔ بہادر شاہ کی پوری جوانی اور ادھیڑ عمر تخت وتاج کی راہ تکتے بیت گئی۔ اکبر شاہ ثانی کی ایک بیگم تھیں ممتاز محل۔ ان بیگم کے ایک چہیتے بیٹے تھے مرزا جہانگیر۔ بادشاہ بھی انہیں بہت چاہتے تھے اور انہی کو ولی عہد مقرر کرنا چاہتے تھے مگر مرزا جہانگیر اپنی بے ہودہ حرکتوں سے باز نہ آتے۔ انگریز حاکم اعلیٰ سیٹن کو لولو کہہ دیا۔ اس کی پاداش میں مرزا نظر بند کر کے الہ آباد بھیج دئے گئے۔ یہ ایک الگ قصہ ہے۔ ہاں تو بہادر شاہ ہی ولی عہد رہے اور ایک نہ دو پورے باسٹھ سال

تک ولی عہد رہے۔ جب کسی بادشاہ کا انتقال ہو جاتا تھا تو اس کے مرنے کی خبر مشہور نہیں کرتے تھے، یہ بات کہی جانے لگی تھی کہ ''گھی کا کپا لنڈھ گیا۔'' خاموشی کے ساتھ میت کو نہلا دُھلا کفنا کر قلعہ کے طلاقی دروازے سے جنازہ دفن کرنے بھیج دیا جاتا۔ نوبت نقارے اُلٹے کردئے جاتے اور چولھوں پر سے کڑھائیاں اُتار دی جاتیں۔ اکبر شاہ ثانی کے وقت تک یہ رسم چلی آتی تھی کہ بادشاہ کے جنازے کو تخت کے آگے لا کے رکھتے تھے۔ دوسرا بادشاہ جو کوئی ہوتا تھا مردے کے منہ پر پاؤں رکھ کر تخت پر بیٹھتا تھا۔ دوسرے بادشاہ کے تخت پر بیٹھتے ہی شادیانے بجنے لگتے۔ سلامی کی توپیں چلنے لگیں۔ تب کہیں سب کو معلوم ہوتا کہ بادشاہ مر گیا اور دوسرا بادشاہ تخت پر بیٹھ گیا۔

باسٹھ سال کی عمر میں بہادر شاہ کو تخت نصیب ہوا تو مغلوں کا جلال رخصت ہو رہا تھا، اور آفتاب اقبال لب بام آ چکا تھا۔ بہادر شاہ کہنے کو تو بادشاہ تھے لیکن بالکل بے دست و پا تھے۔ فرنگی سرکار کے نمک خوار تھے۔ انہیں اس شرط پر ایک لاکھ روپیہ ماہانہ دیا جاتا تھا کہ ان کے بعد دلی کی شاہی ختم ہو جائے گی اور دلی بھی انگریزی عملداری میں شامل ہو جائے گی۔ لال حویلی کے باہر بادشاہ کا حکم نہیں چلتا تھا اور اگر شہر والوں میں سے کوئی ان کے پاس فریاد لے کر آتا تو بادشاہ اپنی مجبوری ظاہر کر دیتے اور کہتے ''بھئی انگریزوں کی عدالت میں جاؤ۔''

لیکن اس بے بسی کے باوجود دلی والے ہی نہیں باہر والے بھی بادشاہ سے دالہانہ عقیدت رکھتے تھے۔ شہر کی بیشتر آبادی لال قلعہ کے متوسلین پر مشتمل تھی۔ شہزادوں اور سلاطین زادوں کے علاوہ امیر امرا، اور رؤسا کا حذم وحشم کیا کم تھا؟ دلی میں، لٹتے لٹتے بھی الغاروں دولت بھری پڑی تھی۔ ڈیوڑھیوں پر ہاتھی جھولتے۔ تخت رواں، ہوادار، پالکی، تالکی، تام جھام، ہر حویلی میں موجود لاؤ لشکر کا کیا ٹھکانہ! چوب دار، عصا بردار، پیادے، مردھے، کہار، لونڈیاں، باندیاں، دڈائیں، چھوچھوئیں، مغلانیاں، ترکنیں، حبشنیں، جسولنیاں، قلماقنیاں، خواجہ سرا، دربار، پاسبان، ہر امیر کے ہاں آخور کی بھرتی کی طرح بھرے پڑے تھے۔ ستا سماں، کاروبار خوب چمکے ہوئے، نہ جانے کیسی برکت تھی

کہ ہن برستا تھا۔ ایک کماتا اور دس کھاتے۔ اُجلے پوشوں تک کے خرچ اُجلے تھے۔ رعایا خوش حال اور فارغ البال تھی۔ رہن سہن، ادب آداب، نشست و برخاست، بول چال، رسم ورواج، تیج تہوار، میلے ٹھیلے، سیر تماشے، ان سب میں کچھ ایسا سلیقہ اور قرینہ تھا کہ دلی کی تہذیب ایک مثالی نمونہ سمجھی جاتی تھی۔ یہاں کے ہیروں کی چمک دمک تو آنکھوں میں کبھی کبھی ہی جاتی تھی۔ باہر سے جو بھی کھڑ آتی یا انگھڑ جواہر پارے آتے یہاں ان کی تراش خراش کچھ اس انداز سے ہوتی اور ان پر ایسی جِلا چڑھتی کہ اس کی چھوٹ سے آنکھیں خیرہ ہونے لگتیں۔ یہاں آکر گونگوں کو زبان مِل جاتی، جن کی منقار زیر پر ہوتی وہ ہزار داستاں بن جاتے، جو پر شکستہ ہوتے وہ فلک الافلاک پر پر مارنے لگتے۔ علوم وفنون کے چشمے اس سرزمین سے پھوٹتے اور حکمت و دانش یہاں کی فضا میں گھلتی رہتی۔ غرض ہندوستان کا دل ایک عجیب پُرکیف مقام تھا جو بہت کچھ برباد ہو جانے پر بھی جنت بنا ہوا تھا۔

زمانہ چپکے چپکے کروٹ بدل رہا تھا۔ مشرق پر مغرب کی یلغار شروع ہو چکی تھی۔ تہذیب فرنگ کی آندھی چڑھتی چلی آ رہی تھی اور مشرقی تہذیب کے چراغ جھلملا رہے تھے۔ یہ دلی کی آخری بہار تھی جس کی گھات میں خزاں لگی ہوئی تھی۔

بہادر شاہ کی حیثیت شاہ شطرنج سے زیادہ نہیں تھی۔ تیموری دبدبہ لال قلعہ میں محصور ہو چکا تھا۔ ملک ملکہ کا تھا، حکم کمپنی بہادر کا چلتا تھا۔ بہادر شاہ کو اپنی بے بسی کا شدت سے احساس تھا مگر وہ اس کا کوئی تدارک نہیں کر سکتے تھے...... اور تو اور خود اُن کے ہاتھ پاؤں ان کے خلاف تھے۔ گھر کے بھیدی لنکا ڈھا رہے تھے۔ ان کی چہیتی بیگم زینت محل مرزا جواں بخت کو وَلی عہد بنوانا چاہتی تھیں۔ اس سلسلے میں انہوں نے فرنگیوں سے ساز باز کر رکھا تھا۔ بادشاہ کے سمدھی مرزا الٰہی بخش انگریزوں سے جا ملے تھے۔ شاہی طبیب حکیم احسن اللہ خاں انگریزوں کے گماشتے تھے۔ جب ۵۷ء میں غدر پڑا، جو دراصل پہلی جنگ آزادی تھی جو انگریزوں سے لڑی گئی، تو دیسی فوجیں چاروں طرف سے سمٹ کر دلی آنے لگیں اور زبردستی بوڑھے بادشاہ کو اپنا فرمانروا بنا کر فرنگیوں سے

لڑنے لگیں، مگر اندر خانے تو دیمک لگی ہوئی تھی۔ کالے خان گول انداز کو جو بارود قلعہ سے بھیجی جاتی وہ بارود نہیں رنگا ہوا باجرا ہوتا۔ پھر دیسی فوج کا کوئی سر دھرا نہیں تھا۔ سب من مانی کرر ہے تھے۔ ولی عہد بہادر اپنی چلا رہے تھے۔ انہیں اپنی بادشاہی کے خواب نظر آرہے تھے۔ جنرل بخت خان پہلے تو جی توڑ کر لڑا۔ مگر جب اس نے یہ دیکھا کہ صاحب عالم اس کی چلنے نہیں دیتے تو اپنے آدمیوں کو لے کر روپوش ہو گیا۔

اقتدار کی خواہش اور محلات کی ریشہ دوانیاں آخری مغل بادشاہ کو لے ڈوبیں۔ جب انگریزوں کی فوجیں دلی پر چڑھ آئیں اور شہر کے بچنے کی کوئی امید نہ رہی تو بادشاہ لال قلعہ سے نکل کر ہمایوں کے مقبرے میں چلے گئے۔ دلی کو انگریزوں نے فتح کر لیا۔ رعایا تباہ ہو گئی۔ دربدر خاک بسر جس کے جہاں سینگ سمائے نکل گیا۔ دلی کی اینٹ سے اینٹ بج گئی۔ ہڈسن اپنی فوج کا دستہ لے کر ہمایوں کے مقبرے پہونچا۔ اس کے پہونچنے سے کچھ ہی دیر پہلے جنرل بخت خان نے مقبرے میں آکر بادشاہ کو بتایا کہ دلی ختم ہو گئی۔ بہتر ہے کہ آپ میرے ساتھ چلیں۔ ہم کسی اور مقام کو اپنا گڑھ بنا کر انگریزوں سے لڑیں گے۔ بادشاہ اس کے ساتھ چلنے پر رضامند بھی ہو گئے مگر انگریزوں کے ہوا خواہوں نے انہیں پھر ہٹکا دیا۔ یہ کہہ کر کہ اس پوربئے کا کیا اعتبار؟ یہ آپ کی آڑ میں خود بادشاہ بننا چاہتا ہے۔ بادشاہ پھر ڈھسل گئے۔ انہیں باور کرایا گیا کہ انگریز آپ کی پنشن جاری رکھیں گے اور آپ کی جو نذر بند کر دی گئی ہے اسے بھی کھول دیں گے، اور آپ آرام سے لال قلعہ میں رہیں گے۔ اندھا کیا چاہے؟ دو آنکھیں۔ بادشاہ نے بخت خان کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا۔ جنرل بخت خان نے بہت سمجھایا کہ یہ مشورہ نمک حراموں کا ہے۔ ان کا یا فرنگیوں کا کیا اعتبار؟ مگر بادشاہ دودلے ہو کر رہ گئے اور ہڈسن کا دستہ جب مقبرے میں داخل ہو گیا تو جنرل بخت خاں بادشاہ کو آخری سلام کر کے مقبرے میں سے جمنا کے رُخ اُتر گیا۔ اس کا پھر کوئی پتہ نہیں چلا کہ اسے زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا۔

ہڈسن نے آکر بادشاہ سے باتیں ملائیں۔ بادشاہ نے قلعہ میں واپس چلنے کے

لیے چند شرائط پیش کیں۔ اپنی اور اپنے لواحقین کی جاں بخشی چاہی۔ پنشن کا جاری رہنا اور نذر کا کھُلنا چاہا۔ ہڈسن نے سارے مطالبات مان لئے۔ بادشاہ کو ہوادار میں سوار کرایا اور چھ شہزادوں کو فنس میں۔ جب دلی کے خونی دروازے پر پہونچے تو ہڈسن نے رک کر شہزادوں کو حکم دیا کہ فنس میں سے باہر نکل آؤ۔ شاہزادوں نے حکم کی تعمیل کی۔ ہڈسن نے ان پر اپنا طمنچہ تانا۔ شہزادوں نے کہا۔ ''آپ نے تو ہمیں جان کی امان دی ہے۔'' زبردست مارے بھی اور رونے نہ دے۔ ایک ایک کر کے ہڈسن نے چھیوں شہزادوں کو گولی کا نشانہ بنایا۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ جب شہزادے خاک وخون میں تڑپ رہے تھے تو ہڈسن نے ان کا چلو چلو بھر خون پیا اور کہا۔

''آج میں نے انگریزوں کے مارنے کا بدلہ ان سے لے لیا۔''

شہزادوں کے سر کاٹ لئے گئے اور ان کی لاشیں خونی دروازے پر لٹکا دی گئیں۔ بادشاہ کو لال قلعہ میں قید کر دیا گیا۔ جب بادشاہ نے دبی زبان سے شکوہ کیا کہ......

''مجھ سے میری پنشن بحال رکھنے اور نذر کھولنے کا وعدہ کیا گیا تھا۔''

تو ہڈسن نے کہا۔ ''ہم تمہاری نذر بھی کھولے گا۔'' یہ کہہ کر شہزادوں کے کٹے ہوئے سر ایک طشت میں رکھ کر بادشاہ کے سامنے پیش کر دئے۔ بوڑھے بادشاہ کے دل پر چھ جان جوان بیٹوں کے سر دیکھ کر کیا گزری ہوگی۔؟ اس کا اندازہ صاحب اولاد کر سکتے ہیں، اور شہزادوں کی بے گور و کفن لاشیں خونی دروازے پر لٹکی سڑتی رہیں۔ بادشاہ زادیاں دلی کے ویران گلی کوچوں میں بھٹکتی پھریں۔ کوئی انہیں امان دینے پر تیار نہ تھا۔ کون اپنی جان جوکھم میں ڈالتا؟ کوتوالی چبوترے پر پھانسیاں گڑھ گئیں اور چن چن کر مسلمانوں کو دار پر چڑھایا گیا اور اس کا بھی خاص اہتمام کیا گیا کہ پھانسی دینے والا بھنگی ہی ہو۔

دیکھتے ہی دیکھتے شہر میں ہو کا عالم ہو گیا۔ ویرانوں میں کتے لوٹنے لگے۔ وہ بازار جہاں کھوے سے کھوا چھلتا تھا اور تھالی پھینکو تو سروں ہی سروں پر جاتی تھی، مسمار کر دئے گئے۔ امیر امراء کی حویلیاں ڈھادی گئیں اور دفینوں کی تلاش میں دِلّی پر

گدھوں کے ہل پھروادیئے گئے۔

بادشاہ پر لال قلعہ میں مقدمہ چلایا گیا اور اُنہیں قید کر کے رنگون بھیج دیا گیا۔ لال حویلی کی کوکھ جل گئی۔ قلعہ میں گورا فوج رہنے لگی۔ جامع مسجد میں گھوڑے باندھے جانے لگے۔

بہادر شاہ ایک فقیر منش بادشاہ تھے، پیری مریدی بھی کرتے تھے، جوان کا مرید ہوتا اس کا کچھ نہ کچھ وظیفہ مقرر ہو جاتا۔ یوں تو ان کے سینکڑوں مرید تھے جو چیلے کہلاتے تھے۔ دلی میں ایک محلّہ انہی چیلوں کی رہائش کی وجہ سے چیلوں کا کوچہ کہلاتا ہے۔ شعرو شاعری تو گویا، ان کی گھٹی میں پڑی تھی۔ کلام الملوک ملوک الکلام، ان سے زیادہ کسی اور پر یہ مقولہ سچا نہیں اترتا۔ کلام میں سوز و گداز ہے، ان کا کلام ان کی سیرت کا آئینہ ہے، مایوسیوں نے ان کا دل گداز کر دیا تھا۔

فرماتے ہیں......

یا مجھے افسرِ شاہانہ بنایا ہوتا
یا مرا تاج گدایا نہ بنایا ہوتا

ان کی زبان کا کیا کہنا! لال قلعہ کی زبان اُردوئے معلیٰ کہلائی۔ بیان اتنا موثر کہ تیر کی طرح دل میں اتر جائے۔ ظفرؔ کو بچپن سے شعر کہنے کا شوق تھا۔ شروع شروع میں شاہ نصیر کو اپنا کلام دکھایا۔ مشکل زمینوں میں شعر کہنے کی صلاحیت شاہ نصیر کی بدولت پیدا ہوئی۔ جب شاہ نصیر دکن چلے گئے تو میر کاظم حسین بیقرارؔ کو اپنا اُستاد بنایا لیکن کچھ عرصہ بعد بیقرارؔ افغانستان چلے گئے تو اُستاد ذوقؔ کو ولی عہد بہادر کی غزلیں بنانے کی خدمت سونپی گئی۔ ذوقؔ جب تک جیئے اس خوشگوار فرض کو انجام دیتے رہے، ذوقؔ کے انتقال کے بعد مرزا غالبؔ اُستاد شہ مقرر ہوئے۔ مرزا کو اُستادی کے پچاس روپے ملتے تھے جو اُنہیں پچاس ہزار سے بھی زیادہ تھے۔

بنا ہے شاہ کا مصاحب پھرے ہے اِتراتا
وگرنہ شہر میں غالبؔ کی آبرو کیا ہے

ظفؔر کے چار دیوان شائع ہوئے تھے، انہوں نے اُردو کے علاوہ فارسی بھاشا اور پنجابی میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ ظفؔر کے کلام میں چونکا دینے والا انوکھا پن تو نہیں ہے لیکن وہ ایک مخصوص طرز کلام کے مالک ضرور ہیں، ان کے کلام کا ایک اہم وصف ان کا خلوص ہے جو ان کی زندگی سے ہم آہنگ ہے اور ان کی شخصی خوبیوں کا آئینہ دار بھی۔ ظفؔر بادشاہ ہونے کے ساتھ ساتھ صوفی اور دردمند بھی تھے۔ اِس دردمندی نے آگے چل کر فریاد و زاری کی شکل اختیار کر لی۔ ان کا زمانۂ اسیری کا کلام ''شکست شیشۂ دِل کی صدا معلوم ہوتا ہے، یہ کلام شائع نہیں ہو سکا مگر دلی کے اکثر لوگوں کو زبانی یاد تھا۔ ایک غزل جو اُن سے منسوب ہے، اُس کے چند شعر یہ ہیں......

نہ کسی کی آنکھ کا نور ہوں نہ کسی کے دل کا قرار ہوں
جو کسی کے کام نہ آسکے میں وہ ایک مشت غبار ہوں
مرا رنگ روپ بگڑ گیا مرا یار مجھ سے بچھڑ گیا
جو چمن خزاں سے اُجڑ گیا میں اسی کی فصل بہار ہوں
میں نہیں ہوں نغمۂ جانفزا کوئی مجھ کو سن کے کرے گا کیا
میں بڑے بروگ کی ہوں صدا کسی دل جلے کی پکار ہوں
کوئی آکے دیا جلائے کیوں کوئی آکے اشک بہائے کیوں
کوئی آکے پھول چڑھائے کیوں میں تو بیکسی کا مزار ہوں

۳۵۔۴۰ سال پہلے تک دلی میں ایک بڑے میاں تھے جن کی صورت شکل بہادر شاہ سے بہت کچھ ملتی جلتی تھی۔ وہ رباب بجا کر صرف بہادر شاہ ہی کی غزلیں گایا کرتے تھے۔ لوگ ان کی غمناک دھنوں میں مظلوم بادشاہ کی غزلیں سن کر بے حد متاثر ہوتے تھے اور انہیں روپے دو روپے دے کر رخصت کرتے تھے۔ ایک اور غزل وہ گایا کرتے تھے جس کے دو شعر یہ ہیں......

پس مرگ میرے مزار پر جو دیا کسی نے جلا دیا
اسے آہ دامن باد نے سرشام ہی سے بجھا دیا

مجھے دفن کر چکو جس گھڑی تو یہ اس سے کہنا کہ اے پری
وہ جو تیرا عاشق زار تھا تہہ خاک اس کو دبا دیا

پیلو کی دھن میں رباب کے زخموں کے ساتھ جب بڑے میاں ایک اور غزل سناتے تو سننے والوں کے ساتھ خود ان کے بھی آنسو نکل پڑتے......

گئی یک بیک جو ہوا پلٹ نہیں دل کو میرے قرار ہے
کروں غم ستم کا میں کیا بیاں مرا غم سے سینہ فگار ہے
یہ رعایا ہند تباہ ہوئی کہو کیسی ان پہ جفا ہوئی
جسے دیکھا حاکم وقت نے کہا یہ بھی قابل دار ہے
یہ کسی نے ظلم کبھی ہے سنا کہ دی پھانسی لوگوں کو بے گنہ
ولے کلمہ گویوں کی سمت سے ابھی دل میں ان کے بخار ہے
نہ تھا شہر دہلی یہ تھا اک چمن کہو کس طرح کا تھا یاں امن
جو خطاب تھا وہ مٹا دیا فقط اب تو اُجڑا دیار ہے
یہی تنگ حال جو سب کا ہے یہ کرشمہ قدرت رب کا ہے
جو بہار تھی سو خزاں ہوئی جو خزاں تھی اب وہ بہار ہے
شب و روز پھولوں میں جو تلے کہو خارِ غم کو وہ کیا سہے
ملے طوق قید میں جب انہیں کہا گل کے بدلے یہ ہار ہے
سبھی جادہ ماتمِ سخت ہے کہو کیسی گردشِ بخت ہے
نہ وہ تاج ہے نہ وہ تخت ہے نہ وہ شاہ ہے نہ دیار ہے
جو سلوک کرتے تھے اور سے وہ ہیں زندہ اب کسی طور سے
وہ ہیں تنگ چرخ کے دور سے رہا تن پہ ان کے نہ تار ہے
نہ رہے جو تن پہ ہے سر مرا نہیں جان جانے کا ڈر ذرا
کٹے غم ہی نکلے جو دم مرا مجھے اپنی زندگی ہی بار ہے

ان اشعار میں بہت کچھ تحریف ہوگئی ہے۔ کیونکہ سینہ بہ سینہ منتقل ہوتے چلے

آ رہے ہیں۔ تاہم ان اشعار سے ظفرؔ کی دردناک زندگی کا نقشہ آنکھوں کے آگے آجاتا ہے، رنگون میں خود بادشاہ کی حالت بہت زبوں ہوگئی تھی۔ ایک انگریز سیاح نے بادشاہ کو آخری وقت دیکھا تھا تو وہ ایک جھلنگے میں بے سدھ پڑے ہوئے تھے۔ کمرے کے ایک کونے میں پانی کا جو گھڑا رکھا ہوا تھا اس میں کیڑے کلبلا رہے تھے۔

ظفرکو اپنے جذبات واحساسات کے اظہار پر بڑی قدرت تھی۔ کسی واقعہ یا تاثر کو پوری شدت کے ساتھ شعر کے قالب میں ڈھال دیتے تھے۔ طویل بحریں انہیں زیادہ مرغوب تھیں مشکل زمینیں پیدا کرنے میں بھی انہیں خاص ملکہ تھا۔ مشکل سے مشکل ردیف قافیہ بے ساختگی سے نباہ جاتے تھے۔

ہو چکی گرمی گلابی بادۂ گلگوں سے بھر
اب تو جاڑا اے پری پیکر گلابی ہو گیا

☆

مری آنکھ بند تھی جب تلک وہ نظر میں نور جمال تھا
کھلی آنکھ تو نہ خبر رہی کہ وہ خواب تھا کہ خیال تھا

☆

تم نے کیا نہ یاد کبھی بھول کر ہمیں
ہم نے تمہاری یاد میں سب کچھ بھلا دیا

☆

ظفرؔ آدمی اس کو نہ جانئے ہو وہ کیسا ہی صاحبِ فہم و ذکا
جسے عیش میں یاد خدا نہ رہی جسے طیش میں خوفِ خدا نہ رہا

☆

زبان کا چٹخارہ اس شعر میں دیکھیے:......

آج دیتے ہیں وہی توڑ کے ٹکڑا سا جواب
اے ظفرؔ کھا کے پلے جو مرے گھر کے ٹکڑے

شاعری کے ساتھ ساتھ بہادر شاہ موسیقی اور خطاطی کے بھی اُستاد تھے۔ انہوں نے گلستان کی ایک شرح بھی لکھی تھی۔ جس طرح شاہ نصیرؔ، ذوقؔ اور غالبؔ جیسے اُستادان کے دربار سے وابستہ رہے اسی طرح شاہ بھیکن، میاں اچپل اور تان رس خاں جیسے نامی گرامی موسیقار بھی اُن کے دربار میں موجود تھے، بہادر شاہ بذات خود موسیقی کا اعلیٰ ذوق رکھتے تھے۔ ان کے بنائے ہوئے خیال، ٹھمریاں، ملہاریں اور ہولیاں آج بھی گائی جاتی ہیں۔ اس قسم کی چیزوں میں بہادر شاہ شوق رنگ تخلص کرتے تھے۔ اس کا نمونہ باگسیری بہار کا یہ خیال ہے......

رُت بسنت میں اپنی امنگ سوں
پی ڈھونڈن میں نکسی گھر سوں
ملے تو لال گروا لگالوں
پاگ بندھاؤں پیلی سرسوں
رُت بسنت میں اپنی امنگ سوں
رنگ ہے سبزہ نرگس یاں کا
کہے شوق رنگ، رنگ ہے واکا
ان بھیدن کو کوئی نہ جانے
واقف ہوں میں واکی جرسوں
رُت بسنت میں اپنی اُمنگ سوں

۱۸۵۸ء میں بادشاہ کو قید کر کے رنگون بھیج دیا گیا۔ چار سال قید و بند میں رہ کر آخری مغل تاجدار نے دیارِ غیر میں انتقال کیا۔ اس طرح ۱۸۶۲ء میں تیموری عظمت کا چراغ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے گل ہوگیا......

پردہ داری می کند برطاق کسریٰ عنکبوت
چغد نوبت می زند برگنبد افراسیاب

OO

شاہ جہانی دیگ کی کھرچن

اَب سے چالیس پینتالیس سال پہلے تک دلی میں شاہجہانی دیگ کی کھرچن باقی تھی۔ بڑے وضعدار لوگ تھے یہ دلی والے، جب تک جیتے رہے ان کی وضع میں کوئی فرق نہیں آیا۔ ہر شخص اپنی جگہ پر ایک نمونہ تھا، ایک نگینہ تھا دلی کی انگوٹھی میں جڑا ہوا۔ انہیں دیکھ کر آنکھوں میں روشنی آجاتی اور ان کی باتیں سن کر دل کا کنول کھل جاتا، خوش مذاق، خوش صفات، اب ایسے لوگ کہاں پیدا ہوں گے؟ یہ ایک مخصوص تہذیب کی پیداوار تھے اور اس تہذیب کی شمع گل ہوگئی اور شمع کے ساتھ پروانے بھی رُخصت ہوئے۔

میر ناصر علی دہلوی

یہ صاحب جو کمان کی طرح جھکے پیچھے ہاتھ باندھے چوک پر کباڑیوں میں پھر رہے ہیں خان بہادر میر ناصر علی ہیں، اسّی سے اوپر ہیں مگر فراش خانہ سے جامع مسجد روزانہ پیدل آتے جاتے ہیں۔ آندھی جائے مینہ جائے ان کا پھیرا ناغہ نہیں ہوتا۔ انہیں پرانی چیزیں جمع کرنے کا شوق ہے اس لئے چوک پر بیٹھنے والے کباڑیوں میں گھومتے پھرتے ہیں۔ کباڑئے بھی انہیں خوب جان گئے ہیں۔ جو چیز کوڑیوں کے مول لاتے ہیں، میر صاحب سے اس کے روپے بناتے ہیں مگر میر صاحب ان کے جھانسوں میں کم ہی آتے ہیں، یہ اشرفیوں کی چیز روپوں میں ان سے خریدتے ہیں، کبھی

میر صاحب کے گھر جا کر آپ دیکھتے تو آپ کو معلوم ہوتا کہ ایک چھوٹا سا نگار خانۂ چین اُن کے گھر میں اُتر آیا ہے۔

یہ وہی ناصر علی ہیں جو ''تیرھویں صدی'' میں سر سید سے الجھتے سلجھتے رہے، ان کے باپ دادا شاہی مناظرہ کرنے والے تھے، یوں میر صاحب کو دین کی تعلیم پہونچی ہوئی تھی۔ سر سید انہیں ''ناصح مشفق'' کہتے تھے۔ صاحب طرز ادیب تھے، اب سے پچاس ساٹھ سال پہلے ان کا طوطی بولتا تھا۔ ان کا آخری پرچہ ''صلائے عام'' تھا جو ربع صدی تک جاری رہا اور ان کے ساتھ ہی رخصت ہوا، ان کا کتب خانہ دلّی کے بہترین کتب خانوں میں شمار ہوتا تھا، صورت سے قلندر معلوم ہوتے تھے۔ جب بولنے پر آتے تو سمندر بن جاتے، ادب، فلسفہ، مذہب، تاریخ کے جوار بھاٹے آنے لگتے، اپنے آگے کسی کو نہ گردانتے تھے، سب کو طفل مکتب جانتے تھے، مزاج کے کڑوے تھے اور باتیں اکثر کسیلی کرتے تھے، نمک کے محکمے میں ساری عمر نوکر رہے۔ جتنے عرصے ملازمت کی اس سے زیادہ عرصہ تک پنشن لی۔ اتنے جئے کہ ہم عمروں میں کوئی باقی نہ رہا۔ شاید اسی وجہ سے چڑ چڑے ہو گئے تھے۔

دلی میں حضرت خواجہ باقی باللہ کی درگاہ میں جو راستہ شمال سے جاتا ہے اس پر ایک بزرگ کا مزار ہے جس پر یہ شعر لکھا ہوا ہے......

فاتحہ مرقدِ ویراں پہ بھی پڑھتے جانا
ان سے کہہ دو جو ہیں اس راہ کے گزرنے والے

ان ہی حافظ ویراں کے میر صاحب مرید تھے، مگر میر صاحب اپنی بعد کی زندگی میں پیری مریدی کے سخت خلاف ہو گئے تھے۔ میر صاحب کے لباس میں نفاست بہت تھی۔ لباس صاف ستھرا ہوتا تھا، کھانا من بھاتا کھاتے تھے، چائے بڑے اہتمام سے پیتے تھے۔ کہیں آتے جاتے نہیں تھے۔ کسی سے ملتے جلتے نہیں تھے۔ جتنا وقت ملتا تھا مطالعہ میں گزارتے تھے۔ ہزاروں شعر اُردو فارسی کے اُنہیں یاد تھے۔ اپنے مضامین میں ان اشعار کا نہایت موزوں صرف کرتے تھے۔ میر صاحب جیسی نثر کسی اور کو لکھنی نصیب

نہ ہوئی۔ مرض الموت میں شدید تکلیف اٹھائی مگر پیشانی پر شکن تک نہ آئی۔ بڑے صابر و ضابط آدمی تھے۔ مرنے سے کچھ دیر پہلے بیٹے نے مزاج پرسی کی تو بولے......

سفینہ جب کہ کنارے پہ آلگا غالبؔ
خدا سے کیا ستم و جورِ ناخدا کہئے

نواب سراج الدین احمد خاں سائلؔ دہلوی

گورا رنگ، کشادہ پیشانی، غلافی آنکھیں، سنہرے فریم کی عینک، ستواں ناک، موزوں دہن، کتر واں لبیں، بھرواں گول سفید ڈاڑھی، بھاری ڈیل، سرو قد، اونچی چولی کا انگرکھا، آڑا پاجامہ، پاؤں میں وارنش کا پمپ شو، دائیں ہاتھ میں چھڑی، بائیں ہاتھ میں لمبا سا سگار، بڑے شاندار آدمی تھے نواب سائلؔ، لوہارو کے نواب زادوں میں سے تھے، بہت بڑے اور مشہور شاعر، اور اس سے بڑھ کر شریف انسان۔ فصیح الملک داغؔ کے داماد تھے اور شاگرد بھی، داغؔ کا جب انتقال ہوا اور جانشینی کا جھگڑا آن پڑا تو سائلؔ نے اعلان کر دیا کہ داغؔ کے سب شاگرد داغؔ کے جانشین ہیں، اس زمانہ میں بہت سے اُستاد اپنے نام کے ساتھ جانشین داغؔ لکھتے تھے مگر نواب سائلؔ نے کبھی اس کا ادّعا نہیں کیا۔ مشاعروں میں اکثر شریک ہوتے اور اپنے مخصوص ترنم میں غزل سناتے تھے، مگر جب مشاعروں میں بیہودگیاں ہونے لگیں تو نواب سائلؔ نے شریک ہونا چھوڑ دیا تھا۔ بیخودؔ دہلوی بھی داغؔ کے ارشد تلامذہ میں سے تھے اور سائلؔ کو اپنا حریف سمجھتے تھے، اُستاد بیخودؔ تحت اللفظ میں پڑھتے تھے اور انہیں بھی داد بہت ملتی تھی مگر سائلؔ کا ترنم مشاعرہ لوٹ لیتا تھا اس پر بیخودؔ جھنجلا جاتے اور جو منہ میں آتا کہنا شروع کر دیتے۔ سائلؔ بہت سمائی کے آدمی تھے، خاموش رہتے مگر ان کے شاگرد بھڑک اٹھتے اور دونوں اُستادوں کے شاگردوں میں فساد ہو جاتا۔ نتیجہ یہ کہ ایک زمانہ میں مشاعرے ہی بند ہو گئے تھے مگر اس درجہ اختلاف پر بھی ان دونوں بزرگوں میں خلوص و محبت کے تعلقات آخر تک قائم رہے، نواب سائلؔ نے اپنے بیٹے کو اُستاد بیخودؔ کی شاگردی میں دے رکھا تھا۔

مرنے سے چند سال پہلے نواب سائلؔ کے کولہے کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی اور وہ چلنے پھرنے سے معذور ہو گئے تھے۔ گھر پر انہوں نے ایک رکشا رکھ لی تھی، اسی میں آتے جاتے تھے، روزانہ شام کو اُردو بازار میں ایک کتب فروش کی دُکان کے آگے وہ اپنی رکشا میں بیٹھے دکھائی دیتے، یہیں ان سے بہ آسانی ملاقات ہو جاتی تھی، ایک دفعہ آبدیدہ ہو کر فرمایا......

''مجھے وہ وقت یاد آتا ہے جب میرے والد کی ڈیوڑھی پر ان کا ہاتھی آتا تھا، میں لپک کر اس کی دم پکڑ کر چڑھ جاتا تھا، یا اب یہ وقت ہے کہ دو قدم بھی نہیں چل سکتا۔''

اُردو فارسی میں ان کی قابلیت مسلم تھی، پنجاب یونیورسٹی کے ممتحن بھی تھے، چھوٹے بڑے سب سے اچھی طرح پیش آتے تھے اس لئے اکثر طالب علم انہیں گھیرے رہتے تھے، چھوٹے بڑے سب سے اچھی طرح پیش آتے تھے اس لئے اکثر طالب علم انہیں گھیرے رہتے تھے۔ ایک دن اس شعر پر چند دوستوں میں بحث چل نکلی......

خواہیم از حسد او نخواہیم از خدا
دیدن رخ حبیب و نہ دیدن رُخِ رقیب

لف ونشر مرتب کے اعتبار سے اس شعر کی صورت یوں بنتی ہے......

خواہیم از خدا دیدن رُخِ حبیب
نخواہیم از خدا نہ دیدن رُخِ رقیب

لہٰذا شعر کا مطلب خبط ہو جاتا ہے، چنانچہ یہ مسئلہ نواب سائلؔ کے سامنے پیش کیا گیا۔ پہلے تو وہ بھی چکرائے مگر غور کرنے کے بعد بولے۔ ''کتابت کی غلطی معلوم ہوتی ہے، رقیب کے بدلے حبیب ہونا چاہیئے۔''

نواب سائلؔ بلیرڈ بہت اچھی کھیلتے تھے، کلبوں میں انگریز ان کے ساتھ کھیلنے کے خواہش مند رہتے تھے، لباس تراشنا بہت اچھا جانتے تھے، انگرکھا، سوٹ، اووَر کوٹ، شیروانی، ہر لباس تراش لیتے تھے، کاڑھنا بھی خوب جانتے تھے، کسی پر مہربان ہوتے تو اسے اپنے ہاتھ کا کڑھا ہوا رومال عنایت فرماتے تھے۔ آخر میں

مثنوی جہانگیر و نور جہاں لکھ رہے تھے، کئی لاکھ شعر کہہ چکے تھے، مگر یہ مثنوی ختم نہیں ہوئی اور عمر تمام ہو گئی۔

نواب شجاع الدین احمد خاں تاباںؔ دہلوی

نواب سائلؔ کے بڑے بھائی تھے نواب تاباںؔ۔ بالکل اُن ہی کی طرح میدہ و شہاب رنگ، ویسا ہی ڈیل ڈول، ناک نقشہ اور لباس۔ مگر دونوں بھائیوں کے مزاج میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ بڑے بھائی کو چھوٹے بھائی سے نہ جانے کیا کد تھی کہ ہمیشہ برا بھلا ہی کہتے رہتے تھے بلکہ برملا گالیاں تک دینے سے نہ چوکتے تھے اور گالی بھی ایک سے ایک نئی تراشتے تھے۔ سائلؔ بیچارے سر جھکا کر کہتے۔ ''بھائی جان، آدھی مجھ پر پڑ رہی ہیں اور آدھی آپ پر۔'' اس پر وہ اور بھڑک اٹھتے اور وہ ملاحیاں سناتے کہ دھری جائیں نہ اٹھائی جائیں۔ مگر کیا مجال جو سائلؔ صاحب کی تیوری پر بل آ جائے، وہ بھائی کی بزرگی کا اتنا احترام کرتے تھے کہ اونچی آواز میں بھی ان کے سامنے نہیں بولتے تھے۔

نواب تاباںؔ بھی شاعر تھے، اُردو میں بھی شعر کہتے تھے اور فارسی میں بھی۔ حکیم اجمل خاں کے ہاں شرفائے دہلی کا جمگھٹا رہتا تھا۔ حکیم صاحب بھی طرفہ خوبیوں کے آدمی تھے، یہ جتنے بڑے طبیب تھے اتنے ہی بڑے شاعر بھی تھے، ایک دفعہ شبلی نعمانی دلی آئے تو حکیم صاحب کے ہاں مہمان ہوئے۔ نواب تاباںؔ کی تعریف غائبانہ بہت کچھ سن چکے تھے، ان سے ملنے کے خواہش مند ہوئے، حکیم صاحب نے سوچا کہ نواب صاحب کو اگر یہاں بلایا گیا تو کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ اس بات کا برا مان جائیں، لہٰذا ایک صاحب کے ساتھ شبلی کو ان کے گھر بھیج دیا۔ نواب صاحب نے بڑے تپاک سے ان کا خیر مقدم کیا، عزت سے بٹھایا، خاطر تواضع کی۔ شبلی کی فرمائش پر اپنی غزل سنانی شروع کی، شبلی بھی ذرا مدمغ آدمی تھے خاموش بیٹھے سنتے رہے، تاباںؔ نے دیکھا کہ مولانا ہوں ہاں بھی نہیں کرتے تو چمک کر بولے۔ ''ہاں صاحب، یہ شعر غور طلب ہے۔'' یہ کہہ کر غزل کا اگلا شعر سنایا۔ مولانا نے اوپری دل سے کہا۔ ''سبحان اللہ! اچھا شعر کہا ہے آپ نے۔'' بس پھر

تاباںؔ آئیں تو جائیں کہاں؟ بولے۔ ''ابے لنگڑے! میں نے تو یہ شعر تین دن میں کہا اور تو نے ایک منٹ میں اسے سمجھ لیا؟ بیٹا، یہ شعر العجم نباشد!'' اس کے بعد ان کا گالیوں کا پٹارہ کھل گیا اور مولانا شبلی کو اپنا پنڈ چھڑانا مشکل ہو گیا۔ ویسے اپنی روزمرہ کی زندگی میں تاباںؔ بڑے زندہ دل آدمی تھے اور دوستوں کو کھلا پلا کر خوش ہوتے تھے، شطرنج کی انہیں دھت تھی اور چال بھی اچھی تھی، بڑے بڑے کھلاڑی ان کے ہاں آتے رہتے تھے۔

اُستاد بیخوؔد دہلوی

یہ صاحب جو ٹمیا محل سے ٹُلکتے ٹُلکتے چلے آرہے ہیں، گندمی رنگ، بڑی سی پھریری داڑھی، ہاتھوں میں ہزار دانہ سنبھالے، اُستاد بیخوؔد ہیں، ٹانگیں دیکھئے ذرا ان کی، کمانیں بنی ہوئی ہیں، جوانی میں گھڑسواری کا شوق تھا، منہ زور سے منہ زور گھوڑا ان کی ران تلے چیں بول جاتا تھا۔ ہم نے اُنہیں اسّی برس کی عمر میں بھی گھوڑے پر سُدھ بیٹھے دیکھا ہے، ان کے والد سو سے اوپر ہو کر مرے تھے، میر صاحب بھی سو کے قریب ہو کر گئے ہیں۔

دِلّی والوں کی ٹکسالی زبان بولتے ہیں، روزانہ شام کو ٹہلنے نکلتے ہیں۔ یادگار کا ایک چکر کاٹ کر اُردو بازار میں وصی اشرف کے کتب خانہ پر ٹھیکی لیتے ہوئے واپس جاتے ہیں، انہوں نے بڑے بڑے پُرانوں کی آنکھیں دیکھی ہیں۔ مرزا غالبؔ کو جب انہوں نے دیکھا تو ان کی عمر پانچ سال کی تھی۔ مرزا کے دیوان کی شرح بھی انہوں نے لکھی ہے، باتیں بڑے مزے کی کرتے ہیں۔ کتب خانہ پر جم جاتے ہیں تو ان کی باتیں سننے کے لئے ہم انہیں چھیڑ دیتے ہیں۔

''کیوں میر صاحب، کیا دشنہ اور خنجر ایک ہی چیز کو کہتے ہیں؟''

میر صاحب۔ ''اماں دشنہ دشنہ ہوتا ہے اور خنجر خنجر ہوتا ہے، بھلا دشنہ خنجر کیسے ہو سکتا ہے اور خنجر دشنہ کیسے ہو سکتا ہے؟''

اسی سے ملتا جلتا جواب پالکی نالکی کے لئے بھی ملتا ہے۔ کتب خانہ سے روزانہ ایک

ناول پڑھنے کے لئے لے جاتے ہیں اوراگلے دن یہ کہہ کردے جاتے ہیں کہ "اس میں مزہ نہیں آیا، کوئی اوراچھا سا دو۔" یوں اُردو کے اچھے بُرے سارے ناول چاٹ گئے ہیں۔

کسی کو شاگرد بناتے ہیں تو اس سے باقاعدہ مٹھائی لیتے ہیں، داغ کے چہیتے شاگرد ہیں، اُستاد کے پاس برسوں رہے۔ داغ کے شاگردوں کے چاروں رجسٹر انہی کے پاس رہتے تھے۔

کبوتر اڑانے کا شوق تھا، جن بھوت بھی اتارتے تھے، ایک دن پوچھا۔ "اُستاد آپ جن بھوت کیسے اتارتے ہیں؟" فرمایا۔ "جب حرامزادی کی چوٹی میں تین بل دے کرناک میں مرچوں کی دھونی دیتا ہوں سروالا فوراً غائب ہو جاتا ہے۔"

خواجہ ناصر نذیر فراقؔ دہلوی

دِلّی کے پرانے خاندانوں میں سے ایک خاندان خواجہ میر دردؔ کا ہے، فراقؔ اسی خاندان کے چشم و چراغ تھے، جاڑوں میں روئی کا پاجامہ پہنے ہم نے انہی کو دیکھا۔ گول چہرہ، گول داڑھی، رنگ کھلتا ہوا، دہرا بدن، شعر تو اتنا اچھا نہیں کہتے تھے مگر نثر لاجواب لکھتے تھے، شمس العلما، محمد حسین آزادؔ کے شاگرد تھے۔ فراق صاحب درویش صفت بزرگ تھے۔ عمر بہت زیادہ نہیں تھی مگر ہاتھوں میں رعشہ آگیا تھا، ایک زمانہ میں مسجد فتحپوری کے مدرسہ کے مُدرّس تھے، میرے والد سے ان کے برادرانہ تعلقات تھے، جب میں نے صحافت کی دُنیا میں قدم رکھا تو ان کی خدمت میں بھی حاضر ہوا، خواجہ میر دردؔ کی بارہ دری میں ان کا ایک چھوٹا سا مکان تھا، وہیں قریب ایک بیٹھک میں مطب کرنے لگے تھے، کبھی مخزن میں لکھا کرتے تھے، اس کے بعد ان کے لکھنے پڑھنے کا شوق ختم ہوگیا تھا، مخزنؔ میں ان کے مضامین بھی پڑھے اوران کی جوانی کی تصویر بھی دیکھی۔ اس سے مجھے اشتیاق ہوا کہ ان سے ضرور لکھوانا چاہیے۔ جب میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو گلے لگا کر رونے لگے اور بولے۔ "بھتیجے کے لئے نہیں لکھوں گا تو اور کس کے لئے لکھوں گا۔" چنانچہ "لال قلعہ کی ایک جھلک" انہوں نے قسط وار "ساقی" میں لکھی۔

آخری بار جب میں حاضر ہوا تو پلنگ پر لحاف اوڑھے بے حس و حرکت پڑے ہوئے تھے۔ صاحبزادہ ناصر خلیق فگار کو پاس بلا کر بولے۔ ''ننھے، ہمارے مرنے کی خبر انہیں ضرور کر دینا۔'' غریب آدمی تھے، مگر محبت و خلوص کی دولت سے مالا مال۔ بہت بھولے آدمی تھے۔ سید احمد مؤلف فرہنگ آصفیہ نے کسی موقع پر انہیں بادشاہِ اُردو کہہ دیا تھا۔ مرحوم ان کے اس قول کو اکثر دہرایا کرتے تھے۔

میرے بیٹھے پر ایک دفعہ بیخود صاحب ان سے ملنے آ گئے۔ دونوں تقریباً ہم عمر ہی تھے۔ گرمجوشی سے ملے۔ منجملہ اور باتوں کے فراق صاحب نے فرمایا۔ ''دِلّی میں اب کیا رہ گیا ہے؟ نظم کے یہ بادشاہ ہیں اور نثر کا میں۔'' میں نے کہا۔ ''اس میں کیا شک ہے۔'' جب بیخود صاحب چلے گئے تو بولے۔ ''اور یہ بھی کیا رہ گئے ہیں؟ بس میں ہی رہ گیا ہوں۔''

اسی بھولپن میں بعض باتیں بڑی عجیب بھی کہہ جاتے۔ مثلاً یہ کہ لال قلعہ جب بن رہا تھا تو لوہے کے بڑے، بڑے کڑھاؤ چڑھے ہوئے تھے۔ ان میں چربی کھولتی رہتی تھی۔ مٹی کی اینٹ جب بن جاتی تو پہلے اس چربی میں پکائی جاتی۔ جب خوب سرخ ہو جاتی تو اسے نکال کر دیوار میں چن دیا جاتا۔

فرماتے تھے کہ سندر بن میں ہم نے ایک پرندہ ایسا دیکھا جس کا صرف ایک بازو تھا۔ دوسرے بازو کی جگہ ہڈی کا صرف آنکڑا سا تھا۔ نر کا دایاں پر ہوتا تھا اور مادہ کا بایاں۔ جب انہیں اڑنا ہوتا تو نر اور مادہ آنکڑے میں آنکڑا ڈال کر پھر سے اُڑ جاتے۔

اُن کی ایسی بے پر کی اُڑانے میں بھی ایک لطف تھا۔

میر باقر علی دہلوی داستان گو

املی کی پہاڑی پر ایک بڑے میاں رہتے تھے، دُبلا ڈیل، اکہرا بدن، میانہ قد، چھوٹی سفید داڑھی، کبھی خاصے آسودہ حال تھے مگر اب اُجلے پوشی سے گزارا کرتے تھے۔ بڑے چرب زبان اور لسّان آدمی تھے، نام تھا میر باقر علی۔ یہ دلی کے آخری داستان گو

تھے، جب یہ فن زندہ تھا اور اس کے قدردان بھی زندہ تھے تو میر صاحب دُور دُور بلائے جاتے تھے اور جھولیاں بھر بھر کے لاتے تھے۔ جب زمانہ کے مشاغل بدل گئے اور میر صاحب کا فن کس مپرسی میں پڑ گیا تو میر صاحب چھالیا بیچنے لگے تھے۔ دلی میں کسی کے ہاں داستان کہنے جاتے تو دو روپے لیا کرتے۔ پھر ایک دور ایسا آیا کہ لوگوں کو دو روپے بھی اکھرنے لگے تو میر صاحب نے اپنے گھر ہی میں داستان کہنی شروع کر دی اور ایک آنہ ٹکٹ لگا دیا، دس بیس شائقین آ جاتے اور میر صاحب کو روپیہ سوا روپیہ مل جاتا، امیر حمزہ کی داستان سنایا کرتے تھے۔ بعض دفعہ سامعین کی فرمائش پر کسی ایک پہلو کو بیان کرتے۔ کوئی کہتا میر صاحب آج تو لڑائی کا بیان ہو جائے اور میر صاحب رزم کو اس تفصیل سے پیش کرتے کہ آنکھوں کے سامنے میدان جنگ کا نقشہ قائم ہو جاتا، ہتھیاروں کے نام گنانے پر آتے تو سو سوا سو نام ایک ہی سانس میں گنا جاتے، اور یہ نام انہیں صرف رٹے ہوئے نہیں تھے، ٹوک کر چاہے جس ہتھیار کو ان سے پوچھ لیجئے۔ اس کی صورت شکل اور اس کا استعمال بتا دیتے تھے۔ کوئی کہتا۔ ''میر صاحب، آج تو عیاریاں بیان ہو جائیں۔'' اور میر صاحب عیاریوں کے کارنامے بیان کرنے لگتے، ساتھ ساتھ اداکاری بھی کرتے جاتے، اور سننے والے ہنستے ہنستے لوٹ جاتے۔ میر صاحب کے علم کی کوئی تھاہ نہیں تھی۔ ہر علم میں تیرے ہوئے تھے اور یہ ان کے فن کا تقاضا بھی تھا۔

بڑھاپے میں میر صاحب نے مدرسہ طبیہ میں باقاعدہ طب بھی پڑھی تھی، مگر مطب کبھی نہیں کیا، ان کی اکلوتی بٹیا البتہ طبیبہ تھیں اور زنانہ مطب بھی کرتی تھیں۔

میر صاحب کو افیون اور حقے کا شوق تھا، داستان شروع کرنے سے پہلے چاندی کی کٹوری میں روئی میں لپیٹ کر افیون گھولتے تھے، اس گھولوئے کی چسکی لگاتے، حقے کا کش لیتے اور داستان شروع کر دیتے۔ چائے کا بھی شوق تھا، اس کی تین صفتیں بتاتے تھے، لب بند، لبریز اور لب سوز یعنی اتنی میٹھی ہو کہ ہونٹ چپک جائیں، پیالی لباب بھری ہو اور خوب گرم ہو۔

میر صاحب کے شناسا میر محمود علی صاحب نے بتایا کہ کلکتہ میں ایک دفعہ لکھنؤ کے

ایک داستان گو کی دھوم مچی۔ ایک دن ہم بھی سننے گئے تو دیکھا کہ داستان گو صاحب کے آگے طلسم ہوشربا کھلی دھری ہے، اس میں سے پڑھتے جاتے ہیں اور جب بہت جوش میں آتے ہیں تو ایک ہاتھ اونچا کر لیتے ہیں، طبیعت بہت مکدر ہوئی۔ جی چاہا کہ کسی طرح میر باقر علی یہاں آجاتے تو کلکتہ والوں کو معلوم ہوتا کہ داستان گوئی کسے کہتے ہیں۔ نہ سان نہ گمان، اگلے دن کیا دیکھتے ہیں کہ وٹولہ میں میر صاحب سامنے سے چلے آرہے ہیں۔ معلوم ہوا کہ اپنے کسی کام سے آئے ہیں، قصہ مختصر میر صاحب کی داستان ہوئی اور لکھنوی داستان گو ہاتھ جوڑ جوڑ کر کہتا تھا۔ ''حضور یہ اعجاز ہے، حضور یہ آپ ہی کا حصہ ہے۔''

میر جالبؔ دہلوی

میر باقر علی کے ایک دوست تھے میر جالبؔ دہلوی۔ قدوقامت میں انہی جیسے، صورت شکل اور وضع قطع میں بھی ان سے مشابہ، اتنا بڑا صحافی اُردو صحافت نے آج تک پیدا نہیں کیا، کتابیں پڑھنے کا انہیں بچپن سے شوق۔ تھا جو کتاب، رسالہ، اخبار ہاتھ لگ گیا اسے شروع سے آخر تک پڑھ ڈالتے۔ اخباروں کے اشتہارات تک نہیں چھوڑتے تھے۔ بازار میں کوئی چھپا ہوا کاغذ پڑا مل جاتا تو اُسے اُٹھالیتے اور گھر آکر اسے پڑھتے۔ غریب گھر میں پیدا ہوئے تھے، اسکول کی تعلیم کا خرچ پورا کرنے کے لئے بچوں کو پڑھاتے تھے، اس زمانہ میں سستے ناولوں کے ترجموں کی مانگ تھی، میر صاحب نے اس کام کی طرف بھی توجہ کی، مولوی عنایت اللہ اور قاری سرفراز حسین سے مشورہ اور اصلاح لینے لگے، یوں ترجمہ کرنے کی بھی انہیں اچھی مشق ہوگئی۔ اب انہیں اخبار نویسی کی چینٹک لگی۔ دلی میں اس وقت کوئی قابل ذکر اخبار نہیں تھا اس لئے میر صاحب لاہور پہونچے اور ایک اخبار میں تیس روپے پر ملازم ہو گئے، اس تیس روپے سے ان کی اخباری زندگی شروع ہوئی اور مرتے دم تک وہ اخباری سلسلہ ہی میں ترقی کرتے چلے گئے، انتخاب، لاجواب، پیسہ اخبار، اور وکیل کی ادارت نے ان کی منفرد حیثیت قائم کردی،

جب مولانا محمد علی نے دلی سے ہمدرد جاری کیا تو میر صاحب کو اپنے اخبار میں بلالیا، میر صاحب چھاپہ مشین کے کابلے سے لے کر چھپے ہوئے پرچہ کی تقسیم تک ہر کام سے واقف تھے، ایسا کام سنبھالا کہ مولانا محمد علی بالکل نچنت ہو گئے، ہمدرد کے بند ہو جانے پر میر صاحب کلکتہ چلے گئے اور جب لکھنؤ سے راجہ محمود آباد نے ''ہمدم'' نکالا تو اس کی ادارت کے لیے راجہ صاحب کی نظرِ انتخاب میر صاحب ہی پر پڑی۔ ''ہمدم'' کے بعد میر صاحب نے اپنا اخبار ''ہمت'' جاری کیا جوان کی زندگی کے ساتھ ختم ہوا۔

میر صاحب چلتے پھرتے انسائیکلو پیڈیا تھے، ہر چیز کے متعلق ان کی معلومات اتنی زیادہ تھیں کہ اگر کوئی ان کی تقریر سن لے تو چھوٹی موٹی کتاب تیار کر لے۔ لوگ ان سے کوئی سوال پوچھ کر گنہگار ہو جاتے تھے، میر صاحب کا لیکچر شروع ہونے کے بعد ختم ہونے میں نہ آتا تھا۔ ایک دفعہ میر صاحب کے جاننے والے غلطی سے ان سے کچھ پوچھ بیٹھے۔ میر صاحب نے وہیں اپنی معلومات کا پٹارہ کھول دیا۔ جب وہ صاحب کھڑے کھڑے تھک گئے تو آہستہ آہستہ اپنے گھر کی طرف چلنے شروع ہوئے۔ میر صاحب بھی ان کے ساتھ ساتھ چلتے رہے اور بولتے رہے۔ ان صاحب کا گھر آ گیا تو وہ رُک گئے۔ میر صاحب بھی رک گئے مگر اپنی معلومات سے اُنہیں مستفیض فرماتے رہے۔ وہ گھبرا کر اپنی ڈیوڑھی میں گھس گئے تو میر صاحب بھی ان کے پیچھے پیچھے ڈیوڑھی میں داخل ہو گئے۔ انہوں نے جب میر صاحب کو ذرا غافل پایا تو چپکے سے سٹک گئے۔ میر صاحب در و دیوار ہی سے باتیں کرتے رہے۔ یہاں تک کہ جب انہیں ہوش آیا تو دیکھا کہ کوئی متنفس نہیں ہے۔ حیران ہوئے کہ میں یہاں کیسے اور کیوں آ گیا؟ ڈیوڑھی میں سے جلدی سے نکل اپنے گھر کی راہ لی۔ دراصل میر صاحب بھی چنیا بیگم کے عاشق تھے اور اس کی جھونک میں اُنہیں دین دُنیا کی خبر نہیں رہتی تھی۔

میر صاحب بہت باقاعدہ آدمی تھے، ردّی سے ردّی اخبار کو بھی پڑھتے تھے اور اس کا فائل بنا لیتے تھے۔ جتنے خط ان کے پاس آتے تھے سب کو محفوظ رکھتے تھے، ان کے کتب خانہ میں کئی ہزار نایاب کتابیں تھیں، افسوس! ان کے انتقال کے بعد ان

کا سارا بیش قیمت سرمایہ یا تو دیمک نے کھایا، یا چولھا جلنے کے کام آیا، غالباً پانچ ہزار کتابیں ان کے پوتے جمیل جالبی نے جامعہ ملیہ دہلی کو دے دی تھیں۔ یقین ہے کہ جب ۴۷ء میں جامعہ کے کتب خانہ کو فسادیوں نے جلایا، تو اُس میں یہ پیش قیمت سرمایہ بھی جل گیا ہوگا۔

ملاّ واحدیؔ دہلوی

کوچہ چیلاں میں جہاں میر جالب کا مکان تھا اس سے ذرا اور آگے بڑھ کر ملا واحدی کا مکان تھا۔ جالبی صاحب کی طرح واحدی صاحب کا مکان بھی ایک تاریخی حیثیت رکھتا ہے، ادب، مذہب، صحافت اور سیاست کی اکثر شخصیتوں نے اسی مکان میں فروغ پایا۔ خواجہ حسن نظامی، نیاز فتحپوری، دیوان سنگھ مفتون، عارف ہسوی اور بہت سوں نے یہیں سے نام پایا۔ یہاں سے متعدد رسالے جاری ہوئے، واحدی صاحب عمر بھر بڑے خاموش اور مخلص کارکن رہے۔ نام ونمود کی انہوں نے کبھی پروانہیں کی۔ دوستوں کے دوست بلکہ دشمنوں کے بھی دوست رہے۔ دلی میں ان کی بہت جائداد تھی، خدمت کے جنون نے اُنہیں کھکھ کر دیا۔ آخر میں بس یہی ایک مکان رہ گیا تھا جس میں ۴۷ء تک رہے، دلی سے اُنہیں عشق تھا، کہیں باہر نہیں رہ سکتے تھے۔ شملہ گئے تو ایک گاڑی سے گئے اور دوسری سے لوٹ آئے۔ واحدی صاحب بڑے محنتی اور اصولی آدمی ہیں۔ انہوں نے اپنی زندگی میں بہت کام کیا۔ بیسیوں ایڈیٹر اور سینکڑوں ادیب پیدا کئے، خواجہ حسن نظامی اپنی ابتدائی زندگی میں واحدی صاحب ہی کے رہینِ منت رہے، خواجہ صاحب نے بھی آخری وقت تک حق دوستی نبھایا۔ علامہ راشد الخیری سے ''شام زندگی'' واحدی صاحب ہی نے لکھوائی۔ علامہ آزاد مزاج آدمی تھے، دنوں قلم ہاتھ میں نہیں لیتے تھے، لوگ خوشامدیں کرتے، معاوضے پیشگی دے جاتے مگر وہ توجہ نہ کرتے، واحدی صاحب نے نہ جانے کیا منتر پڑھا کہ علامہ کو سولہ آنے اپنے قبضہ میں کرلیا، روزانہ انہیں ایک کمرہ میں بند کر کے باہر سے قفل ڈال دیتے، اور جب مقررہ صفحوں کی تعداد پوری ہو

جاتی تو اُنہیں کھول دیتے۔ یوں یہ پوری کتاب لکھوائی گئی۔

خواجہ حسن نظامی دلی سے تین میل کے فاصلہ پر بستی نظام الدین میں رہتے تھے مگر روزانہ واحدی صاحب کے ہاں آتے اور اُن ہی کے ہاں بیٹھ کر تصنیف و تالیف کا کام کرتے۔ خواجہ صاحب اور واحدی صاحب کے ایک اور مخلص دیرینہ بھیا احسان تھے جو تھے تو میرٹھ کے رئیسوں میں سے مگر رہتے دلی میں تھے۔ واحدی صاحب کی طرح یہ بھی وضعدار اور دل والے تھے۔ ادب کا چسکا اور اخبار کا روگ انہیں بھی ساری عمر لگا رہا۔

۴۷ء کے فسادات میں واحدی صاحب کو بھی دلی چھوڑنی پڑی، یہ گویا ناخن کا گوشت سے جدا ہونا تھا، کراچی کے ایک سرکاری کوارٹر میں اپنے بیٹے کے ساتھ انہیں رہنا پڑا۔ دنوں ان کی آنکھ کا آنسو نہ تھما۔ اس غم کو بھلانے کے لئے واحدی صاحب نے کتابیں لکھنی شروع کیں اور رفتہ رفتہ انہیں صبر آ گیا، خواجہ صاحب، بھیا احسان اور دُوسرے سب ساتھی رخصت ہو گئے، یہ سب کے ماتم میں سروِ چراغاں ہیں۔

علامہ راشد الخیری دہلوی

یہ جو ایک بڑی نورانی شکل کے بڑے میاں شپڑ شپڑ کرتے چلے آ رہے ہیں علامہ راشد الخیری ہیں، انہوں نے اپنی ساری عمر اسی قلندرانہ وضع میں گزار دی، کبھی اپنا حلیہ دُرُست کرنے کا اُنہیں خیال نہیں آیا، دراصل انہوں نے اپنی زندگی اپنے لیے نہیں بلکہ دوسروں کے لئے وقف کر رکھی ہے، سادگی ان کا خاصۂ طبعی ہے، بڑے آدمی ہیں مگر چھوٹے آدمیوں کی خدمت کر کے انہیں خوشی حاصل ہوتی ہے۔ پاس پڑوس، رشتہ کنبہ، دوست احباب میں گھوم پھر کر سب کی خیریت معلوم کرتے ہیں، کسی کی تکلیف ان سے دیکھی نہیں جاتی، دامے درمے، قدمے، سخنے ہر طرح مدد کرنے کو تیار رہتے ہیں۔ رانڈ بیواؤں کا ان کے گھر میں تانتا بندھا رہتا ہے۔ ان کی بیگم بھی انہیں کے مزاج کی آدمی ہیں، کسی کو کچھ دیتے ہیں تو سیدھے ہاتھ کی خبر اُلٹے ہاتھ کو نہیں ہوتی۔

رات کا وقت، پڑوس میں سے کسی عورت کے رونے کی آواز آئی۔ مولانا بے

قرار ہو کر اٹھے۔ جا کر پوچھا تو معلوم ہوا شام تک پھلر واسا لال کھیلتا ملتا رہا۔ گلے میں کچھ یونہی سی تکلیف تھی، اب لحظہ لحظہ اس کی حالت بگڑتی جا رہی ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے بچہ ہاتھوں میں آ گیا۔ مولانا نے دلاسا دیا، فوراً تانگہ کر کے نئی دلی پہونچے اور اپنے ساتھ ڈاکٹر چاؤلہ کو لے کر آئے، ڈاکٹر نے انجکشن دیا، مولانا نے اسے فیس دی اور ابھی ڈاکٹر ڈیوڑھی تک ہی پہونچا تھا کہ ماں کی دلدوز چیخ نے بچے کی موت کا اعلان کر دیا، گھر والے اتنے نادار تھے کہ کفن دفن کا انتظام بھی مولانا ہی کو کرنا پڑا۔

مولانا نہایت دردمند انسان تھے اس لئے ان کی طبیعت غم پسند ہو گئی تھی۔ زندگی کے غمناک پہلوؤں ہی کو انہوں نے اپنے افسانوں اور ناولوں کا موضوع بنایا۔ سب سے زیادہ مظلوم مخلوق انہیں مسلمان عورت دکھائی دیتی تھی۔ اسی کی حمایت میں وہ عمر بھر لکھتے رہے۔ اپنی موثر غم انگیز تحریر کے باعث وہ مصورِ غم کہلائے۔

جو لوگ حزن پسند ہوتے ہیں عموماً جھلّے مزاج کے بھی ہوتے ہیں مگر مولانا اپنی نجی زندگی میں بڑے خوش مزاج اور بذلہ سنج تھے، خوب ہنستے ہنساتے تھے، بڑے آدمیوں سے ملنے میں انہیں پس و پیش ہوتا تھا مگر برابر والوں اور چھوٹوں سے جی کھول کر باتیں کرتے تھے، دوسروں کی باتوں سے بھی لطف اٹھاتے تھے، خصوصاً جب کسی سے کوئی غلطی ہو جائے۔ ایک بزرگ نے فرمایا:۔

میں ان سے خوب بھینچ بھینچ کر گلے ملا (بھینچ بروزن کھینچ) مولانا پھڑک گئے، پوچھا کیسے ملے؟ وہ بولے بھینچ بھینچ کر، بار بار ان سے پوچھتے تھے اور ہنستے تھے۔ پھر بولے۔ ''اچھا کاغذ قلم لاؤ اور ایک شعر لکھ لو، ابھی موزوں ہوا ہے......

جو پودوں کو پانی دیا سینچ سینچ
لگے ملنے گل بھی گلے بھینچ بھینچ

مولانا کی خوش مزاجی بسترِ مرگ پر بھی قائم رہی۔ جو کوئی بیمار پرسی کو آتا، اس سے ہنسی کی باتیں کرتے۔۔ ان کے بھانجے محمد میاں نے پوچھا۔ ''کیوں ماموں جان،

جارج پنجم کے بعد تو اس کا بیٹا ہی بادشاہ بنے گا؟''

مولانا نے فرمایا۔ ''نہیں آپ کے حق میں وصیت کئے جا رہے ہیں۔''

پنڈت امرناتھ ساحر دہلوی

دِلّی کے آخری دور کے لائق فخر لوگوں میں سے پنڈت جی بھی تھے۔ عمر ستر اور اَسّی کے درمیان، اونچا پورا قد، بہت لمبی چوڑی داڑھی، ریٹائرڈ تحصیلدار تھے، میر ناصر علی کی طرح ان کی پنشن پانے کی مدت بھی ملازمت کی مدت سے تجاوز کر گئی تھی۔ اُردو شاعری کے عاشق اور اُستاد تھے، فارسی میں بھی شعر کہتے تھے، مگر اتنے گہرے اور ادق عرفانی مضامین باندھتے کہ سامعین کے پلے کچھ نہ پڑتا۔ پنڈت جی دلی کے پرانے وضع دار ہندوؤں کا آخری نمونہ تھے، ان کی عبا قبا، جبہ و دَستار دیکھ کر یہ بتانا مشکل ہوتا کہ یہ ہندو ہیں یا مسلمان۔ ہم نے اپنے بڑوں سے سنا ہے کہ دلی کے ہندو مسلمانوں کے لباس اور بول چال میں پہلے کوئی نمایاں فرق نہیں ہوتا تھا۔ پنڈت جی کی زبان بھی چغلی نہیں کھاتی تھی۔ یہی کیفیت ہم نے پنڈت دتاتر یہ کیفؔی اور پنڈت تربھون ناتھ زارؔ کی بھی دیکھی۔ پنڈت جی بہت خلیق اور متواضع آدمی تھے۔ ایک دفعہ چند لڑکے رات کے گیارہ بجے ان کے گھر پہنچ گئے، چوڑی والاں سے جو راستہ بازار سیتارام کو جاتا ہے اس کے سرے پر اُن کا بالا خانہ تھا، کنڈی کھڑکی تو پنڈت جی ہاتھ میں لالٹین لیے زینے پر سے اُترے، پوچھا۔ '' کیسے زحمت فرمائی؟'' لڑکوں نے کہا۔ ''ہمیں آپ کا کلام سننے کا اشتیاق ہے، صبح کی گاڑی سے ہمیں واپس جانا ہے۔'' پنڈت جی نے فرمایا۔ ''کیا مضائقہ ہے۔'' اور خندہ پیشانی سے سب کو اپنے ساتھ اوپر لے آئے۔ کمرہ کھول کر آرام سے بٹھایا، جل پان پیش کیا اور اپنا کلام اُنہیں سنا کر رُخصت کرنے نیچے تک آئے۔

اسکول اور کالج کے لڑکے جب چاہتے پنڈت جی کو مشاعرے کی صدارت کے لئے لے جاتے، بعض بدتہذیب لڑکے پنڈت جی سے بدتمیزی کر جاتے تو پنڈت جی ناراض ہو جاتے۔ مگر پھر فوراً من بھی جاتے، ایک مقامی کالج کے مشاعرے میں ایک

صاحب زادہ نے پنڈت جی کو مخاطب کر کے مطلع پڑھا......

یہ کہنا جا کے بیٹا اپنی ماں سے
کہ تم روٹھی ہو کیوں ابا میاں سے

پنڈت جی کی آنکھیں اُبل پڑیں۔ بولے۔ ''کیا مضائقہ ہے، صاحبزادے تمہارے باپ سے شکایت کروں گا۔'' دوسرے لڑکوں نے کہا۔ ''پنڈت جی اس گستاخ کو معاف کر دیجئے، ہاتھ جوڑ رہا ہے۔'' پنڈت جی مسکرادئے اور بولے۔ ''ادھر لاؤ اسے، میں اس کے کان کھینچوں گا۔'' پھر محبت سے کان کھینچ کر بولے۔ ''کیا مضائقہ ہے، باادب بانصیب بے ادب بے نصیب، جاؤ۔''

پنڈت جی خود بھی سالانہ مشاعرہ بڑے پیمانے پر کرتے تھے۔ مہمانوں کے قیام وطعام کا انتظام کرتے، دور دور سے شعراء ان کے مشاعرے میں شریک ہونے آتے۔ دہلی میں اس مشاعرے کی دھوم مچ جاتی۔ پنڈت جی کے بعد اس شان کے مشاعرے دلی میں دیکھنے میں نہیں آئے۔

مولانا خلیقی دہلوی

اب سے چالیس سال پہلے ''ادب لطیف'' کی تحریک طاعون کی طرح پھیلی، اس کی محرک بڑی حد تک ٹیگور کی '' گیتانجلی'' تھی۔ اس دور کے ادیبوں کو ایک نئی چیز ہاتھ آئی کہ ایسے بھی چھوٹے چھوٹے خیالی مضامین لکھے جاتے ہیں، جن میں خوبصورت فقرے اور اچھوتی ترکیبیں ہوں، چاہے مطلب کچھ بھی نہ نکلتا ہو، نیاز فتحپوری نے '' گیتانجلی'' کا ترجمہ ''عرضِ نغمہ'' کے نام سے کر دیا اور انگریزی سے ناواقف ادیبوں نے اسی انداز پر طبع آزمائی شروع کر دی۔ بعض اچھے ادیب بھی اسی سستے رنگ میں رنگے گئے۔ یلدرم، نیاز، دلگیر، مہدی افادی، ل احمد اور خلیقی دہلوی نے خوب خوب قلم کی جولانیاں دِکھائیں، اس جتھے کے پہلے سرغنہ شاہ دلگیر اکبر آبادی تھے۔ نقاد کے ایڈیٹر، ان کے بعد دوسرے لیڈر نیاز فتحپوری، نگار کے ایڈیٹر، اس ٹولی میں بیان کے ساتھ ساتھ خیال کے بانکپن کا جس

نے سب سے زیادہ لحاظ رکھا، وہ ایک صاحب تھے محمد دین خلیقی دہلوی۔ تھے تو تجارت پیشہ آدمی مگر ادب کا بڑا ستھرا مذاق رکھتے تھے، کوئی اچھوتی ترکیب سمجھ میں آجاتی تو گھنٹوں اس کا لطف لیتے، لکھتے بہت کم تھے اور مختصر لکھتے تھے، مگر جو کچھ لکھتے یہ معلوم ہوتا کہ نگینے جڑ دیے ہیں، جس طرح شاعر اپنی غزل یا نظم سناتا ہے، یہ اپنی نثر سناتے تھے۔ ان کے اکثر فقرے کانوں میں گونج رہے ہیں، کچھ اس طرح کے ہوتے ہیں:۔

''ایک دن بستی والوں نے دیکھا کہ چشمے کا پانی شراب بن گیا ہے۔ شراب اس لئے بن گیا ہے کہ صبح کے وقت قد آدم انسانی آئینے اس میں معتدل کئے جاتے تھے۔'' (یعنی عورتیں اس میں نہایا کرتی تھیں۔)

خلیقی صاحب اپنے نثر پاروں کی داد پاتے تو ازراہ انکسار فرماتے۔ ''ننگ قلم ہوں۔'' باتیں کرنے میں بھی اکثر معلق الفاظ بولتے تھے، یہ عادت غالباً انہیں مولانا عبدالسلام صاحب کی صحبت میں پڑی تھی جن کی عالمانہ خوش گفتاری دور دور مشہور تھی۔ خلیقی صاحب نے زیادہ عمر نہیں پائی۔ انہیں دل کا عارضہ ہوگیا تھا اور یہ بھی انہیں معلوم ہوگیا تھا کہ مرض لاعلاج ہے۔ خاصے بھاری بھرکم آدمی تھے، بیماری میں گھلے چلے گئے۔ فرماتے تھے کہ ''مجھے اس کی خوشی ہے کہ دل کی بیماری سے مر رہا ہوں۔''

قاری سرفراز حسین دہلوی

میرے والد کے پاس جو حضرات اکثر آتے تھے اور جن کے گھر وہ اکثر جایا کرتے تھے، اُن میں ایک ادھیڑ عمر کے آدمی بڑے کلے ٹھلے کے تھے۔ دہرا ڈیل، کسرتی بدن، سر پر کرسٹی کی ترکی ٹوپی، کالا فراک کوٹ، سفید پتلون، پاؤں میں ڈاسن کا کالا شو، دائیں ہاتھ میں چھڑی، بائیں ہاتھ میں سفید دستانے، گول چہرہ، گیہوواں رنگ، کشادہ پیشانی، ستواں ناک، کترواں مونچھیں، مختصر سی خوشنما داڑھی، آنکھوں پر سنہری فریم کا چشمہ، ان سے ہمارے گھر میں پردہ نہیں کیا جاتا تھا۔ ابا انہیں دیکھتے ہی کِھل جاتے اور اپنی ساری سنجیدگی و بردباری بالائے طاق رکھ دیتے۔ یہ تھے قاری سرفراز حسین عزمؔی

دہلوی جو اپنی باتوں سے ظرافت کے پھول کھلاتے رہتے زندہ دل، بڑے خوش کلام، ان کی شخصیت بڑی پہلو دار تھی۔ رنڈیوں کی زندگی پر انہوں نے آٹھ دس ناول لکھے جن میں سب سے مشہور ''شاہد رعنا'' ہے۔ یہ وہی کتاب ہے جسے دیکھ کر مرزا ہادی رسؔوا نے ''امراؤ جان ادا'' لکھی۔ ناولوں کے علاوہ قاری صاحب نے علم الکلام پر بھی ایک کتاب لکھی تھی۔ تبلیغ کے سلسلے میں انگلستان اور جاپان بھی گئے تھے۔

قاری صاحب اس قدر خوش گفتار تھے کہ لوگ ان کی باتیں سننے کے لئے ترستے تھے۔ مذہب، ادب، سیاست، تاریخ، فنون، کسی گھر بند نہیں تھے۔ ایک دفعہ مسوری میں ایک رئیس نے چاہا کہ قاری صاحب ان کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنی باتوں سے ان کا جی بہلائیں، قاری صاحب نے ٹالنے کے لئے کہہ دیا کہ میں سو روپے فی گھنٹہ لوں گا۔ وہ بھی بگڑے دل رئیس تھے۔ دو سو روپے روزانہ قاری صاحب کو دیتے رہے اور قاری صاحب وہ روپیہ انجمن اسلامیہ کو بھیجتے رہے۔

۱۹۱۱ء میں شیخ عبدالقادر کی سرپرستی میں علامہ راشد الخیری نے رسالہ ''تمدن'' جاری کیا، اس کے پہلے پرچے میں قاری صاحب کا بھی ایک مضمون شائع ہوا۔ عنوان تھا ''انسان، فرشتے کی عینک سے''۔ یہ مضمون ڈپٹی نذیر احمد کے نزدیک بہت قابل اعتراض تھا، اس لئے کہ اس میں مذہبی روایات کا مذاق اڑایا گیا تھا۔ ڈپٹی صاحب علامہ راشد الخیری کے پھوپھا تھے۔ فوراً ان کی طلبی ہوئی، ڈپٹی صاحب نے بڑی لعن طعن کی، ان کے بعد قاری صاحب پیش ہوئے۔ ڈپٹی صاحب ان پر بھی خوب برسے، دونوں نے توبہ تلا کی اور معاملہ رفع دفع ہوا، اس کے بعد قاری صاحب نے اپنے کسی مضمون میں مذہب کا مذاق نہیں اُڑایا بلکہ خود مذہب کی طرف ڈھل گئے اور مبلغ بن کر سمندر پار ملکوں میں گئے۔ خوش گفتار تو تھے ہی، تقریر اُردو میں بھی اچھی کرتے تھے اور انگریزی میں بھی۔

آخری عمر میں گوشہ گیر ہو گئے تھے اور کتابیں لکھا کرتے تھے۔ جب ہاتھ میں رعشہ آ گیا تو ایک منشی رکھ لیا تھا۔ قاری صاحب بولتے جاتے اور منشی لکھتا رہتا، مگر قاری صاحب اس سے مطمئن نہیں ہوتے تھے اور کبیدہ خاطر رہتے تھے کہ خود لکھنے کی

کچھ اور ہی بات ہوتی ہے۔

۱۹۳۰ء میں جب میں نے ''ساقی'' جاری کیا تو قاری صاحب نے ایک ناول ''ثروت دُلہن'' اپنے منشی سے لکھوایا۔ یہ ناول قسط وار ''ساقی'' میں شائع ہوا۔

خواجہ حسن نظامی دہلوی

دلی سے تین میل دور بستی نظام الدین میں خواجہ حسن نظامی صاحب رہتے تھے۔ خواجہ صاحب دین اور دُنیا دونوں میں کامیاب رہے، وہ اپنی شہرت اور کامیابی کے لئے ہر ذریعہ اختیار کرتے تھے۔ سب سے پہلے تو ان کی نرالی دھج تھی کہ ہزاروں کے مجمع میں نظر ان ہی پر پڑتی تھی۔ سر پر زرد کلاہ نما ٹوپی، شانوں پر زلفیں لہراتیں، کشادہ پیشانی، سنہری فریم کی عینک، ہونٹوں پر لاکھا جما ہوا، کتروا لبیں، پھریری ڈاڑھی، ٹخنوں تک خاکی جبہ، آنکھوں میں مقناطیسی کشش، تحریر و تقریر دونوں کے بادشاہ تھے۔ سلطان جی کی درگاہ کے مجاوروں میں سے تھے، بچپن ہی میں باپ کے سائے سے محروم ہو گئے۔ پھیری پر کتابیں بیچتے اور اپنا اور اپنی ماں کا پیٹ پالتے مگر جوہر فطری نے انہیں اس پستی پر قانع نہ ہونے دیا اور ایک وقت ایسا آیا کہ خواجہ صاحب آفتاب بن کر چمکے، کئی لاکھ مریدوں کے پیر بنے، پانسو کتابوں کے مصنف اور مؤلف، بیسوں اخبار، رسالوں کے ایڈیٹر، اللہ نے مال دولت سے بھی سرفراز فرمایا، مگر اتنے بلند مراتب حاصل ہونے کے بعد بھی ان کی وضع داری میں فرق نہ آیا، غرور و تکبر ان کے پاس تک نہ پھٹکا۔ جن سے جیسے تعلقات ابتدا میں تھے ویسے ہی آخر تک رہے۔ صرف ایک پرانے رفیق سردار دیوان سنگھ مفتون ایڈیٹر ریاست سے آخر میں بگاڑ ہو گیا تھا۔ خواجہ صاحب نے سردار جی سے بارہا صلح صفائی کرنی چاہی مگر وہ بھی بڑے ہٹیلے آدمی ہیں۔ اپنی ضد پر اڑے رہے اور خواجہ صاحب کے خلاف لکھتے رہے مگر خواجہ صاحب نے ان کی کڑوی کسیلی باتوں کا کوئی جواب نہیں دیا۔

خواجہ صاحب نے تبلیغی کام بھی بہت کیا۔ جب شدھی اور سنگھٹن نے زور باندھا

تو خواجہ صاحب خم ٹھونک کر میدان میں آ گئے۔ سوامی شردھانند سے مباہلہ کرنے کے لئے انہوں نے یہ تجویز پیش کی کہ جامع مسجد کے مینار پر سے دونوں کود پڑیں جو راہ حق پر ہوگا وہ بچ رہے گا، مگر سوامی جی نے اس چیلنج کو منظور نہیں کیا۔

ایک دفعہ ایک معاملہ میں مولانا محمد علی سے خواجہ صاحب کی ٹھن گئی۔ دونوں طرف سے دھواں دھار مضامین لکھے گئے۔ خواجہ صاحب عجیب عجیب سرخیوں کے پوسٹر بھی لکھ کر شہر میں لگواتے تھے۔ مولانا نے خواجہ صاحب ہی کو قد آدم پوسٹر کہنا شروع کر دیا تھا۔ چند بھلے آدمیوں نے بیچ میں پڑ کر اس ناگوار قضیہ کو ختم کرایا۔

خواجہ صاحب کی غیر معمولی کامیابی نے ان کے بہت سے حاسد پیدا کر دئے تھے، ان میں سے بعض ان کی جان کے لاگو بھی ہو گئے تھے۔ ایک دن ایک آریہ سماجی انہیں قتل کرنے کے ارادے سے ان کے کمرے میں گھس آیا۔ خواجہ صاحب بالکل اکیلے تھے مگر ذرا نہ گھبرائے۔ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ڈپٹا۔ ''کیوں آیا ہے؟ واپس چلا جا۔'' وہ ایسا مرعوب ہوا کہ فوراً واپس چلا گیا۔ ایک دفعہ شہر سے اپنی بستی میں رات کو کچھ دیر سے پہونچے، جب ان کی کار گیرج کے قریب پہونچی تو کسی نے تین چار فائر کئے اور بھاگ گیا۔ خواجہ صاحب تو بچ گئے مگر ان کے خسر کے گولی لگی اور انہوں نے وہیں دم دے دیا۔

خواجہ صاحب انگریزی بالکل نہیں جانتے تھے مگر وائسرائے تک سے مل لینے میں انہیں باک نہیں ہوتا تھا۔ حکام سے سفارش کر کے انہوں نے ہزاروں کے کام نکالے، مگر خود کبھی حکام رسی سے فائدہ نہیں اٹھایا۔

بڑی پہلو وار شخصیت تھی خواجہ صاحب کی۔ صوفیٔ صاف باطن تھے، پیر تھے، مسلمانوں کے لیڈر تھے، صاحب طرز انشا پرداز تھے، بہت بڑے صحافی تھے اور بہت بڑے انسان تھے۔

خواجہ حسن نظامی دلی کی تہذیب کے موئثام تھے۔

ان کے مرنے سے مرگئی دلی

مولانا عبدالسلام دہلوی

دلی کے ایک قلندر مزاج بزرگ تھے۔ چار ابرو کا صفایا، گول چہرہ، کھلتا ہوا رنگ، سر پر دو پلی، ململ کا کرتا اور چست پاجامہ، پاؤں میں نری کی جوتی، ان کے علم و فضل کی دھاک بڑے بڑوں کے دلوں پر بیٹھی ہوئی ہے۔ جس علم سے کہو وجود باری تعالیٰ ثابت کر دیتے تھے۔ عربی فارسی کی تمام پرانی کتابیں انہیں از بر تھیں۔ جورو نہ جاتا، اللہ میاں سے ناتا۔ چھڑا دم، کتابیں تھیں اور طالب علم، شاگردی میں مشکل ہی سے کسی کو قبول کرتے تھے، کچھ لیتے لواتے تو تھے ہی نہیں اس لئے ان پر کسی کا بس نہیں چلتا تھا۔ کسی کو شاگرد بناتے تو پہلے اس کا امتحان لیتے اور وہ بھی اتنا سخت کہ شاگرد تو بہ کرتا ہوا وہاں سے بھاگ جائے۔ گرمیوں کی چلچلاتی دھوپ دیکھئے اور شاگرد سے جناب کا یہ ارشاد کہ ''جا بے دھوپ میں کھڑا ہوجا۔'' اب وہ غریب صحن میں کھڑا سنک رہا ہے اور جناب اندر بڑے پنکھا جھل رہے ہیں۔ کسی کو ذرا سی خطا پر در سے باندھ کر مارتے اور اُف تک کرنے کی اجازت نہ دیتے۔ نیا شاگرد پہلے ہی دن بھاگ کھڑا ہوتا، مگر جو ان کی آزمائش کی آگ میں تپ جاتا ہے وہ پھر کندن بھی بن جاتا ہے۔

وہ دیکھئے سامنے سے مولانا جھومتے چلے آرہے ہیں۔ قوی الجثہ آدمی ہیں۔ کوئی انہیں نہ جانتا ہو تو پہلوان سمجھے، سر اور چہرے پر مشین پھری ہوئی ہے، یہ معلوم ہوتا ہے کہ ابھی بھدرا کرا کے چلے آرہے ہیں۔ پان کھاتے ہیں، اونچی آواز میں بولتے ہیں تیل بیچتے ہیں اور روکھی سوکھی کھاتے ہیں۔ صوفی منش ہیں، قوالی شوق سے سنتے ہیں، رنڈیوں کا گانا بھی سن لیتے ہیں۔ صوفیوں کے حلقے میں بیٹھتے ہیں تو ان کے لتے لے ڈالتے ہیں، ان کے علم و فضل کا دریا سب کو تنکوں کی طرح بہالے جاتا ہے، عرسوں میں شریک ہوتے ہیں، ایک عرس میں جہاں بڑا بڑا اجغادری صوفی بیٹھا تھا مولانا بھی تشریف فرما تھے

کہ ایک حسین طوائف لانگتی پھلانگتی آ گئی اور اس کے پیچھے پیچھے اس کی نائکہ بھی۔ ایک دل پھینک صوفی نے جل جلالہ، کہہ کر طوائف کو اپنے پاس بٹھا لیا، مولانا نے نائکہ کی طرف اشارہ کر کے فرمایا......

''یہ عمّا نوالہ، بھی ساتھ ہیں، انہیں بھی سنبھالئے۔''

مولانا نے بلا کا حافظہ پایا تھا۔ دلی کی ایک مشہور طوائف کا مجرا ہو رہا تھا، مولانا نے اسے ٹوک کر کہا......

''کیا پانچ پانچ سات سات شعر کی غزلیں سنا رہی ہو؟ تمہیں جو لمبی سے لمبی چیز یاد ہو سناؤ۔''

طوائف بھی پرانی تعلیم کی عورت تھی۔ سوڈیڑھ سو بند کا ایک خمسہ اس نے شروع کر دیا اور دو گھنٹے کی خبر لائی۔ مولانا ساتھ ساتھ اشعار پڑھتے جاتے تھے اور جب اس نے خمسہ ختم کر دیا تو مولانا نے شروع سے آخر تک لفظ بلفظ وہی خمسہ دہرا دیا۔

مولانا اپنے آگے کسی کو نہیں گانٹھتے تھے۔ جوش ملیح آبادی مولانا کی تعریف سن کر ملنے گئے، مولانا اچھی طرح ملے مگر جب وجود باری تعالیٰ پر جوش صاحب نے اپنے خیالات کا اظہار فرمایا تو مولانا چمک گئے اور بولے......

''تمہارا دماغ شیطان کی کھڈّی ہے۔''

اس کے بعد سینکڑوں شعر اقبالؔ کے سنا ڈالے اور کہا......

''بس شاعر تو اقبالؔ ہے۔''

مولانا حیدر آباد دکن بھی گئے تھے۔ کسی نے مشورہ دیا کہ آپ حضور نظام کی خدمت میں پیش ہو جائیں تو کچھ وظیفہ مقرر ہو جائے گا۔ مولانا نے بگڑ کر کہا......

''اگر تمہارے نظام کی ساری دولت ایک پلڑے میں رکھی جائے اور میرا ایک بوسیدہ سے بوسیدہ بال دوسرے پلڑے میں تو انشاءاللہ میرا بال ہی بھاری اُترے گا۔''

مولانا کو جب جلال آتا تو ان کی تقریر سننے کے قابل ہوتی، نہایت مرصع اور مغلق فقرے بولتے تھے۔ ایک طوائف کے متعلق ارشاد ہوا کہ......

''اس مثلث لحمی کے لئے تو عمودِ ذرّیں ہی چاہئے۔''

مولانا کو لکھنے کا شوق نہیں تھا، ایک آدھ مضمون لکھا بھی تو وہ خاصہ پھسپھسا تھا مگر بولنے میں کوئی ان کے آگے دم نہ مار سکتا تھا۔

مولانا دلی ہی میں رہے اور ہمیشہ اکیلے رہے۔ ۴۷ء کے ہنگامے میں ایک سکھ کرپان لیے مولانا کے گھر میں گھس آیا۔ مولانا نے ایک ڈانٹ پلائی، اس پر کچھ ایسی دہشت طاری ہوئی کہ کرپان اس کے ہاتھ سے گر پڑی اور وہ سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ گیا۔

آغا شاعر قزلباش دہلوی

پنڈت امرناتھ ساحرؔ کے ایک سالانہ مشاعرے میں جس کی صدارت میر ناصر علی کر رہے تھے، ایک بڑے میاں ڈھیلا ڈھالا سا صافہ لپیٹے اپنا کلام سنانے صدر مقام پر ہائے ہائے کرتے آئے۔ گورا رنگ، بڑی بڑی آنکھیں، سفید مونچھیں، داڑھی منڈی ہوئی، ہاتھ پاؤں بے قابو، دوزانو بیٹھنے کے بعد جب سانس ٹھیک ہوگیا تو جناب صدر کی طرف دیکھ کر انہوں نے کہا۔ ''چیں!'' معلوم ہوا کہ اجازت چاہی ہے، پھر رونی آواز میں سامعین سے کہا۔ ''اُستاد کی رباعی تبرکاً پڑھتا ہوں۔'' رُباعی جو پڑھی تو آواز ایسی نکلی جیسے بادل گرج رہا ہو، یاالٰہی یہ ماجرا کیا ہے؟ یا بہ ایں بے نمکی یا بہ ایں شوراشوری؟ معلوم ہوا کہ یہ صاحب جب سناتے ہیں تو اپنی تکلیفیں بھول جاتے ہیں، نام آغا قزلباش ہے۔ داغؔ کے چہیتے شاگرد ہیں۔ تحت اللفظ اپنے اُستاد ہی کی طرح پڑھتے ہیں۔ داغؔ کو پڑھتے نہ سنا ہو تو انہیں سن لو۔ اُستاد کی رُباعی ختم ہوئی تو تحسین وآفرین کے شور سے لالہ پارس داس کی حویلی گونج گئی۔ آغا صاحب نے اپنا کلام سنانا شروع کیا تو ہر ہر شعر پر قیامت برپا ہوتی رہی۔ جب غزل ختم کی تو پھر بیدم ہوگئے اور نقاہت کی وجہ سے خود ڈائس سے نہ اتر سکے۔ ساحرؔ صاحب نے سہارا دے کر اُتارا اور اپنے پاس بٹھا لیا۔ آغا بہت بیمار تھے، تھوڑی دیر بعد چلے گئے، ان کی جوانی مشہور تھی، بڑے دیدار و جوان تھے۔

ہاتھوں ہاتھ لئے جاتے تھے اور سر آنکھوں پر بٹھائے جاتے تھے۔ اب یہ صورت تھی کہ بیماری اور ناداری نے انہیں ایک ڈراؤنی چیز بنا دیا تھا۔ ان کے جاننے والے اب انہیں دیکھ کر آنکھیں چراتے اور دور ہی سے کترا کر نکل جاتے۔ بُرے وقت کا ساتھی کوئی نہیں۔ بچے چھوٹے چھوٹے تھے۔ کوئی سہارا لگانے والا نہیں تھا۔ جن ریاستوں میں جوانی گزاری ان ریاستوں کے رئیس مرکھپ گئے۔ ایسے بوڑھے بیل کو کون بھس دے؟ ناچار اپنے پرانے دوستوں اور قدر دانوں کے گھروں پر جاتے مگر وہ بھی کب تک ساتھ دیتے؟ اُپرانے لگے اور اندر ہی سے کہلوانے لگے کہ ''نہیں ہیں۔''

آغا صاحب شاعر تو بڑے تھے ہی، انہوں نے ناول بھی لکھے اور ڈرامے بھی، پورے قرآن شریف کا ٹکسالی اُردو میں منظوم ترجمہ بھی انہوں نے کیا تھا۔ کاش وہ ترجمہ چھپ جائے۔

آغا کا آخری وقت ایسا خراب ہوا کہ اللہ دشمن کا بھی نہ کرے، کسی دوست کو دیکھا تو آبدیدہ ہو گئے۔ جامع مسجد کو دیکھا تو آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ لال قلعہ کو دیکھا تو رونے لگے۔ غرض یونہی روتے دھوتے دُنیا سے سدھارے۔

مرزا حیرتؔ دہلوی

دریبہ میں پائے والوں کی طرف سے داخل ہو کر چند قدم چلنے کے بعد ایک تین در کی دُکان بائیں ہاتھ کو آتی ہے۔ اس کے تھڑے کی طرف گاؤ تکئے سے لگے ایک بزرگ بیٹھے رہتے تھے، گورا رنگ، سفید براق سر سیدی ڈاڑھا، غلافی آنکھیں، گالوں کی ہڈیاں اُبھری ہوئیں، لبوں پر پان کی سرخی، یہ مرزا حیرتؔ دہلوی تھے، بہت بڑے عالم تھے، مگر دماغ تخریب کی طرف مائل تھا۔ ہنگاموں ہی کو وجہ رونق سمجھتے تھے۔

دلی میں چھاپے کی مشین سب سے پہلے انہوں نے ہی لگائی تھی اور ''کرزن گزٹ'' جاری کیا تھا۔ اس اخبار میں جس کی چاہتے خبر لیتے، جس کی چاہتے ٹوپی اتار لیتے۔ شورش پسند آدمی تھے، نت نئے ہنگام برپا کرتے رہتے

تھے، واقعہ کربلا ہی سے انکار کر دیا تھا اور حساب لگا کر یہ بتایا تھا کہ جس زمانہ میں اس کا واقع ہونا بتایا جاتا ہے گرمی کا موسم ہی نہ تھا بلکہ سخت سردی کا زمانہ تھا، مولانا حالؔی نے مسدس مدو جزر اسلام لکھی تو دنوں اس کی تردید و تضحیک میں مضامین لکھتے رہے۔ حالؔی فرماتے ہیں......

عرب کچھ نہ تھا اک جزیرہ نما تھا

مرزا حیرتؔ نے اس پر فرمایا......

ذرا دیکھئے تو یہ کیا کہہ رہے ہیں
عرب کو جزیرہ نما کہہ رہے ہیں

ڈپٹی نذیر احمد کا ترجمۂ قرآن شائع ہوا تو اس کے فوراً بعد ہی مرزا حیرتؔ کا ترجمۂ قرآن شائع ہو گیا اور اس کا سائز بھی رکھا تو گز بھر کا۔ شبلی نعمانی کے ساتھ حیدرآباد دکن گئے، سر سالار جنگ کی خدمت میں دونوں پہونچے، شبلی نے مرزا کی تعریف کر کے تعارف کرایا، سالار جنگ نے مرزا سے کلام سنانے کی فرمائش کی، مرزا نے شبلی کی ایک تازہ نظم سنانی شروع کر دی۔ شبلی نے ٹھوکا دیا تو چٹکی لے کر انہیں خاموش کر دیا۔ سالار جنگ نے ایک ہزار روپیہ انعام دیا۔ باہر نکل کر شبلی نے کہا......

''یہ کیا حرکت تھی آپ کی؟''

بولے۔ ''تم سناتے تو تمہیں پھوٹی کوڑی بھی نہ ملتی، مجھے ہزار روپے تو مل گئے۔''

جب موالانا محمد علی اور خواجہ حسن نظامی کی چلی تو مرزا حیرت مولانا کے طرفداروں میں ہو گئے اور اپنے اخبار ''دُرۂ عمر'' میں خواجہ صاحب کے خلاف لکھنے لگے، ایک دن مرزا حیرتؔ اپنی دکان پر بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک بدمعاش نے کسی بات پر جھگڑا کر کے ان پر ہاتھ چھوڑ دیا تھا۔ لوگوں نے بیچ بچاؤ کیا مگر اس کمبخت نے ایک جوتا ایسا کھینچ کر مارا کہ مرزا کے منہ پر لگا۔ اس دن کے بعد سے مرزا حیرتؔ نے دکان پر سامنے کے رخ بیٹھنا چھوڑ دیا۔

مرزا حیرت کے انتقال کے بعد ان کا نایاب اور قیمتی کتب خانہ لال کنویں پر ایک کباڑیے کے ہاں برسوں کوڑیوں کے مول بکتا رہا۔

دلی کی یاد آئی تو دلی کی وضعدار ہستیوں کی یاد دل میں چٹکیاں لینے لگی۔ ان کا تذکرہ زُلف یار کی طرح دراز ہی ہوتا چلا جاتا ہے، یا اسے شب فراق کی درازی سے مشابہ سمجھئے۔ آنکھیں اب ان صورتوں کو ڈھونڈتی ہیں اور ماضی کے دھندلکے میں نظریں بھٹک کر مایوس لوٹ آتی ہیں......

وے صورتیں الٰہی کس دیس بستیاں ہیں
اب دیکھنے کو جن کے آنکھیں ترستیاں ہیں

OO

سیکھے ہیں مہ رُخوں کے لیے ہم مصوّری

(خاکے)

مولانا عبدالسلام نیازی

مولانا اپنی وضع قطع سے ریٹائرڈ پہلوان معلوم ہوتے تھے۔ میں نے انہیں اب سے چالیس سال پہلے قاضی کے حوض پر ایک گندھی کی دکان پر بیٹھے دیکھا تھا۔ یہ گندھی صاحب بھی کچھ اس گت کے آدمی تھے کہ جو بھی ادھر سے گزرتا اس کی نظر خواہ مخواہ ان پر پڑتی تھی۔ لحیم شحیم، گوشت کا ایک کالا پہاڑ دکان کے تھڑے پر دھرا دکھائی دیتا تھا۔ رنگ سیاہ، سر خوب گھٹا ہوا، کالی گول داڑھی، سفید سفید آنکھیں ایسی دکھائی دیتی تھیں جیسے تمباکو کے پنڈے میں کوڑیاں جڑی ہوئی ہوں۔ کرتا پاجامہ اُجلا براق پہنتے تھے۔ یوں ان کا کالا رنگ اور بھی چمک اٹھتا تھا۔ سامنے تیل کے کنٹر چنے رہتے تھے۔ مولانا کا رنگ میدہ وشہاب تھا۔ سر گھٹا ہوا، اس پر چنی ہوئی دوپلی، گول چہرہ، کشادہ پیشانی، جگر جگر کرتی آنکھیں، کتارا سی ناک، موزوں دہن، پتلے پتلے ہونٹ، ان پر پان کی سرخی جو پھیل کر باچھوں میں آگئی تھی، داڑھی مونچھ صاف، جیسے بھدرا کرا دیا ہو، گلے میں باریک ململ کا کرتا، آڑا پاجامہ، نیم ساق تک چوڑیاں پڑی ہوئیں۔ پاؤں میں سلیم شاہی، کندھے پر شالی رومالی، وضع قلندرانہ، مزاج شاہانہ۔ اس وقت جوانی سے گزر کر ادھیڑ عمر میں قدم رکھ چکے تھے۔ حوض قاضی کی دکان پر گندھی صاحب کے پہلو بہ پہلو بیٹھے دکھائی دیتے تھے۔ ایک صاحب نے رات کا اندھیرا منہ پر مل رکھا تھا، دوسرے صاحب نے دن کا اُجالا، عجب اجتماع ضدین تھا۔ یوں اور بھی نظریں ان کی طرف کھنچتی تھیں۔ دنوں نہیں، برسوں یہ دن رات کا تماشا ہم دیکھا کیے۔

مولانا کے علم و فضل کی تعریفیں غائبانہ بہت سنیں، تو انہیں دیکھنے کا اشتیاق ہوا اور ایک دن ستر ہویں میں انہیں خواجہ حسن نظامی کے پکھولے سے لگے دیکھا تو میں نے اپنے ساتھی سے پوچھا کہ ''یہ کون صاحب ہیں؟'' انہوں نے حیرت سے میری طرف دیکھا، بولے۔ ''آپ انہیں نہیں جانتے؟'' میں نے کہا۔ ''دیکھا تو اکثر ہے مگر..... '' وہ بولے۔ ''ارے صاحب! یہ مولانا عبدالسلام صاحب نیازی ہیں۔'' میں نے چونک کر ان کی طرف دیکھا اور میں نے جو بے شمار روایتیں ان کے بارے میں سنی تھیں، سب میرے تخیل میں ہجوم کر آئیں۔

اس واقعے کے بعد کوئی پچیس سال تک میں مولانا کو دیکھتا رہا اور کبھی کبھی ان کی مختصر گفتگو سننے کا مجھے اتفاق ہوا، مگر مجھے ان سے ڈر لگتا تھا۔ اس لیے میں نے کبھی ان سے قریب ہونے کی کوشش نہیں کی۔ میرے لیے وہ ہمیشہ دور کا جلوہ ہی رہے۔ میں پاکستان چلا آیا تو وہ آنکھوں سے بھی دور ہو گئے اور اب تو وہ بہت دور ہو گئے۔ اتنی دور کہ اب آنکھیں انہیں کبھی نہ دیکھ سکیں گی۔

مولانا نے ساری دُنیا کا علم چاٹ رکھا تھا۔ عربی، فارسی اور اُردو کے منتہی تھے۔ مذہبی علم، معقول و منقول، دونوں ان کے پاس اتنا تھا کہ سوائے مولوی ایوب کے کوئی اور ان کے آگے ٹھہر نہیں سکتا تھا۔ ہر علم سے خدا کا وجود ثابت کر دیتے تھے۔ یہاں تک کہ علم موسیقی سے بھی۔ حافظہ غضب کا پایا تھا۔ ہر کتاب انہیں از بر تھی۔ یہاں تک کہ بعض کتابوں کے صفحے تک بتا دیتے تھے کہ فلاں صفحے پر دیکھو، یہ عبارت ملے گی۔ مزاج میں درشتی بہت تھی، اس لیے اپنی شاگردی میں مشکل ہی سے کسی کو قبول کرتے تھے مگر جس کو انہوں نے پڑھا دیا وہ پارس بن گیا۔ شاگرد سے ناراض ہوتے تھے تو اسے سخت سے سخت سزا دیتے تھے۔ مثلاً اسے ستون سے باندھ دیتے اور زیادہ غصہ آتا تو اسے بید سے ادھیڑ کر رکھ دیتے۔ علم کا ایک سمندر تھا کہ ان کے دماغ میں موجیں مارتا رہتا تھا۔ چاہتے تھے کہ شاگرد بھی انہی جیسا ہو جائے۔ جب یہ توقع پوری نہ ہوتی تو جھنجھلاتے اور شاگرد کی شامت آ جاتی۔

مولانا کی گفتگو بڑی نستعلیق ہوتی تھی۔ کبھی علمی لہر آجاتی تو ادق استعاروں میں بولنے لگتے۔ مثلاً ایک دفعہ رنڈی کے متعلق فرمایا کہ "اس مثلث لحمی کو تو عمود زریں چاہیے۔" اور کبھی ٹکسالی لہر آجاتی تو سہل ممتنع پیرایہ بیان اختیار کرتے۔ مثلاً جوش ملیح آبادی کی کافرانہ باتیں سن کر فرمایا کہ "تمہارا دماغ تو شیطان کی کھڈی ہے۔" کبھی دُرگا کا گانا سنتے تو اس کے گانے کی تعریف بھی کرتے اور اس کی انگلیوں کی بھی۔ فرماتے تھے کہ تمہاری انگلیاں کیا ہیں، ہری مرچیں ہیں۔ نظام دکن میر عثمان علی خاں ایک زمانے میں دُنیا کے سب سے زیادہ دولت مند آدمی تھے۔ مولانا کے ایک بہی خواہ نے مولانا سے کہا کہ "آپ اگر نظام کو ایک درخواست لکھ دیں تو آپ کا وظیفہ مقرر ہو جائے گا۔" مولانا کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ غصے سے بولے۔ "نظام کی ساری دولت ایک پلڑے میں اور میرا ایک بوسیدہ سے بوسیدہ بال دوسرے پلڑے میں رکھ دو تو میرا بال ہی بھاری اترے گا۔"

مولانا کا بظاہر کوئی ذریعۂ آمدنی نہیں تھا۔ معلّمی کا وہ کچھ نہیں لیتے تھے۔ لوگوں کو صرف یہ معلوم تھا کہ مولانا تیل بنا کر بیچتے ہیں۔ ننوا تیلی سے ان کا دوستانہ ہے۔ اس کے لڑکے کو بھی مولانا نے پڑھایا تھا۔ قاضی کے حوض میں جس گندھی کی دکان تھی، اس سے بھی ان کا دوستانہ تھا۔ بس یہی دو تیلی تھے جن سے مولانا خرید و فروخت کرتے تھے۔ مگر یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ کیسا تیل خریدتے تھے، کتنا خریدتے تھے، اسے بناتے کس طرح تھے، کس وقت بناتے تھے اور کب بیچتے تھے۔ مولانا کے خرچ بڑے اُجلے تھے اور ان کا ہاتھ بھی کھلا ہوا تھا۔ تیل سے ایسی کیا یافت ہو جاتی ہوگی؟ ہم تو کہتے تھے۔ "میاں تیل دیکھو تیل کی دھار دیکھو۔" ایک صاحب کہتے تھے کہ مولانا کو تیل کا نسخہ ایک موکل نے بتایا تھا۔ اس لیے ان کا تیل خوب بکتا تھا، کیوں کہ کسی اور کو تو یہ تیل بنانا آتا نہیں تھا۔ دلّی والوں میں یہ بھی مشہور تھا کہ مولانا کو دست غیب ہے۔ ان کی جیبوں میں ہر وقت نوٹ بھرے رہتے تھے۔

مولانا کو گانا سننے کا شوق تھا۔ نعتیں اور غزلیں سنتے تھے۔ سوئی والوں میں گانے بجانے والوں کا ایک خاندان شاہی زمانے سے رہتا تھا۔ اسی خاندان کا ایک لڑکا، جس کی

مسیں بھیگ رہی تھیں، کسی عرس میں مولانا کی نظر پڑ گیا۔ مولانا حسن پرست بھی تھے۔ حسنِ مجازی میں انہیں حسنِ حقیقت کا جلوہ نظر آتا تھا۔ کیوں نہ ہو، صوفی صافی تھے۔ ہر اچھی شکل میں جلوہ دیکھ لیتے تھے۔ عثمان کا شمار حسینوں میں نہیں تھا۔ ہاں سانولا سلونا لڑکا تھا۔ مولانا نے اسے اپنے کمرے مین بلانا شروع کر دیا۔ اس سے دو چار چیزیں سنتے اور پانچ روپے دے کر رخصت کر دیتے۔ عثمان کے ساتھ اس کا جوڑی دار رمضان بھی جایا کرتا تھا۔ اس کا رنگ کھلا ہوا تھا۔ عمر میں عثمان سے ایک آدھ سال بڑا تھا۔ اسے پکے گانے کا شوق تھا مگر غزل گانے میں عثمان کو سہارا دیتا رہتا تھا۔ مولانا نے اس جوڑی کو اپنے ڈھب سے خوب سدھا لیا تھا۔ انہیں فارسی اور اُردو کا متصوفانہ اور عاشقانہ کلام یاد کرا دیا تھا۔ مولانا ان دونوں کو اپنے کمرے میں بھی سنتے اور اپنے ساتھ دلّی اور دوسرے شہروں کے عرسوں میں بھی لے جاتے۔ جب یہ دونوں گاتے تو مولانا کے ساتھ محفل بھی جھوم جاتی۔ ادھر مولانا نے دو چار روپے دیئے اُدھر روپے کا مینہ برس جاتا۔ دونوں لڑکے جھولیاں بھر بھر کر گھر لاتے۔ حاسدوں نے مولانا کے متعلق طرح طرح کی ہوائیاں اڑانی شروع کر دیں۔ شدہ شدہ یہ باتیں عثمان کے گھر والوں تک بھی پہنچیں۔ خاندان کے بڑے بوڑھے جمع ہوئے اور آپس میں مشورے ہوئے کہ اس بدنامی سے بچنے کے لیے کیا کیا جائے؟ کسی نے کہا۔ ''عثمان کو مولانا کے ہاں جانے سے روک دیا جائے۔'' مگر اس صورت میں جو موٹی آمدنی ہو رہی تھی، وہ بھی ماری جاتی۔ زبانِ خلق نے خاندان والوں کو مولانا کی طرف سے بدگمان کر دیا تھا۔ انہوں نے کہا۔ ''پھٹ پڑے وہ سونا جس سے ٹوٹیں کان۔ آبرو ہے تو سب کچھ ہے۔'' لہٰذا عثمان کو روک لیا گیا۔ مولانا کے ہاں سے طلبی ہوتی تو اڑان گھائیاں بتا دی جاتیں۔ جب مولانا کی طرف سے اصرار بڑھا تو خاندان کے دو چار بزرگ مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سارا ماجرا بیان کیا۔ مولانا کی تیوری پر بل پڑ گئے۔ مگر ضبط کر کے بولے۔ ''دُنیا کچھ ہی کہا کرے، برِ چشم قلندر۔ مجھے اس کی پرواہ نہیں۔ ہاں میں تم سے کہتا ہوں کہ عثمان کا بدن میرے لیے ایسا ہے جیسے میری ماں کا بدن۔'' عثمان کے بڑے بوڑھوں کا اطمینان

ہو گیا اور عثمان کا آنا جانا پھر کھل گیا۔

مولانا قوالی بھی سنتے تھے اور ان پر کیف بھی طاری ہوتا تھا۔ مگر حال کھیلنے یا دوسرے صوفیوں کی طرح رقص کرنے کی نوبت نہ آتی تھی۔ جو شعر پسند آجاتا تھا اس کی تکرار کراتے تھے۔ خوب جھومتے تھے اور قوالوں کو روپیہ بھی خوب دیتے تھے۔ خسرو کی نعت ''نمی دانم چہ منزل بود شب جائے کہ من بودم'' بہت پسند تھی۔ مقطع کی تکرار ضرور کراتے تھے۔

عرسوں میں رنڈیوں کا گانا بھی سنتے تھے اور لطف اندوز ہو کر روپیہ بھی دیتے تھے۔ کبھی کبھی شدتِ کیف میں طوائف میں انہیں جلوہ دکھائی دے جاتا تو طوائف کو پاس بلا کے اس کا بوسہ لے لیتے۔ یہ گویا مولانا کی طرف سے انتہائی قدردانی ہوتی تھی۔ طوائفیں بھی اس عمل کو اپنے لیے باعثِ فخر سمجھتیں۔

مولانا بڑے خوش مزاج اور فقرے باز تھے۔ ایک دفعہ ایک عرس میں بہت سارے مشائخ اور صوفی جمع تھے کہ ایک حسین طوائف اپنا گانا سنانے آبیٹھی۔ ایک صوفی صاحب نے اسے دیکھ کر ''جل جلالہ'' کا نعرہ لگایا۔ اتنے ہی میں اس کی نائکہ بھی آدھمکی۔ مولانا نے صوفی صاحب کی طرف دیکھ کر فرمایا۔ ''لیجئے ''عما نوالہ'' بھی تشریف لے آئی ہیں۔'' ایک قہقہہ پڑا اور موصوف پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔

ریواڑی میں مولانا ایک گانے کی محفل میں شریک ہوئے۔ ایک پڑھی لکھی طوائف گا رہی تھی۔ مولانا نے اس سے فرمائش کی کہ تمہیں زیادہ سے زیادہ اشعار کی جو غزل یاد ہو، سناؤ۔

اس نے کہا۔ ''حضور، غزل تو نہیں، ہاں ایک خمسہ یاد ہے۔''

فرمایا۔ ''سناؤ۔''

اس نے چالیس بند کا ایک خمسہ سنایا۔ جب اس نے گانا ختم کیا تو مولانا نے تعریف کی اور فرمایا۔ ''جو چیز مجھے پسند آجاتی ہے میرے حافظے میں محفوظ ہو جاتی ہے۔'' یہ کہہ کر پورا خمسہ اسی ترتیب سے سنا دیا۔

اب چالیس سال پہلے دتّی میں ایک لال بیگی تھا۔ نام اس کا صنم تھا۔ اس کی دو

لڑکیاں تھیں جنہیں اس نے گانے بجانے پر لگا دیا تھا۔ مگر یہ دونوں بہنیں کہلاتی ''بھنگنیں'' ہی تھیں۔ صورت شکل کی بھی بُری نہیں تھیں۔ سفید دوپٹہ، سفید کرتا اور سفید ڈھیلا پاجامہ۔ شریف بہو بیٹیوں کی سی وضع قطع۔ ایک بہن ڈھولک بجاتی تھی، دوسری ہارمونیم اور دونوں مل کر گاتی تھیں۔ شین قاف درست۔ کلام اچھا یاد تھا۔ بھمیری آوازیں۔ سماں باندھ دیتی تھیں۔ خود شائستہ تھیں اس لیے محفل بھی شائستہ ہوتی تھی۔ مولانا ان کا گانا بڑے شوق سے سنتے تھے۔ ایک دن رات کے دو بجے خدا جانے مولانا کو کیوں یاد آ گئیں۔ اسی وقت حکیم علی رضا خاں کے گھر پہنچے۔ انہیں جگایا۔ وہ آنکھیں ملتے ہوئے آئے۔ ''خیر تو ہے مولانا؟'' بولے۔ ''انہیں بلواؤ۔ ان کا گانا سنیں گے۔'' بھلا مولانا کا کہنا ٹل سکتا تھا۔ اسی وقت آدمی گیا اور انہیں بلوالیا۔ حکیم صاحب کی بیٹھک میں گھنٹہ دو گھنٹے گانا سنا اور انہیں کچھ دے دلا کر رخصت کیا۔

اسی زمانے میں جاورہ کا بخشا قوال دلّی میں آیا اور خواجہ حسن نظامی کے ایک مرید شیخ یعقوب ٹھیکیدار کے ہاں رہنے لگا تھا۔ بخشا چھریرے بدن کا نازک سا جوان تھا۔ اچکن اور آڑے پاجامے میں بہت اچھا لگتا تھا۔ بڑی انوٹ سے بول بناتا تھا، اور لے کی تراش خراش اچھی کرتا تھا۔ اس کا گتیا جھمن خاں بھی عین اسی کا مثنیٰ تھا۔ ڈھولک بجانے میں اسے کمال حاصل تھا۔ بخشا جب پہلی مرتبہ سترہویں میں خواجہ صاحب کی محفل خاص میں گایا تو ساری دلّی میں اس کی شہرت ہوگئی۔ مولانا بخشا پر فدا ہو گئے تھے اور ادبدا کر اس کی قوالی سنتے تھے۔ بخشا بھی بڑی عقیدت سے انہیں اپنا گانا سناتا تھا۔ جب اور جہاں یاد فرماتے فوراً حاضر ہو جاتا۔ افسوس کہ بخشا جوان ہی مر گیا۔ جھمن خاں اب بھی زندہ ہیں مگر بخشا کے بعد سے زندہ در گور۔

ایک محفلِ خاص میں مولانا نے عثمان خاں کو گانے بٹھا دیا اور ایک فارسی غزل کی فرمائش کردی۔ مولانا اس سے لطف اندوز ہو رہے تھے کہ ایک صوفی نے کسی شعر کو غلط بتا دیا۔ مولانا کو تاؤ آ گیا، بولے۔ ''نہیں صحیح گا رہا ہے۔'' خواجہ حسن نظامی بھی موجود تھے۔ انہوں نے صوفی کی طرف داری کی۔ مولانا بھڑک اٹھے۔ بولے ''شیخ، اگر کچھ

سمجھتے ہو تو اس کی تشریح کرو۔'' سب خاموش رہے تو مولانا کا جوالامکھی پھٹا اور دو گھنٹے تک عالمِ لاہوت اور ناسوت کا لاوا بہتا رہا۔

مولانا کی طاقت لسانی اور خوش بیانی کا اندازہ اس سے لگایئے کہ ایک دفع روح کی ماہیت پر جو صبح سے بولنا شروع کیا تو سارا دن گزر گیا، رات بھی گزر گئی، صبح چار بجے تک لیکچر جاری رہا اور نا تمام رہا۔

مولانا کی آمدنی کے بارے میں عرض کیا جا چکا ہے کہ کوئی ذریعہ اس کا کسی کو معلوم نہ ہو سکا۔ ان کے پاس حاجت مند بھی آتے تھے اور کبھی خالی ہاتھ نہیں جاتے تھے۔ حاجت مند کے سوال کرنے سے پہلے ہی وہ اسے کچھ نہ کچھ دے دیتے تھے۔ ایک دفعہ چار آدمی اجمیر شریف کے عرس سے لوٹ رہے تھے کہ ان کا سارا روپیہ ختم ہو گیا۔ مولانا سے ملنے گئے تو مولانا نے اپنے ایک شاگرد کو آواز دی کہ ''دیکھو چھینکے پر کچھ نوٹ رکھے ہیں، وہ اُتار لاؤ۔'' دو سو کے نوٹ تھے جو انہوں نے ان حضرات کو پیش کر دیئے۔

حیدر آباد دکن سے ایک نواب صاحب دلّی آئے اور مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ مولانا نے پوچھا۔ ''کیسے آنا ہوا؟'' نواب صاحب نے کہا۔ ''سرکار نے آپ کو یاد فرمایا ہے۔'' مولانا کو جلال آ گیا۔ فرمایا۔ ''کیوں بلایا ہے اس نے ہمیں؟ اگر وہ اپنے علم سے ہمیں مرعوب کرنا چاہتا ہے تو ہم کسی کے رعب میں آنے والے نہیں اور اگر وہ ہمیں اپنی دولت دینا چاہتا ہے تو ہمیں اس کی ضرورت نہیں۔ ارے عثمان! دیکھو وہ سامنے مچان پر جو بوری رکھی ہے، اُٹھا لاؤ۔'' عثمان جا کر بوری اٹھا لیا۔ مولانا نے فرمایا۔ ''اس میں جو کچھ ہے باہر نکال۔'' عثمان نے بوری میں ہاتھ ڈال کر نکالا تو نوٹوں کی گڈی نکلی۔ عثمان نے وہ گڈی فرش پر رکھ دی۔ مولانا نے ڈپٹ کر کہا۔ ''اور نکال۔'' عثمان نے پھر ہاتھ ڈالا اور ایک گڈی نکال کر رکھ دی۔ غرض یوں ہی سو سو اور ہزار ہزار کے نوٹوں کی گڈیاں نکالتا رہا اور گڈیوں کا ڈھیر لگ گیا۔ مولانا نے نواب صاحب سے کہا۔ ''اور دیکھیے گا؟'' نواب صاحب تھرا گئے۔ ہکلا کر بولے۔ ''حضور کے پاس کیا کمی ہے۔'' مولانا نے فرمایا۔ ''جا، اپنے نظام سے کہہ دے، ہم کسی کے پاس نہیں جایا کرتے۔''

نواب صاحب ہاتھ جوڑتے اور سلام جھکاتے وہاں سے رُخصت ہوئے۔ مولانا نے عثمان سے کہا۔ ''انہیں بوری میں بھر کر وہیں رکھ آ۔'' عثمان نے نوٹوں کی گڈیاں سمیٹیں اور بوری پھر مچان پر رکھ دی۔ رمضان کے دل میں بدی آئی۔ عثمان سے کہا۔ ''ابے دو ایک گڈیاں تو پار کر دے۔'' عثمان نے ہنس کر کہا۔ ''بوری میں کیا رکھا ہے؟ بوری تو خالی ہے۔'' اُستاد رمضان خاں زندہ سلامت ہیں اور کراچی میں موجود ہیں۔ انہوں نے قسمیں کھا کھا کر اپنا یہ چشم دید واقعہ سنایا۔

مولانا کو ایک زمانے میں شعر و شاعری کا بھی شوق ہوا تھا۔ داغؔ کے شاگرد ہو گئے تھے۔ اُستاد سے اس قدر عقیدت تھی کہ جب کسی سے اُستاد کا شعر سنتے تو ''سبحان اللہ'' کہہ کر فوراً سجدہ کر لیتے۔

سجدہ کرنے پر یاد آیا کہ مولانا کا عالم شباب تھا کہ دلّی کے ایک معروف حکیم کی داشتہ دَھنّو پر مولانا عاشق ہو گئے۔ چرخے والوں میں پہلا کمرہ جگمگی طوائف کا تھا اور دوسرا دَھنّو کا۔ مولانا کا عشق دُنیا زمانے سے نرالا تھا۔ روزانہ رات کو ایک مقررہ وقت پر دھنو کے بالا خانے پر جاتے۔ دروازہ تھپتھپاتے۔ دَھنّو دروازہ کھولتی تو اس کے ہاتھ میں سلگی ہوئی اگربتیوں کا مٹھا ہوتا۔ وہ دھونی دیتی، مولانا آستانِ محبوب پر سجدے کرتے اور چلے جاتے۔ ان کا یہ معمول عرصہ دراز تک رہا۔

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

مولانا داڑھی مونچھ کا صفایا کرتے تھے۔ دلّی کے ایک بہت نام ور عالمِ دین گزرے ہیں مولوی کرامت اللہ۔ بڑے پابندِ شرع اور نیک بزرگ تھے۔ ان کے بے شمار مرید بھی تھے۔ ایک دفعہ اپنے وعظ میں انہوں نے داڑھی کی فضیلت بیان کی اور داڑھی نہ رکھنے کی فضیحت۔ مولانا کو اس کی خبر پہنچی تو بُرا مان گئے۔ ایک دن ساری رات قوالی سننے کے بعد صبح ہوتے گھر آ رہے تھے کہ راستے میں کرامت اللہ صاحب کا گھر پڑ گیا۔ مولانا مع اپنے حواریوں کے وہیں رک گئے۔ کنڈی بجائی، مولوی صاحب خود برآمد ہوئے۔ مولانا کو ناوقت دیکھ کر حیران ہوئے مگر فوراً تعظیماً مصافحہ کیا اور فرمایا۔ ''بسم

اللہ، اندر تشریف لائیے۔'' اپنے کمرے میں لے جا کر عزت سے بٹھایا پوچھا۔'' کیسے قدم رنجہ فرمایا؟'' مولانا نے کہا۔''شیخ! ہم نے سوچا آج تم سے داڑھی پر گفتگو ہو ہی جائے۔''اور اس کے بعد مولانا کے علم کے سمندر میں جوار بھاٹا آ گیا۔ خدا جانے مولوی صاحب نے مولانا کو کیسے رام کیا کہ آخر میں ہنسی خوشی رخصت ہوئے۔

عجیب ہے کہ مولانا نے کسی کے پیچھے نماز نہیں پڑھی اور نہ کسی کو اپنے پیچھے پڑھنے دی۔ ایک دفعہ صابر صاحب کے ہاں حاضرین نے انہیں زبردستی گونتھ گانتھ کے نماز پڑھانے کھڑا کر ہی دیا۔ خبر نہیں مولانا کے جی میں کیا آئی کہ رضا مند ہو گئے۔ پہلی رکعت میں جب سب سجدے میں گئے تو سب کو چھوڑ کر چلتے بنے۔

مولانا نقد دم تھے۔ ان کا کوئی عزیز اقارب کبھی نہ دیکھا نہ سنا۔ بس جو کچھ تھا ننوا تیلی تھا یا اس کے بچے۔ ترکمان دروازے تیلیوں کے پھاٹک کے سامنے مولانا کا بالا خانہ تھا، جس میں وہ اکیلے رہتے تھے۔ ننوا تیلی کے بڑے بیٹے کے اُستاد تھے اور ننوا تیلی کی لڑکی کو بیٹی بنا لیا تھا۔ یہی منہ بولی بیٹی کھانا پکا کر انہیں کمرے تک بھیجتی تھی۔ اس کی شادی مولانا نے خاصی دھوم دھام سے کی تھی۔ شادی کے تمام اخراجات خود اٹھائے تھے۔ اپنے تیل کا نسخہ بھی اس کے جہیز میں دے دیا تھا۔ اس تیل سے ان کے داماد نے خوب کمائی کی۔

مشہور یہ تھا کہ مولانا نے ساری عمر شادی نہیں کی۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ مولانا نے جوانی میں شادی کی تھی۔ اس سے اولاد نہیں ہوئی۔ مولانا قوالیوں کے چکر میں رہتے تھے۔ راتیں انہیں میں کالی ہوتی تھیں مگر صبح ہونے سے پہلے گھر ضرور جایا کرتے تھے۔ بیوی اکیلی پڑتی تارے یا کڑیاں گِننا کرتی تھی۔ آخر تنگ آ کر اس نے روکنا ٹوکنا شروع کیا۔ مولانا ایک آزاد مزاج آدمی تھے۔ وہ بھلا پابندیوں کو کیسے گوارا کر لیتے؟ ایک دن بیوی کو طلاق دے دی اور عدت پوری ہونے کے بعد ننوا تیلی کے بیٹے عبدالحی سے اس کا نکاح پڑھوا دیا۔

خواجہ حسن نظامی سے مولانا بڑی بے تکلفی سے ملتے تھے۔ خواجہ صاحب بھی ان کی بڑی قدر کرتے تھے۔ ایک دن خواجہ صاحب نے مولانا سے فرمائش کی کہ آپ تصوف پر ایک کتاب لکھ دیجئے۔ مولانا کچھ موج میں تھے، رضا مند ہو گئے۔ ورنہ مولانا زبان

کے جتنے طرّار تھے، قلم کے اتنے ہی پھسڈی تھے۔ مہینے دو مہینے میں کتاب لکھ لی اور مسودہ لے کر خواجہ صاحب کے ہاں پہنچے۔ خواجہ صاحب نے کتاب کو اِدھر اُدھر سے دیکھا تو بہت خوش ہوئے۔ بہت تعریف کی اور بولے۔

''معاوضہ جو آپ فرمائیں پیش کر دیا جائے۔''

مولانا نے کہا۔ ''بہت اچھا۔''

''مگر کتاب میرے نام سے چھپے گی۔''

یہ سننا تھا کہ مولانا کا ناریل چٹخا۔ خواجہ صاحب کے ہاتھ سے کتاب لے کر اس کے چار ٹکڑے کر ڈالے اور بولے۔ ''خدا خوش رکھے۔ شیخ لاؤ چائے پلاؤ۔''

خواجہ صاحب نے متاسف لہجہ سے کہا۔ ''یہ آپ نے کیا کیا؟''

مولانا نے کہا۔ ''کچھ نہیں شیخ تم چائے پلواؤ۔'' مولانا کی آنکھ پر میل نہیں تھا۔ چائے پی اور ہنسی خوشی رُخصت ہو گئے۔ خواجہ صاحب سے پھر کبھی اس کا ذکر تک نہیں کیا۔

ایک بار مولانا سے ایک صاحب ملنے گئے جو اپنے آپ کو ادیب اور نہ جانے کیا کیا کچھ سمجھتے تھے۔ مولانا نے پوچھا۔ ''فارسی جانتے ہو؟'' انہوں نے جواب دیا۔ ''نہیں۔'' ''عربی جانتے ہو؟'' انہوں نے پھر وہی جواب دیا۔ ''نہیں'' علم معقول و منقول؟ ظاہر ہے کہ اس کا جواب بھی نہیں ہی تھا۔ اس پر مولانا نے کہا۔ ''بھئی یہ کیوں نہیں کہتے کہ امی ہوں۔'' واقعی مولانا علم و فضل کے اس مقام پر تھے کہ وہ جسے بھی چاہتے، یہ فقرہ کہہ سکتے تھے۔

مولانا بڑے نڈر آدمی تھے۔ ۱۹۴۷ء میں جب دلی میں فسادات ہوئے تو ہندو اکثریت کے محلوں میں سے مسلمان نکل کر مسلمانوں کے محلے میں آنے لگے تھے۔ مگر مولانا تن تنہا اپنے کمرے ہی پر ڈٹے رہے۔ لوگوں نے انہیں بہت سمجھایا مگر وہ نہ مانے۔ ان کی منہ بولی بیٹی اور داماد بھی پاکستان چلے گئے مگر مولانا ٹس سے مس نہ ہوئے۔ پاکستان جانے والوں سے مولانا بہت ناراض ہوتے تھے۔ چناں چہ بیٹی اور داماد سے بھی ناراض ہو گئے۔

حالات بد سے بدتر ہوتے گئے اور شرنارتھیوں کی کھیپ پر کھیپ دلّی آنے لگی۔ یہ آنے والے دلّی میں خالی گھر ڈھونڈتے پھرتے تھے اور ڈرا دھمکا کر بھی مسلمانوں سے گھر خالی کرا لیتے تھے۔ مقفل گھروں کے تالے توڑ کر گھس جاتے تھے۔ انہیں میں سے کسی کو معلوم ہوا کہ اس بالا خانے پر ایک بڈھا مسلمان اکیلا رہتا ہے۔ اس نے موقع کو غنیمت جانا اور تلوار لے کر زینے پر چڑھ گیا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اندر سناٹا تھا۔ بے روک ٹوک صحن میں پہنچ گیا۔ مولانا نے جو اسے دیکھا تو ڈانٹ کر کہا۔ "کون ہے تو؟" وہ کچھ ایسا سٹپٹایا کہ تلوار وہیں پھینک کر بھاگ گیا۔ مولانا نے تلوار اٹھا کر اس کے پیچھے زینے میں پھینک دی۔

ایک دفعہ اور مولانا پر حملہ ہوا۔ اب کے چار سکھ اپنی کرپانیں لیے اوپر چڑھ آئے مگر مولانا کو دیکھ کر ان پر ہیبت چھا گئی۔ جہاں کھڑے تھے وہیں کھڑے کے کھڑے رہ گئے۔ مولانا کی عمر اسّی سے تجاوز ہو چکی تھی۔ کم بجھائی دینے لگا تھا۔ مگر وہ سمجھ گئے کہ یہ چاروں قتل کرنے آئے ہیں۔ بڑے اطمینان سے بولے۔ "آپ جس قصد سے آئے ہیں اسے جلد پورا کیجئے۔" قاتلوں نے خبر نہیں کیا دیکھا کہ ان کی گھگھی بندھ گئی۔ ایک نے بڑی ہمت کر کے کہا۔ "جی ہم تو آپ کے درشن کرنے آئے تھے۔" مولانا نے پھر کہا۔ "نہیں نہیں، آپ جس کام کے لیے آئے ہیں اسے جلد انجام دیجئے۔ اس میں دیر نہ کیجئے۔" انہوں نے کہا۔ "جی ہم سے بڑی غلطی ہوئی ہے۔ آپ ہمیں معاف کر دیجئے۔" مولانا نے فرمایا "اچھا تو چلے جاؤ۔" اور وہ چاروں وہاں سے گدا گد گدا گد زینے پر سے ایسے گھبرا کر بھاگے جیسے خود ان کی جان خطرے میں ہو۔ سچ ہے۔ "جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے؟"

مولانا آخر دم تک اپنے بالا خانے ہی پر رہے اور چند مہینے ہوئے کہ اپنی طبعی موت مرے۔

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ
افسوس تم کو میرؔ سے صحبت نہیں رہی

○○

خواجہ حسن نظامی

حضرت خواجہ حسن نظامی دلّی کے ان بزرگوں میں سے تھے جنہیں زمانہ کبھی فراموش نہ کر سکے گا۔ وہ ایک بہت غریب گھر میں پیدا ہوئے۔ افلاس کی وجہ سے ان کی تعلیم مکمل نہ ہوسکی۔ مگر انسان کو انسان بنانے میں صرف تعلیم ہی تو کارآمد نہیں ہوتی۔ یوں لادنے کو گدھے پر بھی کتابیں لاد دی جاتی ہیں۔ لیکن گدھا تو گدھا ہی رہتا ہے۔ اصل چیز ہے تربیت۔ خواجہ صاحب حضرت نظام الدین اولیاؒ کے خواہر زادوں کی اولاد میں سے اپنے آپ کو بتاتے تھے۔ ان کی شرافتِ نسبی نے انہیں سنبھالے رکھا۔ ان کے والد بھی درگاہِ محبوب الٰہیؒ کے خادموں میں شامل تھے۔ درگاہ کی آمدنی میں سے حصہ رسد انہیں بھی کچھ مل جاتا۔ یہ یافت اس قدر قلیل تھی کہ اس میں جسم و جاں کا رشتہ بہ مشکل قائم رکھا جا سکتا تھا، تاہم غیور والدین نے اپنے لڑکے کو کچھ ایسی تربیت دی کہ مفلس و قلاش ماں باپ کا بیٹا بعد میں دلّی کے لکھ پتیوں میں شمار ہوا۔ ادب میں اپنے زمانے کا سب سے بڑا ادیب کہلایا۔ علوم دینی میں وہ بصیرت حاصل کی کہ فرنگی حکومت نے شمس العلماء کا خطاب دیا۔ معاملاتِ روحانی میں اتنی ترقی کہ تین لاکھ مریدوں کا مرشد کامل بنا۔ مبلغِ اسلام بنا تو اچھوتوں سے لے کر راجہ مہاراجاؤں تک کو حلقہ بگوشانِ اسلام میں شامل کیا۔ سیاست میں قدم رکھا تو دیکھتے ہی دیکھتے صف اول کے لیڈروں میں جا پہنچا۔ غرض زندگی کے ہر شعبے میں حیرت ناک ترقی کی۔ یہ سعادت خدائے بخشندہ کی طرف سے تھی کہ خواجہ صاحب نے مٹی میں بھی ہاتھ ڈالا تو سونا بن گئی۔

میں نے جب سے ہوش سنبھالا، خواجہ صاحب کو ایک ہی سا دیکھا۔ انہیں دیکھ کر یہ خیال ہوتا تھا کہ وقت کی رفتار تھم گئی ہے، زمانے کی گردش رک گئی ہے۔ آخر آخر میں ان کی داڑھی میں چند سفید بال البتہ آگئے تھے ورنہ خود ان میں سرِمو فرق نہ آیا تھا۔ لمبا اونچا قد، چھریرا بلکہ دبلا بدن، سر پر کُلاہ نما پیلی ٹوپی۔ لمبا سا چغہ۔ بڑے پائچوں کا پاجامہ۔ پاؤں میں دیسی جوتی، رنگ شہابی، چہرہ کتابی، آنکھوں پر سنہرے فریم کی عینک۔ جس میں سے آنکھیں ہیرے کی طرح جگر جگر چمکتی تھیں۔ سواسی ناک، موزوں دہانہ، لب ذرا موٹے، کترواں لبیں۔ مٹھی بھر پھریری داڑھی۔ صراحی دار گردن۔ شانوں پر کاکلیں کالے ناگوں کی طرح لہراتیں اور افعی کی طرح بل کھاتیں۔ چلتے تو کڑی کمان کی طرح، بیٹھتے تو لاکھوں من کے بیٹھے معلوم ہوتے۔ خاموشی میں پہاڑ کا سا سکوت ہوتا اور گفتگو میں دریا کی سی روانی۔ خوش گفتار ایسے کہ بات کرتے میں منہ سے پھول جھڑتے، سننے والے دھیان کا دامن پھیلا کر انمول پھولوں سے اپنے من کی جھولیاں بھر لیتے۔ سنجیدگی اور بردباری کے چنور ان کے چہرے پر عیاں ہوتے رہتے۔ کوئی خوش مذاقی کی بات بھی کرتے تو خندۂ دنداں نما سے آگے نہ بڑھتے۔ جس محفل میں بیٹھ جاتے، طوطی کی طرح چہکتے رہتے۔ کیا مجال کہ جو کسی اور کو ان کے آگے لب کشائی کا یارا ہو۔ بڑوں میں بڑوں کی سی باتیں کرتے اور بچوں میں بچوں کی سی۔ تمام علوم ظاہری و باطنی میں درک رکھتے تھے۔ ان کے ایک ہاتھ میں دین اور ایک ہاتھ میں دُنیا تھی۔ طرفہ طبیعت کے آدمی تھے۔ دلّی سے ان کا نام اس طرح پیوست ہے جس طرح گوشت سے ناخن۔ اس عجیب و غریب ہستی پر میرا کچھ لکھنا چھوٹا منہ بڑی بات۔ دوسرے یہ کہ خواجہ صاحب کے مقربین میں سے نہیں، دوستوں میں سے نہیں، وہ میرے والد کے ملنے والوں میں سے تھے۔ میرے بزرگ اور محترم تھے۔ اکثر انہیں دیکھا اور چند بار ان کی خدمت میں حاضر ہونے کا بھی موقع ملا۔ یوں ساری عمر ان کے رسالے، اخبار، کتابیں اور روزنامچہ پڑھتا رہا اور ان کی البیلی اُردو کے مزے لیتا رہا۔ گذشتہ تیس سال کے چند ناقابلِ فراموش تاثرات ہیں جو ناظرین کی دلچسپی کے لیے لکھتا ہوں شاید ان میں سے کوئی ایسا ہو جو مستقبل کے

مورخ کے کام آجائے۔ میں صرف ایک واقعاتی مرقعہ پیش کر رہا ہوں۔

خواجہ صاحب کی اخباری زندگی کا آغاز پھیری پر کتابیں اور اخبار بیچنے سے ہوا۔ جامع مسجد کی سیڑھیوں پر ان کی بے خواب راتیں گزرتیں۔ انہوں نے بھوک اور افلاس کا مزہ بچپن ہی میں چکھ لیا تھا۔ اگر ان میں غیرت نہ ہوتی تو وہ بھی کنگلوں کی طرح اپنی پوری زندگی جامع مسجد کی سیڑھیوں پر گزار دیتے۔ یہ ان کے خاندانی شرف کا جوہر ہی تھا جو انہیں ان کی پستی کا احساس دلاتا رہا اور اس گری ہوئی زندگی پر وہ قانع نہ ہو سکے۔ ان کے دل میں ہمیشہ سے ایک بڑا آدمی بننے کی امنگ تھی۔ دلّی کے چوک اور دلّی کی گلیوں ہی میں انہوں نے تعلیم پائی۔ یہی وہ مکتب تھے جن میں انہوں نے تعلیم کے ساتھ ساتھ تجربہ حاصل کیا۔ ناموافق حالات نے اُنہیں سخت کوش بنا دیا۔ وہ ہمت کے پر لگا کر اڑے اور شہرت کے آسمان پر کامیابی کا تارا بن کر چمکے۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے تو خواجہ صاحب نے اپنے سینکڑوں ہی اخبار جاری کیے روزانہ۔ ہفتہ وار۔ پندرہ روزہ اور ماہانہ۔ یہ سب پرچے شہابِ ثاقب کی طرح مطلع صحافت پر نمودار ہوتے۔ اپنی خیرہ کن چمک دمک دکھاتے اور دیکھتے ہی دیکھتے فضا میں گُھل جاتے۔ ان کا اخبار ''منادی'' صرف ایک ایسا پرچہ ہے جو بیسیوں چولے بدلنے پر بھی شائع ہوتا رہا اور اس کے شائع ہونے کی وجہ یہ بھی ہے کہ اس میں خواجہ صاحب کا دلچسپ روزنامچہ شائع ہوتا رہا۔ یہ روزنامچے کی جدّت خواجہ صاحب کے غیر معمولی دماغ کی پیداوار تھی۔ صبح سے رات تک کے واقعات اس میں درج ہوتے۔ اس میں شک نہیں کہ روزنامچے کا مقصد محض خواجہ صاحب کا ذاتی پروپیگنڈا تھا۔ لیکن اس کی مقبولیت کا سبب وہ زبان اور بیان تھا یا وہ اندازِ تحریر جو خواجہ صاحب کے ساتھ پیدا ہوا اور خواجہ صاحب ہی کے ساتھ ختم ہوگیا۔ یہ سیدھا سادا اندازِ بیان ہزار کوشش پر بھی کسی کو نصیب نہ ہو سکا۔ اس کی سادہ پرکاری کا گھائل ایک عالم ہے۔ سر عبد القادر کے ''مخزن'' سے لے کر آج کل کے عمدہ ادبی رسالوں تک شاید ہی کوئی ایسا ہو جو خواجہ صاحب کے مضامین شائع کرنے کو اپنے اعلیٰ کارناموں میں شمار نہ کرتا ہو۔

دلی کے خاص لوگوں میں سے ایک صاحب ہیں محمد ارتضٰی، جو کوچہ چیلان میں رہتے تھے اور دلی کے اچھے آسودہ گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ خاصے متمول آدمی تھے۔ جائداد بھی کافی تھی۔ عربی، فارسی اور اُردو سے شغف رکھتے تھے۔ طبیعت کا رجحان مذہب کی طرف زیادہ تھا۔ ہم نے ہمیشہ سے ان کے منہ پر چھوٹی سی داڑھی دیکھی۔ داڑھی کیا تھی، داڑھی کی معذرت تھی۔ ادب سے دلچسپی کی وجہ سے ان کا تعلق گزشتہ چالیس پینتالیس سال پہلے کے تمام اچھے ادیبوں اور شاعروں سے رہتا تھا۔ ان میں علامہ راشد الخیری، خواجہ حسن نظامی اور نیاز فتح پوری جیسے جلیل القدر ادیب شامل تھے۔ ان صاحب سے خواجہ صاحب کا تعلق دوگونہ تھا۔ ایک تو ادب کا اور دوسرے مذہب کا۔ ارتضٰی صاحب نے بھی کئی رسالے نکالے جن میں ''درویش'' بہت مشہور ہوا۔ خواجہ صاحب نے جب حلقۂ مشائخ نواب بڈھن کے کمرے پر قائم کیا تو ''نظام المشائخ'' کے نام سے محمد ارتضٰی صاحب نے ایک ماہنامہ جاری کیا۔ اس پرچہ میں جہاں اہلِ سلوک کے مسائل پر مضامین ہوتے تھے وہاں اعلیٰ درجے کے ادبی مضامین بھی شائع ہوتے تھے۔ خواجہ صاحب نے اس زمانے میں بہت اچھے اچھے مضامین لکھے۔ محمد ارتضٰی صاحب کو خواجہ صاحب نے ''ملا واحدی'' کا خطب دیا جو اتنا مشہور ہوا کہ آج واحدی صاحب کو سب جانتے ہیں اور محمد ارتضٰی کو کوئی نہیں جانتا۔ واحدی صاحب کی دولت اور خواجہ صاحب کی عقل نے مل کر بڑے بڑے کام کیے۔ روپیہ لگانے والے خواجہ صاحب کو ہمیشہ مل جاتے تھے۔ واحدی صاحب کی طرح خواجہ صاحب کے ایک اور بہت بڑے قدرداں بھیا احسان تھے جو میرٹھ کے رئیسوں میں شمار ہوتے تھے۔ انہیں بھی علم و ادب کا بہت شوق تھا۔ ان کا ایک اخبار بھی نکلتا تھا۔ اسی اخبار کے سلسلے میں خواجہ صاحب سے ان کے دوستانہ تعلقات قائم ہوئے۔ کان پور کی مسجد کا جب پہلی دفعہ ہنگامہ ہوا تو خواجہ صاحب میرٹھ میں ہی تھے اور انہوں نے ایک بہت بڑے جلسے میں ایسی دھواں دھار تقریر کی کہ مسلمانوں میں جوش و خروش پھیل گیا۔ اس تقریر سے خواجہ صاحب کی بہت شہرت ہوئی۔ بھیا احسان اور واحدی صاحب سے خواجہ صاحب کے تعلقات قیام پاکستان تک

نہایت مخلصانہ رہے۔ پاکستان بننے کے بعد خواجہ صاحب تو دلّی ہی میں رہ گئے اور بھیّا احسان اور واحدی صاحب کراچی چلے آئے۔ یہاں آکر جو حال اور سب مہاجروں کا ہوا وہی ان کا بھی ہوا۔

روایتِ عام کے مطابق خواجہ صاحب کے تین لاکھ مرید تھے۔ ہندو اور عیسائی بھی ان کے مرید تھے۔ ایک اطالوی شہزادی بھی ان کی مرید تھی۔ فرماتے تھے کہ برنارڈ شا بھی میرا مرید ہے اور پرنس آف ویلز (ایڈورڈ ہشتم) نے بھی میرے مریدوں میں شامل ہونے کے لیے مجھے چٹھی لکھی ہے۔

خواجہ صاحب کو خطابات دینے اور نام رکھنے کا عجب سلیقہ تھا۔ علامہ راشد الخیری کو ''مصورِ غم'' خواجہ صاحب ہی نے خطاب دیا تھا۔ میرے والد کو ''وارث الادب'' کہتے اور لکھتے تھے۔ خود مصورِ فطرت تھے۔ ان کی بیگم خواجہ بانو ہیں۔ ایک بیٹی حور بانو اور دوسری روحہ۔ ضیاء الدین احمد کو ان کی تاریخی معلومات کی وجہ سے برنی خطاب دیا تھا۔ کوئی ناسوتی نظامی تھے اور کوئی ابن عربی۔ ایک صاحب ملنسار نظامی کہلاتے تھے۔ بھیّا احسان کشفی شاہ تھے۔ ایک صاحب مستری عشقی کہلاتے تھے۔ کوئی جمالی تھا کوئی غزالی۔ ایک تھے قلندر نظامی۔ یہ قلندر نظامی بھی عجیب چیز تھے۔ ان کی وضع قطع خواجہ صاحب سے مشابہ تھی۔ بلکہ کہا جاتا تھا کہ خواجہ صاحب کی اترن انہی کو ملتی ہے، وہی پیلی ٹوپی، وہی چغہ، کا کلیں چھٹی ہوئیں۔ عمر میں خواجہ صاحب سے بڑے تھے۔ بہت غریب آدمی تھے۔ وضعدار ایسے کہ سوائے خواجہ صاحب کے اخباروں کے اور کسی کا اخبار نہ بیچتے تھے۔ دلّی والے کہتے تھے کہ خواجہ صاحب کو پیر و مرشد بنانے میں قلندر نظامی نے بڑا کام کیا ہے۔ روایت مشہور تھی (اور اکثر غلط روایتیں بھی زیادہ مشہور ہو جایا کرتی ہیں) کہ قلندر نظامی کا کام ہی یہ تھا کہ خواجہ صاحب کو سجدے کرتے رہیں۔ یہ سجدے بڑے خضوع و خشوع سے کیے جاتے تھے اور دیکھنے والے ان سے بے حد متاثر ہوتے تھے۔ یہ بھی کہا جاتا تھا کہ اُن کا 'فی سجدہ' کچھ مقرر تھا جس سے قلندر نظامی نے کافی رقم کمائی۔ خیر ہم نے تو یہ دیکھا کہ قلندر نظامی بہت ضعیف ہو گئے تھے اور کوئی کام نہیں کر سکتے تھے۔ خواجہ

صاحب ہی کچھ سلوک کرتے تھے جوان کی زندگی کے آخری دن تیرہوتے تھے۔

خواجہ صاحب جدت طرازیوں کے دلدادہ تھے۔ عیسوی، ہجری، فصلی سنوں کے مقابلے میں انہوں نے اپنا ایک سن وضع کیا تھا۔ بارہ مہینوں کے نام بارہ اماموں پر رکھے تھے اور سات دنوں کے بھی مقدس نام تجویز کیے تھے۔ اپنی بعض کتابوں کے نام بھی عجیب وغریب رکھے تھے ''کم ٹوموت، فرام قبلہ وشملہ، طمانچہ بر رخسار یزید، کانا باتی، مرشد کو سجدۂ تعظیم'' وغیرہ۔

جب شدھی نے بہت زور پکڑا تو خواجہ صاحب نے تبلیغ کا کام شروع کر دیا. اس میں اتنے کامیاب رہے کہ ایک چھوٹے موٹے راجہ کو بھی انہوں نے مسلمان کرلیا تھا۔ مگر سوامی شردھانند کی تحریک بڑھتی ہی جارہی تھی۔ اس کے ساتھ پوری ہندو قوم کی دولت تھی۔ خواجہ صاحب نے تاڑ لیا کہ یہ یوں نہیں دبے گا۔ لہٰذا انہوں نے سوامی جی کو مباہلے کا چیلنج دے دیا۔ خواجہ صاحب نے کہا۔ ''آؤ ہم تم دونوں قطب مینار سے چھلانگ لگاتے ہیں۔ جو سچا ہوگا وہ جی جائے گا اور جو جھوٹا ہوگا وہ مر جائے گا۔'' خواجہ صاحب نے تمام اخباروں میں اس کا اعلان کرا دیا اور اس کا وقت بھی مقرر کر دیا۔ اس دن صبح ہی سے قطب مینار پر ٹھٹ کے ٹھٹ لگنے شروع ہوئے۔ خلقِ خدا اڈی چلی آتی تھی۔ وقت مقررہ پر خواجہ صاحب آ پہنچے مگر شردھانند نہیں آئے۔ خوب تھڑی تھڑی ہوئی، میدان خواجہ صاحب کے ہاتھ رہا۔ (ایک روایت یہ بھی ہے کہ شردھانند پہنچ گیا، خواجہ صاحب نہیں پہنچے)۔

دلّی میں جتنے بھی مسلمان ایڈیٹر اور اشتہاری حکیم تھے سب کے سب بالواسطہ یا بلاواسطہ خواجہ صاحب کے مرہون منت تھے۔ خواجہ صاحب نے کتابوں اور رسالوں کے علاوہ دوائیں اور غذائیں بھی بیچنی شروع کر دی تھیں۔ ''فقیر کی چٹکی'' اور ''چودہ چھوارے'' اور عجیب عجیب ناموں کی دوائیں تھیں۔ دوائیں ان کی کتابوں سے بھی زیادہ بکتی تھیں۔ سویابین اور فاسفورس کا تیل تو پاکستان بننے سے پہلے تک مشتہر ہوتا رہا۔ تجارت کا اصول یہ سمجھا جاتا تھا کہ کتابوں میں چار آنے کا ایک روپیہ بنتا ہے اور دواؤں میں ایک آنے کا ایک روپیہ۔ اکثر باہر والے کسبِ معاش کے لیے دلّی آئے اور خواجہ صاحب کے ہاں

ملازم ہوگئے۔ تھوڑے دنوں میں وہ خود خواجہ صاحب کا سارا کاروبار لے بیٹھے اور برکت بھی اللہ نے ان کے اس چوری کے کاروبار میں ایسی دی کہ ان میں سے کئی تو اب لکھ پتی ہیں۔ خواجہ صاحب کے رسالے بھی تھک گئے اور دوائیں بھی۔ مگر ان کے رسالے بھی خوب چل رہے ہیں اور دوائیں بھی۔ ان میں سے ایک صاحب شاکی تھے کہ کراچی میں بہت مہنگائی ہے، فرماتے تھے کہ جو شیشی پہلے ایک آنے میں گھر پڑتی تھی اب دو آنے میں تیار ہوتی ہے۔ بکتی پہلے بھی تین روپے کی تھی اور اب بھی تین ہی روپے کی بیچنی پڑتی ہے۔

ایک زمانے میں خواجہ صاحب کی قوتِ ارادی غیر معمولی طور پر بڑھی ہوئی تھی۔ کسی نے اُن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں اور موم ہوا۔ ایک دفعہ خواجہ صاحب دوپہر کو اپنے دفتر میں اکیلے بیٹھے تھے کہ ایک لٹھ بند آریہ سماجی غنڈا اندر گھس آیا۔ خواجہ صاحب نے لکھتے لکھتے قلم روکا، آنکھیں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا اور بولے۔ ''چلے جاؤ یہاں سے'' اور وہ کچھ ایسا مرعوب ہوا کہ فوراً واپس چلا گیا۔ ایک دفعہ اور ایک ایسا ہی واقعہ پیش آیا۔ پرانی قلمی کتابوں کا ایک ذخیرہ دکھانے کے بہانے سے ایک ہندو خواجہ صاحب کو ایک گھر میں لے گیا۔ جب خواجہ صاحب گھر میں داخل ہوگئے تو اس نے کواڑ بند کر کے کنڈی لگالی۔ خواجہ صاحب بالکل ہراساں نہیں ہوئے۔ ڈپٹ کر بولے۔ ''کھول دروازہ'' اس نے سہم کر دروازہ کھول دیا اور خواجہ صاحب بڑے اطمینان سے اپنے گھر چلے آئے۔

پروپیگنڈا خواجہ صاحب کی سب سے بڑی قوت بھی تھی اور کمزوری بھی، خوبی بھی اور عیب بھی۔ اپنی بات منوانے کے لیے وہ جائز و ناجائز، موزوں اور ناموزوں کا امتیاز اُٹھا دیتے تھے۔ مثلاً سلطان جی کی باؤلی پر سے جو گلیہارا بائیں ہاتھ سے اندر جاتا ہے اس کے سرے پر ایک قبر سب سے نمایاں ہے۔ اس پر کتبہ لگوادیا۔ ''حسن نظامی کے دادا کی قبر'' واللہ اعلم بالصواب۔

اُردو کا پروپیگنڈا کرنے پر آئے تو اپنے ایک گھر کا نام ''اُردو منزل'' رکھ دیا اور اس میں تمام ٹائیل لگوادیئے جن پر ''ہر گھر اُردو'' اور ''گھر گھر اُردو'' لکھا ہوا تھا۔ یہ

ٹائٹل انہوں نے خود بنوائے تھے اور تلقین فرمائی تھی کہ تمام مسلمانوں کو یہ ٹائٹل خرید کر گھروں میں لگوانا چاہئیں۔

خواجہ صاحب کے دماغ میں نئی سے نئی آتی تھی۔ ایک زمانے میں اعلیٰ پیمانے پر کتابیں چھاپنے کا اعلان کیا۔ اس کے لیے ایک کمپنی قائم کی جس کا نام ''دی حسن نظامی ایسٹرن لٹریچر کمپنی لمیٹڈ'' رکھا۔ اس کے حصے فروخت کیے گئے، خوب روپیہ برسا، مگر کچھ ہی عرصے بعد یہ کمپنی ایسی غائب ہوئی کہ لوگ اسے جھنکتے ہی رہ گئے۔ اسی طرح غالب کے مزار کے لیے کئی دفعہ اپیل کر کے چندہ جمع کیا مگر مزار نہ بن سکا۔ لیکن ان کے عقیدت مندوں کی عقیدت مندی میں کوئی فرق نہ آیا۔

خواجہ صاحب کو غصہ کبھی نہ آتا تھا۔ نہایت شائستہ اور موثر گفتگو کرتے تھے۔ ہر ایک کی سعی سفارش کے لیے جھٹ تیار ہو جاتے اور دامے، درمے، قدمے، سخنے اس کی مدد کرتے۔ غرور ان میں نام کو نہیں تھا۔ ہر ایک سے اچھی طرح پیش آتے۔ یہاں تک کہ بدخواہوں اور دشمنوں سے بھی۔

خواجہ صاحب سلجھی طبیعت کے آدمی تھے۔ مذہبی پیشواؤں میں بھی شمار ہوتے تھے۔ مگر تنگ نظر ملائیت سے کوسوں دور تھے۔ تھیٹر اور سنیما دیکھتے تھے۔ قوالی تو خیر سارے ہی صوفی سنتے ہیں۔ خواجہ صاحب قوالی کے علاوہ بھی اور سب قسم کے گانے سن لیتے تھے۔ کوئی تیس سال ادھر کا ذکر ہے، کرنل اشرف الحق حیدر آباد دکن سے دلّی آئے ہوئے تھے۔ یہ بھی ایک عجیب وغریب شخصیت کے آدمی تھے۔ چودہ سال ولایت میں رہ کر ڈاکٹری پڑھی تھی۔ ریاست دکن کی افواج کے بڑے ڈاکٹر تھے۔ ہزل اور فحش گوئی میں اپنا جواب نہ رکھتے تھے۔ مسکرات کے تجربات کرتے ساری عمر گزر گئی۔ تجربہ اپنے اوپر بھی کرتے تھے اور دوسروں پر بھی۔ مزاج درویشانہ تھا۔ فرقہ رفاعیہ سے منسلک ہو گئے تھے اور خلیفہ بھی ہو گئے تھے۔ ضربیں لگا لیتے تھے، کیمیا بنانے کا بھی شوق تھا۔ مگر سونا کبھی نہیں بنا۔ ہمیشہ ایک آنچ کی کسر رہ گئی۔ کرنل صاحب کے تعلقات خواجہ صاحب سے مخلصانہ تھے۔ اس زمانے میں جب دلّی آئے تو اپنے آبائی مکان میں اترے۔ یہ مکان

تراہا بیرم خاں مفتی والوں کے پھاٹک میں ہے۔ ٹیڑھا بنا ہوا ہے۔ اس لیے ٹیڑھی حویلی کہلاتا ہے، اس ٹیڑھی حویلی کی چھت پر ایک محفل سماع برپا ہوئی۔ دلّی میں دو بہنیں تھیں جو مل کر گاتی تھیں۔ یہ مہترانیاں کہلاتی تھیں۔ انھوں نے تو خود کبھی نہیں کمایا البتہ ان کے باپ دادا لال بیگی تھے۔ انھوں نے بچپن ہی سے گانا سیکھا تھا۔ شرفا کی مجلسوں میں جاتی تھیں۔ ہر جگہ جاتی بھی نہ تھیں۔ صاف ستھرا لباس، اچھے چہرے مہرے، نستعلیق گفتگو، قاعدے قرینے سے واقف۔ ایک بہن ڈھولک لے لیتی۔ برابر میں اُستاد جی سارنگی لے کر بیٹھتے، پیچھے ہارمونیم والا ہوتا۔ ایک بڑے بڑے **گلمچّھوں** والا آدمی ان کے ساتھ ہوتا۔ یہ ان کا باپ تھا۔ سازے ملے، راگ شروع ہوا، بھمیری آوازیں، سماں بندھ جاتا تھا۔ اس محفل میں خواجہ صاحب بھی شریک ہوتے تھے۔ ہنسی مذاق کی باتیں ہوتی جاتی تھیں۔ اس زمانے میں مولانا محمد علی سے خواجہ صاحب کی خوب چل رہی تھی۔ روزانہ خواجہ صاحب کے پوسٹر نکل رہے تھے۔ مولانا محمد علی نے خواجہ صاحب کا نام ہی ''قدِ آدم پوسٹر'' رکھ دیا تھا۔ کوئی غزل گائی جا رہی تھی۔ پورا شعر یاد نہیں رہا۔ مصرعۂ ثانی تھا......

تمہاری بدگمانی چھپ گئی ہے اشتہاروں میں

اس پر ایک قہقہہ پڑا تو خواجہ صاحب چونکے اور مسکرا کر بولے۔ ''کیا ہے؟ کوئی پوسٹر؟'' اس پر ایک اور قہقہہ پڑا اور دیر تک سب ہنستے رہے۔

ایک دفعہ خواجہ صاحب اور مولانا محمد علی میں چلی اور ایسی چلی کہ بھلے آدمی تراہ تراہ پکار اٹھے۔ ایک صاحب تھے ضیاء الحق، ہاپڑ کے رہنے والے۔ اپنے وقت کے بڑے مشہور لوگوں میں سے تھے۔ انہیں بڑے بڑوں کو نیچا دکھانے میں مزہ آتا تھا۔ ہر ایک کی ٹوہ لیتے رہتے اور جہاں موقع ملتا چٹک لیتے۔ ان کے کاٹے کا منتر ہی نہ تھا۔ اپنے اس فن کی وجہ سے ہزاروں کے وارے نیارے کرتے تھے۔ یہ صاحب خواجہ صاحب کے بھی دوست تھے اور مولانا محمد علی کے بھی۔ نہ جانے ان کے جی میں کیا آئی کہ انھوں نے ان دونوں دوستوں کو لڑوا دیا۔ خواجہ صاحب کا کوئی خط تھا جس کی بنیاد پر انہیں انگریزوں کا

جاسوس ٹھہرایا گیا۔ مولانا محمد علی انگریز کے نام سے جلتے تھے، ان کے تلووں سے جو لگی تو تالو سے نکل گئی۔ ایسے چراغ پا ہوئے کہ اپنے اخبار ''ہمدرد'' میں انہوں نے خواجہ صاحب کے خلاف لکھنا شروع کر دیا۔ خواجہ بھلا کب دبنے والے تھے۔ انہوں نے ترکی بہ ترکی جواب دینا شروع کیا اور ایک نیا اخبار ہی اس ہنگامے کے لیے جاری کر دیا۔ دونوں طرف سے وہ گندگی اُچھلی کہ توبہ ہی بھلی۔ اس کا یہ بُرا اثر پڑا کہ دونوں کی قدر و وقعت لوگوں کے دلوں سے جاتی رہی۔ خواجہ صاحب کے اخبار میں ایک کارٹون چھپا جس میں دکھایا گیا تھا ایک دیو ہیکل شخص نہایت خونخوار انداز میں کھڑا ہے اور اس کے سامنے ایک ننھا مچھر بیٹھا ہے۔ مچھر کہہ رہا ہے۔ ''تو نمرود ہے اور میں مچھر۔ میں تیری ناک میں گھس جاؤں گا۔'' بارے کچھ لوگ بیچ میں پڑے اور لڑائی بند کرائی گئی۔ خواجہ صاحب نے اس ساری لڑائی کی روداد ''جنگ صفین'' کے نام سے کتابی شکل میں شائع کی۔ یہ کتاب خوب بکی۔

خواجہ صاحب کو نئی سے نئی سوجھتی تھی۔ ایک دفعہ دلّی کے ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی سارے ایڈیٹروں کو آموں اور آئس کریم کی دعوت دی۔ بڑا عمدہ انتظام کیا۔ اعلیٰ درجے کے سرولی آم کھلائے اور بڑی خوش ذائقہ آئس کریم۔ انگریزوں کو قوالی سنوانا تو ان کے لیے ایک عام بات تھی۔ سترھویں کے موقع پر عرس سے ایک دن پہلے خواجہ صاحب میدان عرفات میں اپنے انتظام سے قوالی کراتے تھے۔ انہوں نے اپنے احاطوں اور کمروں اور زمینوں کے عجیب عجیب نام رکھے تھے۔ اُنہیں میں سے ایک احاطہ کا نام میدانِ عرفات تھا۔ ایک وادیِ ایمن تھی۔ ایک ایمان خانہ تھا۔ خود جس گھر میں رہتے تھے اس کا نام رین بسیرا تھا۔ قوالی میں شہر اور باہر کے تمام مشہور آدمی مدعو ہوتے تھے۔ ہندو اور سکھ بھی بڑی عقیدت سے اس محفل میں شریک ہوتے تھے۔ خواجہ صاحب تقریر کرتے اور سلطان جی یا امیر خسرو کے واقعات بتاتے۔ ہندوستان کی چیدہ چیدہ ٹولیاں قوالی سناتیں۔ ایک زمانہ میں بخشا قوال کا زور بندھا، جب اس پر کسی وجہ سے عتاب ہو گیا تو واعظ قوال نے اپنا رنگ جمایا۔ واعظ قوال صاحب خود پیری مریدی

کرتے تھے۔ وہ بھی کچھ عرصہ بعد معتوب ہو گئے۔ ان کے بعد پریم راگی مشہور ہوئے اور وہ لد گئے تو ایک چھنگا قوال تھا۔ اسے نظام راگی کا خطاب دے کر مشہور کیا گیا۔ غرض خواجہ صاحب کے خاص قوال یوں ہی بنتے بگڑتے رہے۔

میرے لڑکپن میں خواجہ صاحب نے دلّی سے ایک نیا اخبار ''رعیت'' جاری کیا تھا۔ اس میں کام کرنے سردار دیوان سنگھ دلّی آئے تھے۔ سردار دیوان سنگھ پہلے کہیں کمپاؤنڈر تھے مگر انہیں ہمیشہ سے یہ خیال تھا کہ مجھے تو بڑا آدمی بننا ہے۔ اخبار نویسی کا شوق رکھتے تھے۔ اخبار ''رعیت'' کی ایڈیٹری سے ان کی اخباری زندگی شروع ہوئی۔ خواجہ صاحب نے ان کے خلوص و محبت کو دیکھ کر ''مفتوں'' کا خطاب دیا۔ پھر دیوان سنگھ صاحب نے اپنا اخبار ''ریاست'' شائع کرنا شروع کر دیا۔ جو آج تک اُردو کے تمام ہفتہ وار اخباروں میں منفرد ہے۔ مفتوں سے خواجہ صاحب کے تعلقات سالہا سال تک اچھے رہے۔ کبھی کبھی ان میں کھٹک بھی گئی مگر صلح صفائی ہو گئی۔ پھر ایک معاملے میں ایسی بگڑی کہ ہزار کوششوں پر بھی سردار صاحب کا دل صاف نہ ہو سکا اور آخر تک، یہ رنجش جاری رہی۔ خواجہ صاحب نے مفتوں کے خلاف بہت کچھ لکھا مگر اخیر میں خود ہی خاموش ہونا پڑا کیوں کہ مقابلہ بڑے بے ڈھب آدمی سے تھا۔ خواجہ صاحب نے ایک بات یہ بڑے مزے کی لکھی تھی کہ میں نے سردار دیوان سنگھ کو ''مفتوں'' کا خطاب دیا تھا جس کے معنی ہیں ''فتنہ زدہ''۔

خواجہ صاحب کی مطبوعات کئی سو ہیں۔ یہ کتابیں تین طرح کی ہیں۔ ایک تو وہ ہیں جو خواجہ صاحب نے خود لکھی ہیں۔ دوسری وہ ہیں جو خواجہ صاحب نے لکھوائی ہیں یا ترجمہ کرائی ہیں اور مصنف یا مترجم ہی کے نام سے شائع ہوئی ہیں۔ تیسری وہ جو خواجہ صاحب نے اپنی نگرانی میں اور اپنے ہی طرزِ تحریر میں لکھوائی ہیں۔ موخرالذکر کتابوں پر اصل مصنف کا نام نہیں دیا گیا۔ خواجہ صاحب ہی کے نام سے یہ کتابیں منسوب ہیں۔ بعض لوگ اس بات کو خواجہ صاحب کی بد دیانتی پر محمول کرتے ہیں۔ لیکن اصل بات یہ ہے کہ خواجہ صاحب نے ان کتابوں میں اتنی اصلاح و ترمیم کی ہے کہ یہ کتابیں حقیقت

میں انہیں کی ہوگئی ہیں۔ واقعات تو وہی ہیں جو سینکڑوں کتابوں میں بھرے پڑے ہیں۔ انہیں ایک خاص انداز میں سلیقے سے پیش کرنا ہی اصل کمال ہے۔ ظاہر ہے خواجہ صاحب ہندی کے پنڈت نہیں تھے لیکن خواجہ صاحب کا ترجمۂ قرآن ہندی میں موجود ہے۔ خواجہ صاحب نے یہ ہندی خود تو لکھی نہیں ہوگی۔ کسی اچھے ہندی جاننے والے سے لکھوائی ہوگی۔ مگر اس کا ایک ایک لفظ خوب ٹھونک بجا کر دیکھ لیا ہوگا۔ فقرے بھی بدلوائے ہوں گے۔ ترجمہ کی صحت کا بھی خیال رکھا ہوگا۔ ترجمہ کی ذمہ داری بھی خواجہ صاحب ہی کے سر ہے اس لیے یہ ترجمہ خواجہ صاحب ہی کا ہوا۔

دِلّی میں ایک جید عالم مولوی عبدالسلام صاحب ہیں۔ انہیں دُنیا بھر کے علوم پر عبور حاصل ہے۔ جس علم سے کہیے خدا کا وجود ثابت کر دیتے ہیں۔ ان کے علم کی دھاک دور دور تک بیٹھی ہوئی ہے اور واقعہ یہ بھی ہے کہ وہ اپنا جواب نہیں رکھتے۔ مزاج قلندرانہ ہے۔ اپنے آگے کسی کو نہیں گردانتے اور جب انہیں جلال چڑھتا ہے تو علوم کے سمندر میں طوفان آجاتا ہے۔ پھر مولانا کی جادو بیانی سننے سے تعلق رکھتی ہے۔ ضلع جگت پر اتر آتے ہیں تو وہ ناکہ جوڑی کا بخیہ کرتے ہیں کہ پیوند پر پیوند لگتا چلا جاتا ہے اور ہزار جامہ تیار ہوجاتا ہے۔ تصوف کے بھی دلدادہ ہیں۔ عرسوں میں شریک ہوتے ہیں، قوالی سنتے ہیں، رنڈیوں کا گانا بھی سنتے ہیں۔ حسن پرست ہیں۔ ہر چیز میں یار کا جمال دیکھتے ہیں۔ کسی کے کہنے سننے کی پروا نہیں کرتے اور کسی کی شامت نے دھکا دیا ہے کہ ان سے بھڑے۔ انہیں چھیڑنا تو ایسا ہے جیسے بھڑوں کے چھتے کو چھیڑ دیا۔ پیچھا چھڑانا مشکل ہوجاتا ہے۔ مگر ان کی تقریر کا لطف اُٹھانا ہو تو ایک ذرا اُنہیں چھیڑنا ہی پڑتا ہے۔ بس پھر آپ چپکے رہیے اور ان کی گل فشانی گھنٹوں سنے جایئے۔ تو ان مولانا عبدالسلام سے خواجہ صاحب کی بھی یاداللہ تھی۔ خواجہ صاحب نے اُن سے فرمائش کی کہ آپ ایک کتاب تصوف پر لکھ دیجیے۔ مولانا نے فرمایا۔ ''خدا خوش رکھے، لکھ دیں گے شیخ!'' مولانا کو لکھنے کا شوق نہیں ہے پھر بھی انہوں نے اپنے خلاف مزاج ایک پوری کتاب تصوف پر لکھ دی۔ کتاب پوری ہوئی تو کسی جمعرات کو سلطان جی پہنچے اور فاتحہ

پڑھ کر خواجہ صاحب کے ہاں گئے۔ خواجہ صاحب تو انہیں خوب اچھی طرح سے جانتے ہی تھے۔ بڑے سلیقے سے کتاب کے بارے میں بات چیت کرتے رہے۔ مولانا کی تعریف کی۔ کتاب کی تعریف کی۔ معاوضہ بھی ان سے طے کر لیا۔ اخیر میں بولے کتاب آپ کے نام سے شائع نہیں ہوگی۔'' مولانا نے کہا۔ ''کیا مضائقہ ہے شیخ!'' خواجہ صاحب بولے۔ ''یہ میرے نام سے شائع ہوگی۔'' مولانا کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ خواجہ صاحب کا کچھ لحاظ ہی کر گئے۔ خواجہ صاحب کے ہاتھ سے کتاب لے کر اس کے چار ٹکڑے کیے اور ردی کی ٹوکری میں ڈال دی۔ خواجہ صاحب نے کہا۔ ''یہ آپ نے کیا کیا؟'' بولے۔ ''خدا خوش رکھے، چاء پلاؤ شیخ!'' اور چائے پی کر چلے آئے۔ گویا کوئی بات ہی نہیں ہوئی۔ اخیر تک خواجہ صاحب سے اسی وضعداری سے ملتے رہے۔ وہ کتاب چھپ جاتی تو علمی نوادر میں شامل ہوتی۔

خواجہ صاحب کا اثر مسلمان والیانِ ریاست پر بہت تھا۔ نظام دکن انہیں دو تین سو روپے ماہوار وظیفہ دیتے تھے۔ حیدر آباد کے تمام امراء انہیں بہت مانتے تھے۔ مہاراجہ کرشن پرشاد تو ان کے مرید ہی تھے اور ایسے مرید کہ اپنے بڑے لڑکے کا نام انہوں نے خواجہ پرشاد رکھا تھا۔ خواجہ صاحب کی اس کامیابی نے ان کے بہت سے حاسد پیدا کر دیئے تھے۔ انہیں طرح طرح سے بدنام کرنے کی کوششیں کی جاتیں تھیں۔ خواجہ صاحب کو راسپوتین تک بنایا گیا۔ مگر خواجہ صاحب کی کرامات دیکھئے کہ ان کے اقتدار میں ذرہ برابر فرق نہ آیا۔ رامپور، مانگرول، مانادور، جاورہ سارے نواب انہیں سر آنکھوں پر جگہ دیتے تھے۔ افتخار علی خان نواب جاورہ خواجہ صاحب کی بڑی عزت و تکریم کرتے تھے۔ بخشا قوال جاورہ دربار کا خاص قوال تھا، وہ گاتا بھی اچھا تھا اور کچھ اس ادا سے بتاتا بھی تھا کہ دیکھنے والے پھڑک جاتے تھے۔ اس کی اسی ادائیگی پر نواب جاورہ بھی لٹو تھے۔ نواب جاورہ اور خواجہ صاحب بیٹھے تھے اور بخشا گا رہا تھا۔ اس نے ایک شعر گایا اور نواب نے ایک توڑا روپیوں کا دے دیا۔ دوسرا شعر گایا اور دوسرا توڑا دے دیا۔ اس طرح کئی توڑے دے، دیئے تو خواجہ صاحب اٹھے اور بخشا کو خاموشی کا اشارہ کر کے نواب سے

بولے۔ ''یہ بخشتا ہے تو آپ بھی دل شاہ ہیں۔'' نواب صاحب نے خواجہ صاحب کو سینے سے لگا لیا۔ اس دن سے نواب کا نام ہی دل شاہ مشہور ہو گیا۔ یہاں تک کہ ان کی رعایا بھی اُنہیں دل شاہ ہی کہنے لگی۔

خواجہ صاحب بڑے زندہ دل اور شگفتہ مزاج آدمی تھے۔ حاضر جواب بھی ایسے ہی تھے۔ گھر پر ان کے قریب ٹیلیفون رکھا رہتا تھا۔ دن بھر میں سینکڑوں ٹیلیفون آتے تھے۔ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ گھنٹی بجی۔ خواجہ صاحب نے ٹیلیفون اٹھایا اور بغیر جواب دیئے بند کر دیا۔ پھر خود ہی کہتے، کوئی گالیاں دے رہا تھا۔ ایک صاحب نے ٹیلیفون پر پوچھا۔ ''خواجہ صاحب آپ روزنامچہ تو لکھتے ہیں شب نامچہ کیوں نہیں لکھتے۔'' گھنٹی سن کر خواجہ صاحب نے ٹیلیفون اُٹھایا۔ کوئی صاحب بلی کی بولی بولے۔ 'میاؤں۔'' خواجہ صاحب نے بلے کی طرح ''می...... آؤں'' کہا اور اس نے گھبرا کر ٹیلیفون بند کر دیا۔

خواجہ صاحب ذرا سی بات میں ناراض ہو جاتے تھے اور ذرا سی بات میں خوش بھی ہوتے تھے۔ قائد اعظمؒ سے اختلاف ہوا تو عرصۂ دراز تک ان کے خلاف لکھتے رہے۔ پھر ان کے ہم خیال ہوئے تو اس شدت کے ساتھ کہ قرآن کی رو سے مولانا آزاد کے قتل کا فتویٰ تک دے دیا۔ اس کے بعد پھر مولانا آزاد کے بھی دوست ہو گئے۔ علامہ اقبالؔ سے خواجہ صاحب کے ذاتی تعلقات بہت خوشگوار تھے۔ نہ جانے خواجہ صاحب کو کس بات سے رنجش ہو گئی کہ اقبالؔ کو شاعرِ مشرق سے گھٹا کر انہوں نے شاعرِ پنجاب لکھنا شروع کر دیا۔ علامہ اقبالؔ نے یہ سوچا کہ یہ تو بہت بُرا ہوا۔ چنانچہ انہوں نے خواجہ صاحب کو زک دینے کی ایک ترکیب سوچی۔ خواجہ صاحب کو ایک خط لکھا کہ میرے گھٹنے میں مدت سے درد تھا۔ میں نے آپ کا فاسفورس کا تیل ملا۔ اس سے درد کو افاقہ ہو گیا۔ اس دن سے علامہ اقبالؔ پھر شاعرِ مشرق ہو گئے۔ منادی میں فاسفورس کے تیل کا جو اشتہار چھپتا تھا اس میں شاعرِ مشرق سر محمد اقبالؔ کی رائے ضرور شائع ہوتی تھی۔

اگست ۱۹۴۷ء میں جب دلّی میں مسلمانوں کا قتل عام شروع ہوا تو خواجہ صاحب بستی نظام الدین ہی میں تھے۔ وہ بار بار دلّی کے افسروں کے پاس جاتے مگر کوئی

مفید نتیجہ برآمد نہ ہوتا۔ آخر تنگ آکر پٹیل کے پاس پہنچے۔ اس نے پہلے تو انتظار کرایا اور پھر ملا تو بڑی بے رخی سے ملا۔ پٹیل کی لڑکی خواجہ صاحب کی بڑی عزت کرتی تھی۔ وہ بھی وہاں آ گئی تو پٹیل کچھ پسیجا۔ خاطر خواہ نتیجہ تو پھر بھی نہ نکلا۔ اتنا ضرورا ہوا کہ بستی نظام الدین کی حفاظت کا کچھ انتظام ہوگیا مگر خواجہ صاحب دل برداشتہ ہوکر اپنے گھر والوں کو لے کر ہوائی جہاز سے حیدر آباد دکن چلے گئے۔ یہاں ان کے گھر بار پر تالے پڑ گئے اور پہرے بیٹھ گئے۔ جب پوری طرح امن و امان ہوگیا خواجہ صاحب دلّی واپس آئے۔ حکومت سے اپنا گھر واگزاشت کرایا۔ خدا جانے کیا ملا اور کیا نہیں ملا۔ کاروبار ان کے سب بگڑ گئے۔ دلّی کیا ہندوستان ہی میں مسلمان برائے نام رہ گئے۔ اسلامی ریاستیں سب ختم ہوگئیں۔ دوست کم اور دشمن زیادہ ہو گئے۔ واحدی صاحب تک کراچی چلے آئے لیکن خواجہ صاحب بڑی ہمت کے آدمی تھے، ہر قسم کی مصیبت جھیلتے رہے مگر بائیس خواجہ کی چوکھٹ اور سلطان جی کا آستانہ نہیں چھوڑا۔ اکبرالہ آبادی بہت پہلے کہہ گئے تھے......

حضرت ابو ہریرہؓ سے بلی نہ چھٹ سکی
خواجہ حسن نظامی سے دلّی نہ چھٹ سکی

آنکھوں سے معذور ہو گئے تھے۔ صحت نے جواب دے دیا تھا۔ پریشانیوں کا ہجوم تھا مگر پہلو میں دل اسی طرح زندہ تھا۔ دل میں اسی طرح امنگ اور ترنگ تھی۔ پرانی پیچش نے دھڑ توڑ دیا تھا مگر خوش گفتاری میں فرق نہ آیا تھا۔ آخری وقت تک چہکتے رہے۔ یہاں تک کہ طائرِ روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گیا۔

○○

اُستاد بیخود دہلوی

دلّی کے اُردو بازار میں کتب خانہ علم و ادب ادیبوں اور شاعروں کا ایک اچھا خاصہ اڈّہ بن گیا تھا۔ یوں تو چلتے پھرتے سبھی یہاں ٹھیکی لیتے تھے مگر مغرب کے بعد یہاں بطور خاص ادیبوں کا پھڑ جمتا تھا۔ آندھی جائے مینھ جائے، یہاں آنے والوں کا پھیرا ناغہ نہیں ہوتا تھا۔ ایک تو مرکزی جگہ، دوسرے کتب خانے کے مالک سید وصی اشرف کی خوش اخلاقی، شام پڑتے ہی سب اپنے اپنے گھروں سے چل کر کتب خانہ پر پہنچ جاتے۔ روز کے آنے والوں میں ظفر قریشی، اخلاق احمد، صلاح الدین قریشی، صادق الخیری، نہال سیوہاروی، فہیم بیگ چغتائی، میر صاحب (نام پوچھنے کی کبھی نوبت نہ آئی، بہار کے رہنے والے تھے) حکیم حبیب اشعر اور محمد میاں تھے۔ دو تین گھنٹے مزے مزے کی باتیں ہوتیں۔ چائے کے دور چلتے۔ یہ چائے دو طرح کی ہوتی تھی۔ ایک تو وہ جو وصی اشرف اخلاقاً پلاتے تھے اور دوسری وہ جو جرمانے میں پلائی جاتی تھی۔ یہ جرمانہ شاعروں سے بچنے کے لیے عائد کیا گیا تھا۔ دراصل ہوا یہ کہ شاعروں نے بھانپ لیا کہ یہاں شام کو چند شریف آدمی جمع ہوتے ہیں۔ بس پھر کیا تھا، اللہ دے اور بندہ لے۔ شاعروں نے یلغار شروع کر دی۔ شروع شروع میں تو تکلف میں انہیں سنا، پھر مروت میں۔ مگر جب جان ضیق میں آ گئی تو تکلف اور مروت دونوں کو بالائے طاق رکھا اور صاف صاف کہہ دیا جاتا کہ یہاں کا دستور کچھ اور ہے۔ وہ یہ کہ جو صاحب اپنے کلامِ بلاغت نظام سے مستفیض فرمانا چاہیں وہ سامعین کے کام و دہن کو بھی چائے سے فیض پہنچائیں، چنانچہ

شاعروں کی یورش ختم ہوگئی۔ اس پر بھی قرارِ شعر نے بہت سوں کو چین سے بیٹھنے نہ دیا اور شاید ہی کوئی منحوس دن ایسا گزرتا ہو کہ جرمانے کی چائے نہ پی جاتی ہو، اور تو اور آپس کے بیٹھنے والے بغلی گھونسہ بن جاتے۔ اچھے بھلے بیٹھے ہیں کہ لگے پہلو بدلنے۔ ارے بھئی خیر تو ہے؟ کسی نے برابر سے کہا۔ ''شعر لگ رہا ہے شاید!'' اور نہال نے جھٹ گلے میں باہیں ڈال کر بڑی لجاجت سے کہا۔ ''بھائی غزل ہوگئی ہے، سن لو۔'' کہا۔ ''بھائی سب کو چائے پلانی پڑے گی۔'' بولے۔ ''منگوا لیجئے۔'' مرزا جی چائے والے کا لڑکا تاوے کاٹتا ہی رہتا تھا۔ جھٹ لے آتا۔ نہال ترنم سے اپنی غزل سنانی شروع کرتے تو اخلاق احمد کہتے۔ ''دیکھو بھئی تحت اللفظ کی ہوئی تھی۔ اگر ترنم سے سنانی چاہتے ہو تو بسکٹ بھی ہوں گے۔'' نہال کہتے۔ ''اچھا بسکٹ بھی منگالو۔'' چنانچہ سب کے لیے ایک ایک نمکین بسکٹ بھی آجاتا۔ پھر غزل سنی جاتی۔ دُھواں دار واہ واہ ہوتی۔ نہال مرحوم نہالم نہال ہوجاتے۔ کبھی کبھی مرزا فہیم بیگ چغتائی اپنا موٹا سا ڈنڈا ہلاتے ہوئے آتے اور آتے ہی اعلان کر دیتے کہ ''آج جوانوں نے غزل کہی ہے۔ چائے منگوایئے سیّد صاحب۔'' سیّد وصی اشرف فوراً چائے کا آرڈر دے دیتے اور مرزا صاحب کی غزل سے سب لطف اُٹھاتے۔ یہ اجتماع اتنا دلچسپ ہوتا تھا کہ وصی اشرف اپنی دُکانداری بند کر دیتے تھے۔ اگر کوئی جاننے والا آکر کتاب مانگتا تو کہہ دیتے کہ ''اب تو وقت ختم ہوگیا۔'' اور اگر کوئی انجانا آجاتا تو کہتے۔ ''کل دن کو آپ آیئے، منگوا کر رکھوں گا۔'' غرض رات کے دس بجے تک خوب رونق رہتی۔

انہیں روز کے آنے والوں میں سے ایک حضرت بیخؔود دہلوی بھی تھے جو مغرب کے لگ بھگ ایڈورڈ پارک کی طرف سے ٹلکتے ٹلکتے آتے تھے۔ عمر زیادہ ہونے کی وجہ سے وہ کچھ پنگلے ہوگئے تھے۔ دونوں ٹانگیں کمان کی شکل کی ہوگئی تھیں اور انہیں چلنے میں خاصی زحمت ہوتی تھی۔ مگر وہ شام کو مٹیا محل سے ایڈورڈ پارک تک ضرور جایا کرتے اور واپسی میں کتب خانہ پر ٹھیکی لیتے، کبھی کتب خانہ کے سامنے ہی کرسی پر بیٹھ جاتے اور کبھی اندر جا بیٹھتے۔ وصی اشرف صاحب کے والد سید علی اشرف صاحب بڑے نیک اور پہنچے

ہوئے بزرگ تھے۔ عمر میں بیخود صاحب سے کچھ چھوٹے تھے مگر بیخود صاحب کو ان سے بڑی عقیدت تھی اور اکثر چمڑے والی پہاڑی کی چڑھائی چڑھ کر ان کے پاس جایا کرتے تھے۔ ایک دفعہ تو گھر میں بڑی ہنسی پڑی۔ سید صاحب کا مرید بھی تھا، دربان بھی اور وفادار خادم بھی، مگر بڑا سادہ لوح۔ ایک دن بیخود صاحب نے آواز دی، میاں مرادی نے پوچھا۔ ''آپ کا نام؟'' انہوں نے کہا۔ ''بیخود۔'' اندر جا کر میاں مرادی نے فرمایا ''بے وقوف صاحب آئے ہیں۔'' سیّد صاحب کی تیوری پر پہلے تو بل آیا مگر فوراً ہی سمجھ کر مسکرا دیئے اور بیخود صاحب کو اپنے پاس اندر بلوا لیا۔ وہ تو خدا نے بڑی خیر کی کہ بیخود صاحب کو میاں مرادی کے تواردکی خبر نہیں ہوئی۔ ورنہ وہیں لتّے لے ڈالتے۔

ہاں تو وصی اشرف صاحب سے بیخود صاحب کو دوگونہ تعلق خاطر تھا۔ ایک تو ان کے والد کے تقدس کی وجہ سے اور دوسرے ان کے سرمایۂ کتب کے باعث۔ بیخود صاحب کو کتابوں کی چاٹ پڑ گئی تھی۔ روزانہ ایک ناول لے جاتے اور اگلے دن واپس کر کے دوسرا لے جاتے۔ وصی اشرف نے انہیں بڑھیا سے بڑھیا اور گھٹیا سے گھٹیا سارے ہی ناول چٹا دیئے۔ مگر بیخود صاحب ہمیشہ یہی کہتے رہے کہ ''میاں اس میں مزہ نہیں آیا۔ کوئی اور دو۔'' اور وصی اشرف دلّی کے جوتے والوں کی طرح روزانہ انہیں ایک توفہ (تحفہ) ناول دیتے اور وہ اسے اپنے بڑے سے لاکھی رومال میں لپیٹ کر لے جاتے۔ پڑھتے صرف ناول ہی تھے۔

بیخود صاحب اس وقت اسّی سے اُوپر ہو چکے تھے۔ ہاتھوں میں رعشہ آ گیا تھا۔ چہرہ چرمرا ہو کر رہ گیا تھا۔ رنگ گھٹا ہوا گندمی، سفید براق سرسیدی داڑھی، لبیں ترشی ہوئیں۔ اتنی عمر ہونے پر خاصے ٹانٹے تھے اور سیدھے چلتے تھے۔ بتیسی پوری نقلی چڑھی ہوئی تھی۔ جس کا تالو اکثر ڈھیلا ہو جاتا اور بات کرنے میں پورا جباڑا نیچے آ رہتا۔ پھر اسے چبا کر ٹھیک کرتے تو بات کرتے۔ لہجہ خالص دِلّی والوں کا تھا۔ تکلف سے بری اور آواز اونچی اور کراری تھی۔ جب موج میں آتے تو بے ساختہ گالیاں بھی شروع کر دیتے، مگر بڑی برجستہ، اور جب انہیں جلال چڑھتا تو پھر چھوٹے بڑے کا لحاظ بھی اٹھ جاتا۔

ایک دفعہ ٹاؤن ہال میں بہت بڑا مشاعرہ ہوا۔ بیخودؔ صاحب نے مدتوں سے مشاعروں میں جانا چھوڑ دیا تھا۔ جنگ کا زمانہ تھا اور غالباً سرکاری مشاعرہ تھا۔ کنور مہندر سنگھ وغیرہ منت سماجت کر کے انہیں لے گئے۔ بیخودؔ صاحب نے نئی غزل کہی اور مشاعرے میں پہنچ گئے۔ ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ آگے کی قطاروں میں خواتین بھی تھیں۔ مشاعرہ خوب گرم ہو رہا تھا۔ بیخودؔ صاحب ڈائس پر پہنچے تو اُستاد کے نام کی آوازیں پڑنے لگیں۔ یوں بھی اُستاد زیادہ دیر کب بیٹھنے والے تھے، یاد نہیں کون صاحب صدارت کر رہے تھے۔ مشاعرے میں انتشار پیدا ہوتا دیکھ کر اُستاد ہی کے نام کا اعلان کر دیا۔ بیخودؔ صاحب خود نہیں پڑھتے تھے، ان کا ایک خوش آواز شاگرد تھا، وہ پڑھا کرتا تھا۔ اس دن اتفاق سے وہ شاگرد ساتھ نہیں تھا۔ ایک اور شاگرد تھا، وہ نہ صرف بد آواز تھا، طبع موزوں بھی نہ رکھتا تھا۔ بیخودؔ صاحب نے اُسے اپنی غزل دی اور وہ بڑے اہتمام سے اسے پڑھنے بیٹھا۔ مگر جب اس نے مصرعے ناموزوں پڑھنے شروع کیے تو ہال میں ہنسی پھیلنے لگی اور کچھ آوازے تاویزے بھی کسے جانے لگے۔ بیخودؔ صاحب پہلے تو اسے داد سمجھے، پھر جو معلوم ہوا کہ بیداد ہو رہی ہے تو مارے غصے کے بے آپے ہو گئے۔ وہیں سے مغلظات شروع کر کے شاگرد کی طرف کھسکے اور اس کے ہاتھ سے غزل چھین کر مائکروفون پر اسے گالیاں دینی شروع کیں۔ مشاعرے میں کھلبلی پڑ گئی اور ایک شور قیامت برپا ہو گیا۔ بارے بیخودؔ صاحب کا کڑا کا سنائی دیا اور انہوں نے اپنے شعر تحت اللفظ پڑھنے شروع کر دیئے۔ ہال میں سناٹا چھا گیا۔ شعر ختم ہوتا تو داد کا شور بلند ہوتا۔ سبحان اللہ! غزل کا تو ان کی جواب ہی نہ ہوتا تھا۔ مشاعرہ انہی کے ہاتھ رہا۔

بیخودؔ صاحب کے ہاتھ سے ہزار دانہ کبھی نہ چھوٹتا تھا۔ ہر وقت تسبیح گھومتی رہتی تھی۔ باتیں بھی کرتے جا رہے ہیں اور دانے بھی کھٹا کھٹ چل رہے ہیں۔ میں نے ایک دفعہ ان کے بالکل قریب بیٹھ کر کنکھیوں سے ان کے کھلے ہوئے منہ میں جھانک کر دیکھا، زبان تالو سے ٹکراتی اور نیچے آجاتی، اوپر جاتی پھر نیچے آجاتی اور یہی زیر و بم جاری رہتا۔ اس سے اندازہ ہوتا کہ وہ ''اللہ'' کا ورد کرتے تھے۔

بیخود صاحب اپنے وقت میں گورے پڑھایا کرتے تھے، اس لحاظ سے انگریزی اچھی خاصی جانتے ہوں گے، مگر ہم نے ان کے منہ سے کبھی کوئی انگریزی کا لفظ نہیں سنا۔ ان کے گورے پڑھانے کا ایک واقعہ یاد آیا۔ ایک دفعہ دو تین مہینے کے لیے انہیں دلّی سے کہیں باہر جانا پڑ گیا۔ شاگردوں سے انہوں نے چھٹی لے لی۔ ایک شاگرد کا امتحان قریب آ پہنچا تھا۔ اس نے اپنے کسی سیویلین دوست سے کہہ کر اس کے دفتر کے ایک کلرک کو لگا لیا۔ کلرک سے اس نے پوچھا۔ ''پڑھانے کا کیا لوگے؟'' اس نے اپنی دانست میں بہت بڑھا کر پندرہ روپے ماہوار بتائے۔ اس زمانے میں کلرک کو پچیس روپے تنخواہ ملتی تھی۔ درس و تدریس کا سلسلہ شروع ہو گیا اور تین مہینے وہ گورا فروٹ ہو گیا۔ اس نے ماسٹر کو پندرہ روپیہ مہینہ بھی دیا اور کچھ انعام بھی اور بولا۔ ''ہمارا پہلا منشی پچاس روپے لیتا تھا اور اس نے ہمیں ایک سال سے کچھ بھی نہیں پڑھایا۔'' بیخود صاحب جب لوٹ کر آئے تو دیکھا کہ شاگرد تو فارغ التحصیل ہو چکا ہے۔ پوچھا یہ کیا ماجرا ہے؟ معلوم ہوا کہ فلاں فلاں شخص نے کورس ختم کرا دیا۔ بیخود صاحب اسے کچھ جانتے تھے۔ اس کے پاس پہنچے اور بولے۔ ''میاں اب کیا لوگے؟ ان لوگوں کو کہیں اس طرح پڑھایا جاتا ہے؟ تمہیں اپنے شہر کے اس جراح کا قصہ یاد نہیں جو قصائی کے لڑکے کا علاج کیا کرتا تھا؟'' پوچھا۔ ''چگونہ بودہ است آں حکایت؟'' فرمایا۔ ''ایک قصائی کا لڑکا تھا۔ اس کے پاؤں میں ہڈی کی کرچ چبھ گئی اور زخم پک گیا۔ قصائی اسے لے کر جرّاح کے پاس پہنچا، جرّاح روزانہ اس کی مرہم پٹی کرتا اور معاوضہ میں آدھ سیر گوشت پاتا۔ یہ سلسلہ دنوں چلتا رہا۔ ایک دن جراح کسی وجہ سے دوکان پر نہ جا سکا۔ اس کے لڑکے نے تمام پھنسی پھوڑوں والوں کی دیکھ بھال کی۔ شام کو باپ نے پوچھا۔ ''سب کے کام سدھ ہو گئے تھے نا؟'' بیٹے نے کہا۔ ''کام تو سب کے ٹھیک ہو گئے، مگر وہ جو قصائی کا لڑکا آتا ہے اس کے زخم سے آج ہڈی کی کرچ نکلی، وہ میں نے نکال کر پھینک دی۔'' باپ نے کہا۔ ''ابے غضب کر دیا تو نے! اب کیا خاک کھائے گا! ابے وہی ہڈی تو آدھ سیر گوشت روز کھلا رہی تھی۔'' تو میاں ماسٹر صاحب! ان حرام زادوں کو اس طرح نہیں

پڑھایا جاتا جس طرح تم نے پڑھایا کہ تین مہینے میں سب کچھ اسے چٹا دیا۔ اگر ہم اس طرح پڑھائیں تو بس کھا کما چکے۔''

بیخود صاحب کو جن اتارنا بھی آتا تھا۔ اکثر لوگ انہیں بلا کر لے جاتے اور وہ جن اتار کر چلے آتے۔ ایک دفعہ ہم میں سے کسی نے کتب خانہ پر ان سے پوچھا۔ ''کیوں حضرت، کیا واقعی جن ہوتے ہیں؟'' اُستاد نے فرمایا۔ ''ہاں ہوتے ہیں، قرآن شریف میں سورۂ جن جو موجود ہے۔ جن کے علاوہ پلید روحیں بھی ہوتی ہیں۔ مثلاً چڑیل، بھتنی، بھتنا، بن سرا، سر کٹا، پچھل پیری، آسیب وغیرہ۔'' پوچھا۔ ''کیا یہ سب انسانوں کو ستاتے ہیں؟'' فرمایا۔ ''بے شک چڑیل کلیجہ چبا جاتی ہے۔ بھتنے لپٹ جاتے ہیں اور غن غنا کر بولتے ہیں، بن سرے کا سر نہیں ہوتا، سر کٹے کو دیکھو تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ابھی ابھی کسی نے اس کا سر کاٹ لیا ہے۔ پچھل پیری کے پنجے ایڑی کی طرف ہوتے ہیں۔ جنوں سے اگر مصافحہ کیا جائے تو ان کے انگوٹھے کی ہڈی نہیں ہوتی۔ بعض گھروں میں بد روحیں رہنے لگتی ہیں اور طرح طرح سے رہنے والوں کو ستاتی ہیں۔ یہ آسیب کہلاتا ہے۔'' ''تو اُستاد آپ جن کس طرح اُتارتے ہیں؟'' ''میاں جہاں لال مرچوں کی دھونی دی اور حرام زادی کی چوٹی میں بل دے کر دو طمانچے مارے اور جن بھاگا اور اگر طمانچوں سے نہ بھاگا تو جوتا سنبھالا۔'' اُستاد نے اس ترکیب سے بڑے بڑوں کے جن اتار دیئے تھے۔ سخت سے سخت ہسٹیریا فوراً رخصت ہو جاتا اور عشق وشق تو لحہ بھر میں غائب ہو جاتا تھا۔

اُستاد بیخود بڑے خوش مزاج اور غپ باز بھی تھے۔ ڈینگ مارنے میں بڑا کمال رکھتے تھے۔ یقیناً اس سے ان کا مقصد یہ نہیں تھا کہ دوسروں پر اپنا رعب گانٹھنا چاہتے تھے بلکہ اپنی پُر لطف باتوں سے دوسروں کے دل لبھاتے تھے۔ بات اس انداز سے کہتے تھے کہ بالکل سنجیدہ معلوم ہو۔ مثلاً کہنے لگے۔ امین الدین اور ان کے چند دوست جامع مسجد کی سیڑھیوں سے روزانہ سویرے دوڑ لگاتے تھے۔ ایک صاحب گھڑی لے کر کھڑے ہو جاتے، دوڑ لگانے والی ٹولی دروازے سے نکل کر فیروز شاہ کے کوٹلے، ببر کے تکیے، پرانے قلعے کے سامنے سے ہوتی ہوئی نظام الدین پہنچتی اور نیلی چھتری کا چکر کاٹ کر

پھر اسی راستے سے لوٹتی اور جامع مسجد کی سیڑھیوں پر واپس پہنچ کر دم لیتی۔ یہ کوئی سوا آٹھ ساڑھے آٹھ میل کا چکر ہوتا ہوگا اور اس میں انہیں بیالیس منٹ لگتے تھے۔ (یہاں تک تو بات سمجھ میں آتی تھی کہ ایسا ہوتا ہوگا۔ اب اُستاد کو زیٹ کی سوجھتی اور فرماتے) ایک دن امین الدین کو راستے میں پیاس لگ آئی۔ اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ ''تم چلو میں سامنے کنوئیں سے پانی پی کر آتا ہوں۔'' دوست آگے بڑھ گئے اور امین الدین نے کنوئیں کا رخ کیا۔ ڈول چرخی پر ڈال کر پانی کھینچا۔ خوب جی بھر کے پیا۔ اتنے میں عجیب طرح کی آواز برابر میں سنائی دی کہ ہمیں بھی پانی پلا دو، امین الدین نے جو مڑ کے دیکھا تو ایک آدمی کھڑا تھا، چم ننگا، مگر اس کا سر غائب تھا۔ کٹی ہوئی گردن پر تازہ تازہ خون تھا اور اس میں سے آواز نکل رہی تھی کہ ہمیں بھی پانی پلا دو۔ امین الدین نے کہا ''تمہارا منہ تو ہے ہی نہیں، پانی کہاں سے پلاؤں؟'' سر کٹے نے کہا۔ ''میرے نلخڑے میں ڈال دو۔'' چنانچہ امین نے ڈول بھر کر اس کے نلخڑے میں ڈال دیا۔ سر کٹے نے کہا۔ ''بڑی پیاس لگ رہی تھی، مگر ایک بات تو بتاؤ تم مجھ سے ڈرے نہیں؟'' امین الدین نے کہا۔ ''میاں میں سر والوں سے تو ڈرتا نہیں بن سروں سے بھلا کیا ڈروں گا؟'' گھر دیر سے پہنچے تو امین الدین سے ان کے بڑے بھائی نے پوچھا۔ ''ارے بھئی آج بڑی دیر کر دی۔ کہاں رہ گئے تھے؟'' امین الدین نے سر کٹے سے ملاقات کا واقعہ سنایا تو وہ ہنسنے لگے اور مذاق اڑانے لگے۔ امین الدین نے کہا۔ ''ان چیزوں کا مذاق نہیں اڑانا چاہیے۔ ورنہ وہ پریشان کرنے لگتی ہیں۔'' مگر بھائی نہ مانے اور مذاق اڑاتے رہے۔ امین الدین ناشتہ لینے بازار چلے گئے۔ وہاں سے جو بیوڑیاں اور دودھ لے کر واپس آئے تو دیکھا کہ بھائی الٹے لٹکے ہوئے ہیں۔ ہزار کوشش کرتے ہیں مگر سیدھے نہیں ہو سکتے۔ بھئی یہ تو خود ہماری آنکھوں کا دیکھا ہوا واقعہ ہے۔

بیخود صاحب کو اپنی شاعری پر بڑا ناز تھا۔ اُستاد داغ کے انتقال پر مرزا خورشید جاہ نے بیخود صاحب ہی کے جانشینی کی پگڑی باندھی تھی۔ فرماتے تھے کہ خود اُستاد نے بھی وصیت ''بیخودین'' کے حق میں کی تھی۔ یہ تثنیہ کا صیغہ بھی خوب تھا۔ خدا جانے وہ

دوسرے بیخود کون تھے۔ نواب سراج الدین احمد خان سائل دہلوی نے پھر یہ کیا کہ داغ کے جتنے مشہور شاگرد تھے سب کو اُستاد کی جانشینی کی سند دے دی۔ یہ ایک الگ قصہ ہے۔ خیر، جارج پنجم کی تخت نشینی اور دلّی میں دربار کرنے کے موقع پر بیخود صاحب نے ایک قصیدہ لکھ کر پیش کیا تھا۔ قصیدے کے آخر میں خاصی تعلّی بھی تھی۔ منشی محمد دین صاحب کو جب قصیدہ سنایا تو منشی جی نے کہا۔ آپ نے اپنا مرتبہ بھی بادشاہ کے لگ بھگ ہی کر لیا۔ بیخود صاحب نے فرمایا۔ ''اور کیا؟ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ میں ان سے کچھ کم ہوں؟ وہ بادشاہِ ملک ہیں تو میں بادشاہ سخن ہوں۔''

بیخود صاحب کو شکار کا بھی شوق تھا۔ شکار چھوٹا بھی کھیلتے تھے اور بڑا بھی۔ مہاراجہ گوالیار سے ان کے خصوصی تعلقات تھے۔ ایک دفعہ گوالیار گئے تو گوالیار کے اسٹیشن پر اترتے وقت انہیں خیال آیا کہ مہاراجہ کو اطلاع ہی نہیں دی کہ ہم آرہے ہیں اور نہ ان صاحب کو جن کے ہاں ٹھہرنا تھا۔ فرماتے تھے کہ اپنی بھول پر افسوس کرتا اسٹیشن سے باہر نکلا تو دیکھا کونجوں کی ایک قطار اڑتی چلی آرہی ہے۔ میں نے امین الدین سے کہا جلدی سے بندوق نکال کر دینا۔ انہوں نے بکس کھول کر بندوق نکالی اور میں نے کارتوس لگا کر اس طرح فائر کیا کہ ایک کونج تو میرے ہی قدموں میں آپڑی۔ دوسری ان صاحب کے گھر میں گری جن کے ہاں مجھے مہمان ہونا تھا اور تیسری راج محل میں عین مہاراج کے سامنے گری۔ میرے میزبان فوراً سمجھ گئے کہ یہ کونج بیخود صاحب ہی نے گرائی ہے اور جب ہم ان کے گھر پہنچے تو وہ کھانے کے ساتھ بھنی ہوئی کونج بھی رکھی ہوئی تھی، ادھر مہاراج نے حاضر باشوں سے کہا۔ ''لو بھئی بڑی عمر ہے، ابھی ان کا ذکر ہو رہا تھا کہ ان کے بغیر شکار کا کیا مزہ (کونج کی طرف اشارہ کر کے) لو دیکھو بیخود صاحب آپہنچے۔'' اور کھانے سے فارغ ہو کر تھوڑی دیر بعد ہم مہاراج کی خدمت میں جا پہنچے۔

اگلے دن شام کا پروگرام تھا۔ ہاتھیوں پر سوار ہو شیر کے شکار کو چلے۔ جنگل میں ہانکا کیا گیا۔ شیر نکل کر جب سامنے میدان میں آیا تو سب سے پہلی گولی مہاراج کی چلی مگر وہ اوچھی پڑی۔ شیر زخمی ہو کر جھلا گیا اور چھلانگ مار کر مہاراج کے ہاتھی سے جا

چمٹا۔ میں نے فوراً رفل اٹھا کر گولی چٹخائی اور شیر وہیں ڈھیر ہوگیا۔ مہاراج نے بہت واہ واہ کی اور بولے۔ "اب واپس چلنا چاہیے۔" میں نے کہا۔ "دُنیا میں ہر جانور کا جوڑا پیدا کیا گیا ہے۔ جب شیر ہے تو اس کی شیرنی بھی تو ضرور ہوگی۔ اسے بھی ساتھ لینا چاہیے۔" اب شیرنی کی تلاش ہوئی۔ سب نے اپنے اپنے ہاتھی مختلف سمتوں میں ڈال دیئے۔ ہمارا ہاتھی جنگل کے ایک گھنے حصے کی طرف چلا۔ کچھ دیر بعد ہاتھی ایک کھوہ پر پہنچ گیا اور شیرنی جھپٹ کر ہاتھی کے سامنے آئی اور اس کی ڈانٹ سے ہاتھی نے ڈر کر رخ پلٹ دیا۔ مگر اتنی دیر میں میری گولی چل چکی تھی اور شیرنی مر چکی تھی، اسے ہاتھی پر لاد کر ہم واپس چلنے کو ہوئے۔ فیر کی آواز سن کر مہاراج اور دوسرے شکاری ہم سے آ ملے۔ مہاراج نے کہا۔ "لو بھئی اب تو جوڑا تیار ہوگیا، اب واپس چلو۔" میں نے کہا۔ "اک ذرا ٹھیریے۔ میں ابھی آیا۔" یہ کہہ کر میں کھوہ میں گھس گیا، مجھے خیال تھا جب شیر اور شیرنی ہیں تو ان کے بچے بھی ضرور ہوں گے اور واقعی میں دو بچے کھوہ میں نظر آئے۔ انہیں اچکن کی جیبوں میں چھپا کر میں لے آیا اور میں نے کہا۔ "اب چلئے۔ مگر نہیں ذرا توقف کیجئے۔ شیر کا گوشت کھایا تو جاتا نہیں اور وہ شکار ہی کیا ہوا جس میں کھانے کو گوشت نہ ملے؟" مہاراج نے کہا۔ "ہاں، بات تو ٹھیک ہے۔" قضا عند اللہ، سامنے سے ایک کالا ہرن اینڈتا ہوا گزرا۔ گز گز بھر کے سینگ، میں نے دھائیں سے فائر کیا۔ اس نے ڈھیکلی کھائی مگر اُٹھ کر تراٹ ہوگیا۔ ہرن کو جاتا دیکھ کر امین الدین لپکے۔ ہرن نے قلانچیں بھرنی شروع کر دیں۔ مگر امین الدین نے دوڑ کر اسے جا دبایا اور بسم اللہ، اللہ اکبر کہہ کر اس کے گلے پر چھری پھیر دی۔ پھر اس کو گٹھری بنا دیا اور کندھے پر رکھ کر ہمارے پاس لے آئے۔ مہاراج نے ان کی پھرتی کی بہت تعریف کی۔ میں نے کہا۔ "اسے دوڑ لگانے کی مشق ہے۔ یہ تو زخمی ہرن تھا اگر امین الدین جی پر رکھ لے تو ویسے ہی دوڑ کر جنگل سے ہرن پکڑ لائے۔

بیخودؔ صاحب شاعر تو بڑے پُرگو تھے ہی، نثر بھی اچھی لکھتے تھے۔ مگر انہیں نثر لکھنے کی طرف زیادہ توجہ نہیں ہوئی۔ کوئی پینتیس سال ادھر کی بات ہے مولانا عبدالحلیم

شرر نے مروجہ پردہ کے خلاف تحریک شروع کی تھی۔ انہوں نے مضامین بھی لکھے تھے اور ایک ناول ''بدر النساء کی مصیبت'' بھی لکھا تھا، جس میں پردے کی خرابیاں بیان کی تھیں۔ اس پر ملک میں خاصی لے دے ہوئی تھی۔ مولانا شرر نے ہندوستان کے مشہور ادیبوں اور شاعروں کی حمایت حاصل کرنے کے لیے نجی خطوط لکھے تھے کہ اس میں ان کے ہم خیال بنیں اور اس سلسلے میں لکھنا شروع کریں۔ میں اس زمانے میں اسکول کی چھوٹی جماعتوں میں تھا اور ادب کے دردِسر سے آزاد۔ اتنا یاد ہے کہ ابا مجھے فارسی پڑھا رہے تھے کہ ان سے ملنے کوئی بزرگ آگئے۔ ابا نے ان سے کہا تھا کہ ''شرر کا ایسا ایسا خط آیا ہے اور میں نے انہیں لکھا ہے کہ سب سے پہلے تو اپنی بیوی کا پردہ اٹھاؤ۔ جب میں انہیں سرِ بازار بے پردہ دیکھ لوں گا تو تمہارا ساتھ دوں گا۔'' اُستاد بیخودؔ فرماتے تھے کہ ''میرے پاس بھی شرر کا اسی مضمون کا خط آیا تھا۔ میں نے اس کا تو کوئی جواب دیا نہیں، البتہ اس کے جواب میں ایک ناول ''ننگ و ناموس'' لکھ کر شائع کروادیا تھا۔ اس ناول میں پردے کی خوبیاں اور بے پردگی کی خرابیاں بتائی گئی تھیں۔ افسوس کہ وہ ناول ایک دفعہ چھپنے کے بعد دوبارہ نہیں چھپا۔ اس کا کچھ حصہ میں نے وصی اشرف صاحب کے رسالہ ''شاہ جہاں'' میں دیکھا تھا۔ پورا ناول دیکھنے کی آج تک ہوس ہے۔

اُستاد کے سینکڑوں شاگرد تھے۔ شیرینی لے کر شاگرد بناتے تھے۔ بس اس کے بعد شاگرد اصلاح لیتے رہتے تھے، دیتے دلاتے کچھ نہ تھے۔ دلّی کلاتھ مل والے لالہ شنکر لال ان کے شاگرد ہوئے تو مرتے دم تک برابر سلوک کرتے رہے۔ غالباً اُستاد کو ان کے ہاں سے ماہوار مشاہرہ بھی ملتا تھا۔ آنجہانی نہایت ناموزوں طبیعت رکھتے تھے مگر شعر کہنے کی انہیں ہڑک تھی، بے تکے اور ناموزوں مصرعے کہہ کر اُستاد کو بھیج دیتے۔ اُستاد انہیں کیا خاک بناتے، پوری غزل کہہ کر خود ہی دے دیتے۔ لالہ جی کو چند بار مشاعروں میں غزل پڑھتے سنا۔ شاید کبھی بھول کر کوئی مصرعہ بحر میں پڑھ دیتے ہوں تو پڑھ دیتے ہوں، ویسے معلوم ایسا ہوتا تھا کہ بڑی کوشش سے ہر مصرعہ ناموزوں پڑھ رہے ہیں۔ لالہ مرلی دھر لائل پور ملز والے بھی اُستاد ہی کے شاگرد تھے اور اُستاد کی بڑی عزت

وتکریم کرتے تھے۔ ہر سال لائل پور میں ایک شان دار مشاعرہ بڑے اہتمام سے کرتے۔ شاعروں کو دور دور سے بلاتے۔ بڑی بڑی رقمیں دیتے اور وقتِ رخصت سب کو اپنی مل کا بنا ہوا کپڑا وغیرہ بھی دیتے۔ اُستاد کو خود آکر دلّی سے لے جاتے اور ہتھیلی کے پھپھولے کی طرح رکھتے۔ لالہ شنکر لال کے بعد لالہ مرلی دھر اُستاد کے کفیل ہوگئے تھے۔ پاکستان بننے کے بعد لالہ مرلی دھر ہوائی جہاز کے سانحے میں کام آئے۔ ان کے بعد خدا جانے اُستاد پر کیا گزری۔ اب آخر آخر میں حکومت ہند نے ڈیڑھ سو روپے ماہوار کا وظیفہ مقرر کر دیا تھا۔ اس سے اُستاد کی کچھ اشک شوئی ہوگئی تھی۔

ہارڈنگ لائبریری میں فصیح الدین احمد مرحوم کے اہتمام سے ایک آل انڈیا مشاعرہ ہوا تھا۔ بیخودؔ صاحب کو بھی فصیح الدین احمد کسی نہ کسی طرح رضامند کر کے لے گئے۔ صدارت سر رضا علی کر رہے تھے۔ یہ بڑے سلجھے ہوئے مزاج کے بزرگ تھے۔ ادب و شعر کا عمدہ ذوق رکھتے تھے، بڑے حاضر جواب اور فقرہ طراز تھے۔ مشاعرے کو آخر تک سلیقہ مندی سے چلاتے اور کسی کو شکایت کا موقع نہ دیتے۔ ہمارے شاعروں میں بزرگی و اُستادی کا یہ تصور اپنایا ہوا ہے کہ جو جتنا بعد میں پڑھے گا وہ اتنا ہی بزرگ و اُستاد سمجھا جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر شعراء کی ترتیب اور مقدم مؤخر پر بگاڑ پیدا ہو جاتا ہے۔ آج کل بھی اس کا خاص طور پر لحاظ رکھا جاتا ہے کہ مشاعرہ نو آموزوں سے شروع کر کے اُستادوں پر ختم کیا جائے۔ مگر سر رضا علی کی صدارت میں کسی کو دم مارنے کی مجال نہ ہوتی تھی، جس کا نام انہوں نے پکار دیا وہ بے چون و چرا اسٹیج پر پہنچ جاتا تھا۔ ہارڈنگ لائبریری کے مشاعرے میں جب سارے شاعر پڑھ چکے تو آخر میں دو بزرگ بچے رہ گئے۔ ایک حضرت بیخودؔ دہلوی اور دوسرے حضرت ثاقبؔ لکھنوی۔ دونوں ایک سے ایک بڈھا اور پُرانا دُم گلا۔ سب کو یہ اندیشہ کہ دیکھئے کہیں آخر میں بدمزگی نہ ہو جائے۔ مگر سر رضا علی کا تدبر آڑے آیا۔ انہوں نے کرسیٔ صدارت فوراً چھوڑ دی اور کہا۔ ''اب میرے دو محترم بزرگ باقی رہ گئے ہیں۔ جو صاحب چاہیں گے پڑھیں گے۔'' اس پر بیخودؔ صاحب نے فرمایا۔ ''پہلے میں پڑھوں گا۔'' اور ثاقب صاحب نے فرمایا۔ ''پہلے میں

پڑھوں گا۔'' ایک نے کہا۔ ''نہیں بھائی، آپ مجھے اجازت دیجئے۔'' دوسرے نے کہا۔ ''یہ نہیں ہوسکتا، آپ مجھے اجازت دیجئے۔'' اب یہ انہیں پکڑ رہے ہیں اور وہ انہیں پکڑ رہے ہیں کہ ''نہیں پہلے میں۔'' مشاعرے میں ہنسی پڑ گئی۔ قصہ مختصر بیخؔود صاحب نے فرمایا۔ ''آپ ہمارے مہمان ہیں اس لیے پہلے میں پڑھوں گا، میرے بعد آپ پڑھیں گے۔'' یہ کہہ کر پڑھنے بیٹھ گئے۔

حج کرنے کے بعد بیخؔود صاحب کا مزاج بہت بدل گیا تھا۔ ان کی تنک مزاجی و آشفتہ سری تقریباً ختم ہی ہوگئی تھی۔ ورنہ یہی بیخؔود صاحب تھے کہ ناک پر مکھی تک بیٹھنے نہ دیتے تھے۔ نواب سراج الدین سائؔل کو اگر یہ زعم تھا کہ میں داغؔ کا داماد ہوں تو انہیں اس کا گھمنڈ تھا کہ میں اُستاد کا چہیتا شاگرد ہوں اور اُستاد نے اپنے شاگردوں کے چاروں رجسٹر میرے سپرد کر رکھے تھے۔ سائؔل صاحب سے ان کی کبھی نہ بنی۔ ادبدا کر انہیں نیچا دکھانا چاہتے تھے۔ دلّی کے مشاعروں میں دونوں اُستادوں کے شاگردوں میں آئے دن جھگڑے ہوتے اور مار پیٹ تک نوبت پہنچتی۔ اس بے ہودگی کی وجہ سے صرف ایک رخے مشاعرے رہ گئے تھے اور بھلے آدمیوں نے مشاعروں میں جانا چھوڑ دیا تھا۔ مگر یہ عجیب طرح کی مخاصمت تھی۔ شاعری سے قطعِ نظر دونوں اُستادوں میں خلوص و محبت کے تعلقات تھے۔ نواب سائؔل نے اپنے بیٹے کو تاکید کر رکھی تھی کہ بیخؔود صاحب سے اصلاح لیا کرو۔

بیخؔود صاحب نے دیوانِ غالبؔ کی شرح بھی لکھی تھی۔ اشعار کا مفہوم بڑی خوبی سے بیان کرتے تھے۔ ایک دفعہ ہم نے ان سے پوچھا۔ ''اُستاد، آپ نے تو غالبؔ کو دیکھا ہوگا؟'' فرمایا۔ ''ہاں دیکھا تھا میری عمر اس وقت پانچ سال کی تھی۔ ابا حضرت کے ساتھ ان کے ہاں جایا کرتا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ پہلی دفعہ جب ان کے ہاں گیا تو شام کا وقت تھا۔ ان کے آگے بلوری صراحی اور گلاس رکھا تھا اور طشتری میں تلے ہوئے بادام اور پستے تھے۔ چسکی لگاتے جاتے اور دو دو چار چار دانوں کے **ٹھنگیر** کرتے جاتے۔ ابا حضرت سے ادھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ اتنے میں مغرب کی اذان ہوئی تو ابا

حضرت نماز پڑھنے کھڑے ہوگئے۔ میں بچپن میں بہت شریر تھا۔ مگر نئی جگہ ہونے کی وجہ سے خاموش بیٹھا تھا۔ دادا غالبؔ مجھ سے مخاطب ہو کر بولے۔ ''یار چہ لو کچھ کھاؤ۔'' میں نے تھوڑے سے بادام اور پستے اٹھا لیے۔ کچھ ہنسی مذاق کی باتیں کرتے رہے پھر ایک دم سے بولے۔ ''یار چہ، تم ہمارے سر پر ایک دھول تو کس کر لگاؤ۔'' یہ کہہ کر اپنا گھٹا ہوا سر میرے آگے کر دیا۔ مجھے اتنا شعور کب تھا۔ دھول رسید کرنے کے لیے جھٹ کھڑا ہو گیا۔ اتنے ہی میں ابا حضرت نے سلام پھیر کر ''ہوں ہوں'' کہا اور مجھے گھور کر دیکھا۔ میں پھر دبک کر بیٹھ گیا۔ ابا حضرت نے کہا۔ ''مرزا صاحب قبلہ! اللہ نے بڑی خیر کی۔ مجھے تو منہ دکھانے کو جگہ نہ رہتی۔ یہ بڑا دنگائی ہے۔ اس کا کیا ہے۔ یہ تو مار بیٹھتا۔ مگر میں تو کہیں کا نہ رہتا۔''

ہمیں اگر کوئی پرانا لفظ یا محاورہ پوچھنا ہوتا تو بیخودؔ صاحب سے پوچھ لیتے۔ ان کے سوا دلی میں رہ بھی کون گیا تھا؟ تمام بڑے بوڑھے دیکھتے ہی دیکھتے اٹھ گئے تھے۔ کتب خانہ پر ایک دفعہ خود اُستاد ہی کے ایک مقطع پر بحث چل نکلی۔ سب نے اس کی تاویلیں طرح طرح سے کیں مگر بات کسی کی نہ بنی۔ آخر میں یہ طے ہوا کہ خود اُستاد ہی سے اس کا مطلب پوچھا جائے۔ شام کو جب اُستاد آئے تو ان سے مقطع رجوع کیا گیا۔ فرمایا۔ ''یہ شعر یوں سمجھ میں نہیں آئے گا، اس میں ایک تلمیح ہے۔'' مقطع یہ تھا......

بیخودؔ کے لب بھی تر نہ ہوئے وقت مے کشی
آلودۂ شراب گریبان ہی رہا

فرمانے لگے۔ ''یہ شعر ایک واقعہ سے متعلق ہے۔ میں فلاں ریاست میں ملازم تھا۔ رئیس کی محفلِ خاص روزانہ رات کو جمتی تھی۔ جب دورِ شراب چلتا تو رئیس کی منظورِ نظر طوائف جام بھر بھر کر مقربین کو پیش کرتی۔ انکار کی مجال کسی کو نہ ہوتی۔ میں بھی اس سے جام لے لیتا اور منہ تک لے جا کر چپکے سے اپنے گریبان میں اُلٹ دیتا۔ اب یہ شعر تمہاری سمجھ میں آجائے گا۔

بڑے آدمیوں کی بڑی کمزوریاں۔ اُستاد ہر سوال کا جواب ضرور دیا کرتے

تھے۔ لاعلمی کا اظہار کرنا غالباً کسرِ شان سمجھتے تھے اور جب کہیں مجبور ہو جاتے تو ناراض ہو کر بات کو ٹال جاتے۔ ایک زمانے میں سہراب مودی کو ''غالبؔ'' فلم بنانے کا خیال ہوا۔ مکالمے اور سینار یو سعادت حسن منٹو نے لکھا تھا۔ اس سلسلے میں وہ مجھے بھی بمبئی بلوانا چاہتے تھے۔ مگر دلی والے سے دلی کب چھوٹتی تھی۔ میں نے انکار کر دیا۔ اس کے بعد ان کے ایک ڈائریکٹر مسٹر نندا مجھ سے ملنے دلی آئے۔ سو سال پہلے کی تہذیب و معاشرت کے متعلق انہیں کچھ باتیں معلوم کرنی تھیں۔ مجھے ان کا بہت کم علم تھا۔ میں انہیں لے کر بیخودؔ صاحب کے گھر مٹیا محل پہنچا۔ مردانہ بیٹھک میں چاندنی کا فرش تھا۔ ہمیں ایک صاحب نے بیٹھنے کو کہا۔ تھوڑی دیر میں بیخودؔ صاحب تشریف لائے تو میں نے نندا صاحب کا تعارف کرایا۔ ملاقات کی غایت سن کر اُستاد کچھ خوش نہیں ہوئے۔ اپرا کر بولے۔ ''پوچھیے کیا پوچھنا ہے؟'' نندا صاحب نے کہا۔ ''مجھے یہ معلوم کرنا ہے کہ اس زمانے کی جو سواریاں تھیں ان کی کیا کیا شکلیں تھیں۔ مثلاً تختِ رواں، ہوا دار، تام جھام، پالکی، نالکی۔'' اُستاد چیخ کر بولے۔ ''پالکی پالکی ہوتی ہے نالکی نالکی، پالکی نالکی کیسے ہو سکتی ہے اور نالکی پالکی کیسے ہو سکتی ہے؟'' میں نے دیکھا کہ اُستاد کا پارہ چڑھ گیا، یہاں دال نہ گلے گی۔ میں نے نندا صاحب سے کہا۔ ''آپ ایسا کیجئے کہ جو جو باتیں معلوم کرنی ہوں ان کی فہرست بنا لیجئے۔ پھر کسی وقت حضرت کو زحمت دیجئے۔'' زحمت دینے کی پھر نوبت نہ آئی۔

اُستاد کو کبوتر اُڑانے کا بہت شوق تھا۔ جال اور کابکیں اوپر چھت پر رہتی تھیں۔ چھتری چھپکا سب کچھ موجود تھا۔ اپنی ٹکڑی اڑاتے اور دوسرے کبوتر بازوں کی ٹکڑیوں سے لڑاتے۔ اس شغل میں اگر کوئی ملنے والا آ کر حارج ہو تو مزاج برہم ہو جاتا۔ وہیں سے گالیاں بڑبڑاتے اُترتے اور بڑے استکراہ سے ملاقات فرماتے۔ ایک مہربان اپنے صاحبزادے کو لے کر عین اس وقت پہنچے جب اُستاد کی جان کبوتروں میں لڑی ہوئی تھی۔ بہت مکدر ہوئے۔ بُرا بھلا کہتے نیچے آئے۔ مہربان نے مٹھائی کی ٹوکری پیش کی اور بولے۔ ''یہ میرا لڑکا ہے، شعر کہتا ہے، اسے شاگردی میں قبول فرما لیجئے۔'' ٹوکری تو اُستاد کا پوتا لے کر فوراً اندر چلا گیا اور اُستاد نے فرمایا۔ ''اپنے کچھ شعر سناؤ۔'' وہ شامت کا مارا

نہ جانے کس سے لکھواتا تھا، لگا ناموزوں شعر سنانے۔ بیخوؔد صاحب ایک دم سے بکھر گئے۔ ''نکل میرے گھر سے۔ باہر نکل۔'' اور گالیوں کا سیلاب امنڈ پڑا۔ کھڑے کھڑے اسے اور مہربان کو گھر سے نکالا اور کنڈی لگا اوپر جا کر کبوتر اڑانے لگے۔

شعر گوئی اور زبان سیکھنے کے شوق میں حیدر آباد جا کر چھ مہینے اُستاد کے پاس رہے۔ فرماتے تھے۔ ''مگر کبھی پان کا ٹکڑا تک ان کا نہ کھایا۔ ان کے دیوانوں کی ورق گردانی کرتا اور بغور ایک ایک شعر کو دیکھتا۔ اس مطالعے میں مجھے یہ معلوم ہوا کہ ہر دو چار غزلوں کے بعد ایسے شعر آجاتے جو سمجھ میں نہ آتے تھے۔ ایک دن میں نے اُستاد سے کہہ ہی دیا کہ میری فہم ناقص میں یہ بات نہیں آتی کہ یہ کیا ماجرا ہے۔ ایسا تو ہو نہیں سکتا کہ ان اشعار کے معنیٰ ہی نہ ہوں، ہو نہ ہو یہ میری سمجھ کا قصور ہے۔'' اُستاد نے فرمایا۔ ''نہیں، تم ٹھیک سمجھے۔ میری عادت ہے، کبھی کبھی میں جان بوجھ کر مہمل شعر کہتا ہوں۔'' اس وقت تو بات آئی گئی ہوئی۔ مگر ان اشعار کی قدر و قیمت اب معلوم ہو رہی ہے۔ جب ہم قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھے ہیں۔

پوچھا۔ ''اُستاد وہ کون سے شعر ہیں؟''

بولے۔ ''یاد نہیں۔''

فرماتے تھے کہ حکیم واصل خاں نے اُستاد داغؔ سے پوچھا۔ ''آپ کے بعد آپ کی زبان لکھنے والا بھی کوئی باقی رہے گا؟'' اُستاد نے فرمایا۔ ''بیخوؔد۔ خدا کا شکر ادا کرو کہ تمہاری زبان گھر کے گھر میں رہی۔''

ایک دن فرمانے لگے۔ ''اُستاد کا مطلع ہے......

وہ مزے عشق میں آئے ہیں کہ جی جانتا ہے
رنج بھی ایسے اُٹھائے ہیں کہ جی جانتا ہے

مگر میرا مطلع اس سے بڑھ گیا۔''

کہا۔ ''اُستاد اپنا مطلع سنایئے۔''

فرمایا۔ ''یاد نہیں۔''

اُستاد بیخود بہت جیے، بہت جیے۔ ان کے والد سو سے اوپر ہو کر گئے تھے۔ اُستاد سنچری پوری نہ کر سکے۔ ایک پیری و صد عیب، آخر عمر میں طرح طرح کی بیماریوں نے انہیں گھیر لیا تھا۔ یونانی علاج کرتے تھے۔ مرنے سے کچھ دن پہلے عطار کے ہاں سے نسخہ بندھوا کر لا رہے تھے، راستے میں دہی بڑے والا نظر آ گیا۔ مرض ورض سب بھول گئے۔ آخر دلّی والے تھے، چٹور پن نے زور مارا اور خوب ڈٹ کے دہی بڑے کھائے۔ اس وقت تو مزہ آ گیا۔ مگر بعد میں اس کی کسر نکلی۔ ضعفِ معدہ کے مریض، اسہال شروع ہو گئے۔ بھلا جو شخص ساری عمر اچھے سے اچھے کھانوں کا شوقین رہا ہو وہ ترکِ غذا کیسے کر لے؟ بد پرہیزیاں ہوتی رہیں اور امراض بڑھتے رہے، یہاں تک کہ موت نے آ کر سلام کیا۔ اُستاد تو اس زندگی سے بیزار ہی تھے، ہنسی خوشی رخصت ہو گئے۔ جب تک جیے اوروں کو ہنساتے رہے، جب مرے تو صف ماتم بچھ گئی۔ ایسے زندہ دل انسان بھلا اب کاہے کو پیدا ہوں گے۔ اچھے لوگ تھے، اچھی گزار گئے۔ اپنے ساتھ دلّی کا نام بھی روشن کر گئے۔ اب نہ ایسا شاعر پیدا ہوگا اور نہ ایسا انسان......

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

OO

شاہد احمد دہلوی

مغل بادشاہوں کا آفتابِ جلال غروب ہو رہا تھا۔ دلّی کے لال قلعہ میں مغلوں کی آخری شمع جھلملا رہی تھی۔ بادشاہ کی حیثیت شاہ شطرنج سے زیادہ نہ تھی۔ فرنگیوں سے ایک لاکھ روپیہ ماہانہ پنشن ملتی تھی، وہ بھی اس شرط پر کہ ان کے بعد تاج وتخت کا سلسلہ ختم ہو جائے گا اور فرنگیوں کا اقتدار قائم ہو جائے گا۔ مگر ہاتھی مرے پیچھے بھی سوا لاکھ من کا ہوتا ہے۔ اس مردہ حالت میں بھی تیموری جاہ و جلال کا وقار بہت کچھ باقی تھا۔ لال حویلی تہذیب وشائستگی کی علامت سمجھی جاتی تھی اور شہر بہت کچھ اجڑ جانے پر بھی علوم وفنون کا گہوارہ بنا ہوا تھا۔ بھانت بھانت سے لوگ کھنچے چلے آتے اور اپنی مرادیں پاتے۔ شہر آبادی کے یہی شب و روز تھے کہ سات سال کا ایک لڑکا تحصیل علم کے شوق میں بجنور سے دلّی آیا اور پنجابی کٹرے کی مسجد کے طالب علموں میں شامل ہوگیا۔ دوسرے طالب علموں کی طرح یہ لڑکا بھی محلے کے گھروں سے روٹی مانگ لاتا اور روکھی سوکھی جو بھی میسر آتی خدا کا شکر ادا کر کے کھا لیتا۔ رات کو کڑکڑاتے جاڑوں میں مسجد کی صفوں میں لپٹ کر سو جاتا۔ اگر کسی دن جلدی آنکھ نہ کھلتی تو مسجد کا ملّا ایک لات رسید کرتا اور لڑکھڑاتا ہوا چلا جاتا اور ساتھ کے ساتھ صف بھی بچھ جاتی۔ دن بھر اور رات گئے تک اس لڑکے کو بس پڑھنے سے کام تھا۔ علم کی لگن میں صبر وشکر سے تمام سختیوں کو جھیلتا رہا۔ غریب کا بچہ اور کر بھی کیا سکتا تھا؟ شوق اور ذہانت کے پَر اسے اُڑائے لیے چلے گئے۔ مکتب سے نکل کر دلّی کالج میں پہنچا اور یہاں سے سند لینے کے بعد ترقی کی راہیں اس

پر کھل گئیں۔ تھوڑے ہی عرصے میں ڈپٹی کلکٹری کے عہدے پر جا پہنچا۔ اس زمانے میں یہ آخری بڑا عہدہ تھا جو فرنگی راج میں کسی دیسی آدمی کو مل سکتا تھا۔ اتنے ہی میں سر سالار جنگ نے انہیں جانچ کر حیدر آباد بلا لیا اور یہ صاحب اپنی اعلیٰ کارکردگی کے باعث اونچے سے اونچے مرتبوں تک پہنچے۔ اللہ نے عزت بھی دی اور بے تحاشہ دولت بھی۔ آپ سمجھے بھی یہ کون بزرگ تھے؟ یہ تھے ڈپٹی نذیر، جن کی کتابیں اور ترجمۂ قرآن گھر گھر پڑھا جاتا ہے۔

ان ڈپٹی نذیر احمد کے اکلوتے بیٹے تھے بشیر الدین احمد، جن کی ابتدائی تعلیم خود شفیق باپ کے سایہ میں ہوئی۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد میاں بشیر بغرض ملازمت دکن چلے گئے اور اول تعلقداری سے وظیفہ یاب ہوئے۔ یہ بھی اپنے نامی گرامی والد کی طرح بہت بڑے مصنف اور مورخ تھے۔ ادبی اور اخلاقی کتابوں کے علاوہ دو ضخیم جلدوں میں تاریخِ بیجا پور اور تین بڑی جلدوں میں تاریخ دہلی لکھی۔ یہ ان کے دو بڑے تحقیقی کارنامے ہیں۔ جب تک زندہ رہے ان کے ہاتھ سے بھی قلم نہیں چھوٹا۔

میاں بشیر کی شادی سترہ اٹھارہ سال کی عمر میں دلّی کے ایک معزز خاندان میں ہوگئی تھی۔ اللہ کا دیا ہوا سب کچھ موجود تھا مگر پندرہ سال تک کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ میاں بیوی تو اس محرومی پر بھی مطمئن و قانع تھے مگر خاندان میں مکھو پھر گئی اور منہ جڑنے لگے۔ پھر مولوی نذیر احمد کے کان میں بھی صدائیں پڑنے لگیں۔ پہلی بیوی کی موجودگی میں عقدِ ثانی کے وہ خلاف تھے مگر جب چاروں طرف سے ان پر عزیزوں کا دباؤ پڑا اور انہوں نے خاندان کا چراغ گل ہوتے دیکھا تو وہ بھی پسیج گئے۔ بیٹے اور بہو میں بڑا پیار دلار تھا۔ بیٹے سے کیسے کہیں کہ اپنی چہیتی بیوی پر سوکن لے آ؟ میاں بشیر کی والدہ سے کہا کہ تم سمجھاؤ۔ انہوں نے بیٹے کو چمکار پچکار کر رضا مند کیا اور غریب مگر شریف خاندان کی ایک سیدانی سے چپ چپاتے ان کا نکاح پڑھوا دیا۔ اللہ کی شان کہ ان سیدانی سے بھی دس سال تک اولاد نہیں ہوئی۔ بڑی دلہن کی بن آئی اور انہوں نے طعنوں تشنوں سے جان ضیق میں کردی۔ جب معاملہ تنت پر پہنچ گیا تو چھوٹی دلہن کی

کوکھ ہری ہوئی۔ خاندان کے سوکھے دھانوں میں پانی پڑ گیا۔ اللہ نے چاند سا بیٹا دیا۔ دنوں اس کی خوشی منائی گئی۔ ڈپٹی صاحب نے پوتے کا نام منذر احمد رکھا۔ اس کے بعد تو خدا کی دین ایسی ہوئی کہ یکے بعد دیگرے تین لڑکے ہوئے۔ منجھلے کا نام مبشر احمد اور سنجھلے کا نام شاہد احمد رکھا گیا۔

اب ان سنجھلے صاحبزادے میاں شاہد احمد کی مختصر سی سرگزشت حیات سنئے اور خود ان ہی کی زبانی سنیے۔

میں ۲۲ مئی ۱۹۰۶ کو دلّی میں، اپنے آبائی مکان میں پیدا ہوا۔ چار سال کی عمر سے پہلے کی باتوں کا مجھے ہوش نہیں ہے۔ ایک خواب کا سا خیال ہے کہ ابا جب حیدر آباد سے دلّی آتے تو سب سے پہلے ہمیں دادا ابا کی خدمت میں لے جاتے۔ ابا دادا ابا سے بغلگیر ہو کر رونے لگتے اور ہم حیران ہو کر انہیں تکتے رہتے۔ پھر دادا ابا ہمیں ایک ایک اشرفی دیتے اور چپکے سے وہاں سے کھسک لیتے۔ بس اور کچھ یاد نہیں ہے۔

جب میں چھ سال کا ہوا تو چھوٹی بہن حیدر آباد میں پیدا ہوئی۔ ان ہی دنوں ابا کو کسی ضروری کام سے دلّی جانا پڑا۔ ادھر ابا دلّی روانہ ہوئے، اُدھر اماں کی طبیعت ایکا ایکی خراب ہوئی۔ اس کی اطلاع فوراً بذریعہ تار ابا کو دی گئی۔ وہ الٹے قدموں دلّی سے لوٹے۔ مگر جب حیدر آباد پہنچے تو اماں کا جنازہ صحن میں رکھا پایا۔ اچھا بھلا چھوڑ کر گئے تھے، یہ کیا ہوا؟ چکرا کر گرنے والے ہی تھے کہ کسی نے لپک کر انہیں تھام لیا۔ ابا بڑے صبر وضبط کے آدمی تھے، آنسو پیتے رہے۔ اماں کو سپردِ خاک کرنے کے بعد آنسوؤں کا سیلاب ضبط کے بند کو بہا لے گیا اور وہ ہم بچوں کو گلے لگا کر روتے رہے۔ اس سے ان کے دل کی بھڑاس نکل گئی، مگر ساری عمر جب بھی انہیں اماں کا خیال آجاتا تھا، رونے لگتے تھے۔

اماں کی کمی پوری کرنے کے لیے ابا نے ہم پر یورپین اور اینگلو انڈین گورنسیں رکھیں اور ہمیں اچھے سے اچھے کانونٹ اسکولوں میں تعلیم دلائی۔ گھر پر بھی ماسٹر پڑھانے آتے اور ابا خود بھی ہمیں انگریزی اور اُردو پڑھاتے تھے۔ پھر ایک دفعہ ابا دلّی آئے تو مطبع مجتبائی میں مولوی عبد الاحد کے ہاں ان کی ملاقات ڈاکٹر ضیاء الدین سے

ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب نے انہیں مشورہ دیا کہ بچوں کو علی گڑھ میں داخل کر دیا جائے۔ ۱۹۱۶ء میں ہم تینوں بھائیوں کو ایم اے او اسکول علی گڑھ میں داخل کر دیا گیا۔ اس زمانے میں بچوں کا بورڈنگ ظہور وارڈ تھا۔ تقریباً تین سال ہم نے علی گڑھ میں پڑھا۔ اس کے بعد عدم تعاون کی تحریک نے زور پکڑا اور مولانا محمد علی نے جامعہ ملیہ، علی گڑھ میں قائم کیا۔ ابا نے ہمیں علی گڑھ سے اُٹھا لیا۔ وہ حیدر آباد سے پنشن لے کر دلّی آ گئے تھے۔ ہمیں عربک اسکول میں داخل کر دیا۔

۱۹۲۳ء میں دلّی سے میٹرک پاس کرنے کے بعد میں نے لاہور جا کر ایف سی کالج میں داخلہ لے لیا۔ وہاں سے ایف ایس سی (میڈیکل) پاس کرنے کے بعد میڈیکل کالج میں داخل ہوا۔ سڑی ہوئی لاشوں پر کام کرنے سے طبیعت اس قدر مکدر اور بے زار ہوئی کہ ایک سال میں ہی وہاں سے بھاگ لیا۔ دلّی آ کر میں نے انگریزی ادبیات میں بی۔اے (آنرز) کی ڈگری لی۔ اس سے ایک سال پہلے ابا کا انتقال فالج میں ہو گیا تھا۔ وہ ہمارے لیے پچاس پچاس ہزار روپے نقد اور دو دو سو روپے ماہانہ کی جائداد چھوڑ گئے تھے۔ اسی لیے کمانے دھمانے کی ہمیں کوئی فکر نہیں تھی۔ میں نے فارسی ادبیات میں ایم۔اے میں داخلہ لے لیا۔ یہ ۱۹۲۹ء کا ذکر ہے۔ میرے ایک رشتے دار کے بھانجے ہیں انصار ناصری، جو میر ناصر علی صاحب ''صلائے عام'' کے پوتے ہیں۔ انہوں نے مجھے مشورہ دیا کہ دلّی سے ایک عمدہ ادبی ماہنامہ جاری کیا جائے۔ اپنی سمجھ میں بھی یہ بات آ گئی اور بغیر کسی تجربے یا مشورے کے جنوری ۱۹۳۰ میں ماہنامہ ساقی جاری کر دیا۔ کوئی چار پانچ سال کی الٹا پلٹی میں اس پرچے نے اپنی جگہ تو بنا لی مگر میرے ماموں نے جو اس پرچے کا اہتمام کرتے تھے مجھے بتایا کہ اس پرچے پر پچیس تیس ہزار روپیہ ضائع ہو چکا ہے اور اگر یہی روش رہی تو باقی روپیہ بھی یوں ہی نکل جائے گا۔ اِدھر بھائیوں نے بھی لعنت ملامت کی تو آنکھیں کھلیں۔ پرچے کا انتظام خود اپنے ہاتھ میں لیا اور ہمعصر ادیبوں کی کتابیں چھاپنی شروع کیں۔ ڈوبتا ہوا کاروبار تر ہو گیا اور ۱۹۴۷ء میں ساقی بک ڈپو کی مالی حیثیت دو لاکھ کی تھی اور پندرہ ہزار روپیہ ادیبوں اور شاعروں کی

طرف بطور پیشگی باقی تھا۔ محاسبۂ نفس بڑی مشکل چیز ہے اور میرے لیے خودستائی اس سے بھی زیادہ مشکل۔ لہٰذا ایک کرم فرما کے دو خطوں کے اقتباسات درج کرتا ہوں تاکہ آپ کو میرے کچھ وہ حالات بھی معلوم ہو جائیں جنہیں میں خود بیان نہیں کرسکتا۔ یہ خطوط راجہ مہدی علی خاں کے ہیں اور حال ہی میں موصول ہوئے ہیں۔

''ہزاروں سال پہلے، جب آپ دلّی سے کھو گئے تھے اور آپ کی زندگی کے بارے میں خدانخواستہ بُری بُری افواہیں پھیل رہی تھیں۔ یہاں کے بہت سے دوست آپ کے لیے بے حد متفکر اور دست بدُعا تھے۔ بہت عرصے بعد ایک دن معلوم ہو گیا کہ آپ بہ فضلِ خدا خیریت سے ہیں اور پاکستان میں ہیں۔ اس کے بعد میں مست اور بے فکر ہو کر فلمی دُنیا کی مصروفیات میں بہت بُری طرح کھو گیا اور اس وقت بھی کھویا ہوا تھا جب مجھے عزیز دوست منٹو کی موت کی خبر موصول ہوئی۔ مجھے بے حد شرمندگی تھی کہ اس دوران میں نے منٹو کو بھی صرف دو ایک خط لکھے اور وہ بھی اس کے خطوں کے جواب میں۔ سالہا سال گزر گئے لیکن میں نے پاکستان یا ہندوستان کے کسی شاعر یا ادیب دوست کو کوئی خط نہ لکھا۔ آج سے تقریباً ڈیڑھ سال قبل ''بسترِ مرگ'' پر میری ادبی زندگی کا دوبارہ آغاز ہوا۔ مجھے کچھ معلوم نہ تھا کہ پچھلے پرچوں میں سے کون سے زندہ ہیں کون سے مر گئے۔ اسی جستجو اور تلاش کے سلسلے میں معلوم ہوا کہ کراچی سے ''ساقی'' شائع ہوتا ہے۔ میرا حافظہ ٹھیک نہیں رہا۔ میرا قیاس ہے کہ ایک خط میں نے آپ کو بھی لکھا تھا۔ اس کے بعد میں پھر بھول گیا۔ ایک مرتبہ ایڈیٹر نقش کو بھی خط لکھا۔ نقش میرے نام جاری ہو گیا، شاید آپ ہی نے جاری کرایا ہو۔ یہ پرچہ اب بھی باقاعدگی سے میرے نام موصول ہوتا ہے اور اپنی عالی ظرفی اور میری کم ظرفی کا احساس مجھے دلاتا رہتا ہے۔ ایک دن نقش میں نقوش کے سلسلے میں آپ کا مضمون پڑھا تو حافظہ مجھے کئی سال پیچھے کی طرف لے گیا۔ دلّی کی دوسری پرانی یادیں تازہ ہونے کے علاوہ وہ گھڑیاں آنکھوں میں پھر گئیں جو کبھی آپ کے پاس گزری تھیں اور یکا یک خیال آ گیا کہ جس طرح بعض دوسرے شاعروں اور ادیبوں کے آپ کام آیا کرتے تھے، میری زندگی کا رخ بدلنے میں بھی خدا

کے بعد آپ ہی کا ہاتھ تھا۔ مجھے فلم انڈسٹری میں داخلہ آپ کے صرف ایک خط سے مل گیا، جو آپ نے میرے لیے منٹو مرحوم کو لکھا تھا۔ اسی قسم کے ایک سفارشی خط کی درخواست میں نے اپنے ماموں جناب حامد علی خاں صاحب سے بھی کی تھی، اگرچہ انہیں ریڈیو میں لانے والا میں ہی تھا، مگر انہوں نے مجھے سفارشی خط دینے سے انکار کر دیا تھا۔ آپ ہی میرے کام آئے۔ آج میں جو کچھ ہوں وہ سب کچھ آپ کے طفیل سے حاصل کیا ہے۔ آپ کے اس احسان کا بدلہ میں کبھی نہیں چکا سکتا۔''

''اتنے عرصے کے بعد آپ کا گرامی نامہ موصول ہو کر بے حد مسرت کا باعث ہوا، لیکن جب آپ کے اور ساقی کے حالات معلوم ہوئے تو میری یہ تمام خوشی رنج و غم میں تبدل ہوگئی۔ بہت دیر تک بلکہ بہت دنوں تک میں پریشان و مغموم رہا اور اس وقت بھی ہوں۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب بھی کوئی ادیب کسی بہت بڑی مالی پریشانی میں مبتلا ہوا، بھاگا ہوا آپ کے دروازے پر پہنچا اور ہنستا ہوا واپس آگیا کہ میں اپنا مسودہ شاہد صاحب کو دے کر پیسے لے آیا ہوں۔ شاہد احمد کا در ایک ایسا در تھا جس سے ہر وقت ضرورت مند ادیبوں کی ضرورتیں خدا پوری کر دیا کرتا تھا۔ آہ وہ ''بینک'' لُٹ گیا۔ وہ ''خزانہ'' پامال ہوگیا۔

مجھے وہ زمانہ بھی اچھی طرح یاد ہے جب میں دہلی ریڈیو پر اسٹاف آرٹسٹ تھا۔ ایک مرتبہ میرے پاس کپڑے ختم ہو گئے تھے، کچھ مقروض بھی تھا۔ میں ''مضراب'' کا مسودہ لے کر آپ کے پاس پہنچا۔ آپ نے پوچھا۔ ''کیا چاہیے؟'' میں نے کہا۔ ''میری ضرورتیں اس وقت تین سو روپے میں پوری ہو جائیں گی۔'' ایک منٹ کے توقف کے بغیر آپ نے تین سو روپے لاکر مجھے دے دیے۔ بحیثیت ایک پبلشر اور کاروباری آدمی کے آپ کو مجھ سے کہنا چاہیئے تھا کہ بھائی دو سو لے لو، ڈھائی سو میں سودا ہو جاتا لیکن آپ نے مجھے فوراً وہ رقم دے دی۔ جب میں نے کہا۔ ''رسید؟' آپ نے کہا۔ ''پھر دیکھا جائے گا۔'' اور آپ نے مجھ سے کبھی اس رقم کی رسید تک لینے کی ضرورت نہ سمجھی۔

آج سے تقریباً پندرہ سولہ برس پہلے تین سو کی رقم اتنی حقیر نہیں سمجھی جاتی تھی جتنی

آج کل۔ یہ رقم میرے بہت سے کاموں میں صرف ہوئی۔

غرض کہ سینکڑوں ادیبوں کے لیے شاہد احمد کا در برسہا برس تک درِ حاتم بنا رہا۔ وہی شاہد احمد آج خود ریڈیو میں اسٹاف آرٹسٹ ہے اور صرف ساڑھے چار سو روپے ماہوار پا رہا ہے۔ حالانکہ ایسے کئی ساڑھے چار سو ہم لوگ اس سے چھین کر لے جایا کرتے تھے۔ زندہ باد شاہد احمد، جو کبھی دلّی کی رونق تھا، دلّی کے ادب کا گہوارہ تھا، دلّی کا ''دربار'' تھا، دلّی کا بادشاہ تھا۔ ہر شاعر، ہر ادیب کے لبوں پر اس کا نام تھا۔ اس طرح رہتا تھا کہ نام لینے والے یہ کہے بغیر نہ رہ سکتے۔

زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بو سے مری زباں کے لیے

ہم لوگوں کی یہ بہت بڑی بدقسمتی ہے کہ دونوں ملکوں کا یہ صاحبِ طرز انشا پرداز، واحد زباں داں، آج اس طرح ''گوشہ نشینی'' کی زندگی بسر کر رہا ہے اور ہم لوگوں کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی۔ ہنسی بھی آتی ہے اور رونا بھی کہ شاہد احمد کا ''مشغلہ روزگار'' موسیقی کی تعلیم ہے۔ مجھے یوں معلوم ہوتا ہے جیسے برنارڈ شا ریوڑیاں بیچ رہا ہو، یا شیکسپیئر نے ''نان اور کباب'' کی دُکان کھول لی ہو۔

میوزک کوئی گھٹیا چیز نہیں، نہ میوزک سے دلچسپی لینا گھٹیا پن ہے۔ (میں خود میوزک ہی سے کماتا ہوں) لیکن میوزک کے جاننے والے تو ملک میں اور لوگ بھی ہیں۔ شاہد احمد ہندوستان اور پاکستان میں صرف ایک ہے۔ اس ''صرف ایک'' کی ہم صحیح قدر نہیں کر رہے، اِس ''صرف ایک'' کو ہم نے نہیں پہچانا۔ اسی ''صرف ایک'' سے ہم نے فائدہ نہیں اُٹھایا، اسی ''صرف ایک'' کی عظمت سے ہم واقف نہیں۔

خیر، ہیرا یا موتی کسی بہت ہی خوبصورت الماری میں رکھا ہو یا کسی معمولی طاق میں، اس کی قدر و قیمت یا اس کی عظمت میں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اب بھی ہزاروں لوگ ایسے ہیں جن میں خود راجہ مہدی علی خاں جیسی حقیر ہستی بھی شامل ہے، جو شاہد احمد سے مصافحہ کر لینا بھی اپنے لیے باعثِ فخر سمجھتے ہیں۔ بلکہ میری تو خدا سے دُعا

ہے کہ اے خدا اگر تو مجھے شاہد احمد جیسے عظیم الشان، نیک دل، خدا ترس انسان کے قدموں کی خاک کا درجہ بھی عطا فرما دے تو میں سمجھوں گا مجھے عمر بھر کی عبادت کا حد سے زیادہ صلہ مل گیا۔

آپ میرے محسن ہیں۔ آپ کی وجہ سے میں فلم انڈسٹری میں آیا، موٹریں خریدیں، بے شمار دولت کمائی، نام پیدا کیا اور مجھ خود غرض انسان نے کبھی آپ کا شکریہ تک ادا نہ کیا۔ مجھ میں اور شاہد احمد میں کتنا فرق ہے؟

میری خدا سے دُعا ہے کہ مرنے سے پہلے میں شاہد احمد جیسے بلند انسان کو پہلے سے بھی زیادہ ''اونچی بلندیوں'' پر دیکھ لوں۔ ''بلندیوں'' سے میرا مطلب دنیوی بلندیاں ہیں۔

شاہد صاحب میں آپ کے ان دوستوں میں سے ایک ہوں، جو آپ سے بہت کم ملے، جو آپ کی صحبتوں میں بہت کم مکس ہوئے، لیکن ہمیشہ دل و جان سے آپ کے گرویدہ رہے۔

شاہد بھائی! یقین مانئے، آپ اپنی بہت سی قیمتی چیزیں تو یہاں چھوڑ گئے لیکن آپ کی ایک نہایت ادنیٰ سی چیز بھی یہاں رہ گئی جس کا شاید آپ کو خیال تک نہیں۔ وہ چیز ہے راجہ مہدی علی خاں۔ کاش اس آدمی کو پھر آپ کے قدموں کا قرب حاصل ہو سکے۔

آپ کا گرامی نامہ پڑھ کر رقّت طاری ہے اور سمجھ میں نہیں آتا کہ اور کیا لکھوں؟ ''مضراب'' کے حقوق لوٹانے پر اگر رسمی شکریہ ادا کروں گا تو آپ کے عظیم الشان اخلاق کی توہین ہو جائے گی۔

آپ کے خط نے مجھے Puzzled اور مخبوط الحواس کر دیا ہے۔ خط لکھتے لکھتے نروس ہوا جا رہا ہوں۔ جی چاہتا ہے کہ لکھتا ہی جاؤں، لیکن رقّت اور افسوس کے جذبات پریشان کیے دے رہے ہیں۔ یوں معلوم ہو رہا ہے جیسے ایک فقیر جلا وطن بہادر شاہ ظفر کو خط لکھ رہا ہے۔''

دلّی کا سارا کاروبار ۱۹۴۷ء کے کشت وخون کی بھینٹ چڑھ گیا۔ آں دفتر را گاؤ خورد وگاؤ را قصاب برد۔ ہمیں بیک بنی و دو گوش دلّی سے نکلنا پڑا۔ پرانے قلعہ میں تین

دن پناہ لینے کے بعد ریل سے لاہور روانہ ہوئے۔ رات کو پٹیالہ کے علاقے میں ریل پر حملہ ہوا۔ آدھی ریل کٹ گئی۔ ہم سخت جان تھے بچ گئے۔ بُرے حال بانکے دھیاڑے لاہور پہنچے۔ یہاں کی فضا راس نہ آئی۔ دس مہینے بعد کراچی آ گئے۔ ساقی دوبارہ جاری کیا۔ مگر اب اس کا نقصان کہاں سے بھرا جاتا؟ اس تردّد میں تھا کہ ریڈیو پاکستان نے میوزک سپروائزر کی خدمت پیش کی۔ شکریہ کے ساتھ اسے قبول کیا۔ خدا جانے موسیقی کا شوق کہاں سے مجھے لگا۔ مولویوں کا خاندان دور دور تک گانے بجانے کا چرچا نہیں۔ مگر سنتے آئے ہیں کہ ولی کے گھر بھوت پیدا ہو جاتے ہیں، شاید یہی بات ہو۔ سولہ سال کی عمر سے کلاسیکی موسیقی اچھے اُستادوں سے سیکھنی شروع کی تھی۔ خاندان والے ناراض تھے کہ یہ کیا بیہودہ شوق لگایا ہے؟ میں خود بھی کبھی کبھی سوچتا تھا کہ موسیقی اور وہ بھی کلاسیکی موسیقی سے آخر حاصل کیا ہوگا؟ اب اندازہ ہوتا ہے کہ اگر میرے پاس یہ موسیقی کا علم و فن نہ ہوتا تو خدا جانے یہاں میرا حشر کیا ہوتا۔ ہاں تو ۱۹۳۶ء سے آل انڈیا ریڈیو کے کئی اسٹیشنوں سے کلاسیکی موسیقی نشر بھی کرنی شروع کر دی تھی مگر ایس احمد کے نام سے۔ پاکستان آنے کے بعد یہ راز بھی راز نہ رہا۔

کجا مانند آں رازے کزو سازند محفلہا

اب ہمارا شمار ادب کے علاوہ موسیقی کے اُستادوں میں بھی ہوتا ہے......

ببیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بکجا

میری زندگی کے دو پہلو ہیں۔ ادب اور موسیقی۔ میں خوش ہوں کہ میں نے انہی دونوں کے علم و فن کی بُری بھلی خدمت کی اور خدا کے فضل سے نیک نامی کے ساتھ۔ اسی خدمت کی بنیاد پر سیٹو نے جب اپنے ممبر ملکوں کے لیے گشتی مقررین کی اسکیم منظور کی تو پاکستان کے دانشوروں میں سے سب سے پہلے مجھے ۱۹۵۹ء میں منتخب کیا کہ تھائی لینڈ اور فلپینز میں پاکستان کے کلچر پر ان ملکوں کے مشہور اداروں اور شہروں میں لیکچر دوں۔ مجھے اس پر فخر ہے کہ میں نے اس خدمت کو انجام دے کر اپنے ملک کی تہذیب و ثقافت سے دور افتادہ ملکوں کو متعارف کرایا۔ ۱۹۶۱ء میں خیر سگالی کا ایک ثقافتی وفد ہندوستان گیا

تھا۔ اس میں بھی میں نے پاکستانی ادب و موسیقی کی نمائندگی کرنے کا فخر حاصل کیا۔ لسانی، ادبی اور موسیقی کے مذاکرات میں مغربی اور مشرقی پاکستان دونوں جگہ مجھے شریک ہونے کا موقع اکثر دیا جاتا ہے۔ میں اسے نہ صرف اپنے لیے باعثِ عزت سمجھتا ہوں بلکہ اپنی قوم اور اپنے ملک کی خدمت حتی المقدور ان ذرائع سے کرنا اپنا فرض اور اپنے لیے سعادت سمجھتا ہوں۔

میری ساری عمر ادب اور ادیبوں کی خدمت کرتے گزری۔ ۱۹۵۹ء کے اوائل میں جن آٹھ ادیبوں نے پاکستان رائٹرز گلڈ کا سنگِ بنیاد رکھا ان میں سے ایک میں بھی ہوں۔ بلکہ کنوینشن کے داعی اور صدر ہونے کی عزت بھی حاصل ہوئی۔

بہت گئی، تھوڑی رہی۔ اللہ توفیق دے کہ بقیہ عمر بھی اسی طرح بسر ہو جائے۔

شادم از زندگیٔ خویش کہ کارے کردم

○○

لفظ و معنی

''ساقی'' کا پہلا اداریہ
(۱۹۳۰ء)

بنامِ شاہد نازک خیالاں
عزیزِ خاطر آشفتہ حالاں

اُردو کو بہت پرانی زبان ہونے کا دعویٰ نہیں، مگر اس تھوڑی سی عمر میں اس نے اتنا عروج حاصل کیا اور اس قدر مقبول ہوئی کہ اس کی مثال السنۂ عالم میں نہیں ملتی۔ اس کا اقبال و رواج فی الحقیقت قابلِ رشک ہے۔ ہمارے ملک کی اور زبانوں کو اگر اس پر رشک آئے تو بجا مگر وہ اس سے ہمسری کا دعویٰ نہیں کر سکتیں۔ جو حلاوت اور عذوبیت اور شیرینی اُردو زبان میں ہے کسی زبان میں موجود نہیں۔ یہ وہ پودا ہے جس کو بادشاہوں نے اپنے خونِ جگر سے سینچا۔ امرا نے اس کی نشو ونما کی اور ہندوستان کے مایہ ناز اہلِ قلم نے اپنے رشحاتِ قلم سے اس کی آبیاری کی اور اب ہم یہ دیکھ کر خوش ہیں کہ وہ پودا جس نے کہ بادہائے مخالف کے سینکڑوں تھپیڑے سہے اور زمانے کے گرم و سرد کی لاکھوں خزائیں جھیلیں آج ایک خوشنما درخت بن گیا ہے جس کے سایہ میں ہم بیٹھتے ہیں۔ یہ ہمارا فرض ہے کہ اس کی بالیدگی کا حتی الامکان خیال رکھیں اور جہاں تک ہم سے ہو سکے اس کو زمانے کے مضر اثرات سے بچائیں۔ اُردو ہماری زبان ہے اس لیے اس کی حفاظت ہمارے سب کاموں پر مقدم ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ اس کے ظلِ بابرکت کو اور

وسعت دیں، یہاں تک کہ اگر ایک عالم پر نہیں تو کم از کم ہندوستان ہی پر چھا جائے۔

زبان اُردو کی تاریخ کا مطالعہ کرنے سے واضح ہوجائے گا کہ ہماری زبان اب تک ترقی کرتی رہی اور اب بھی شاہراہ ترقی پر گامزن ہے۔ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ اب نہ تو دہلی کی خاک سے غالبؔ و ذوقؔ پیدا ہوتے ہیں اور نہ لکھنؤ کی ارض مینوسواد سے آتشؔ و ناسخؔ۔ مگر صرف ایک صدی پیشتر کی اُردو کا مطالعہ کیجیے اور اس کا مقابلہ آج کی زبان سے کیجیے۔ ملک میں نہ یہ زبان تھی اور نہ یہ کتابیں جو کہ آج ہمیں میسّر آ رہی ہیں۔ تاریخ، جغرافیہ، ہیئت، نجوم، فلسفہ، مذہب غرض تمام معقول و منقول علوم کی کتب ہمیں بافراط و بہ آسانی ملتی ہیں اور ان کی تعداد میں روز بروز نمایاں اضافہ ہو رہا ہے اور وہ زمانہ دور نہیں جبکہ ہم اپنی زبان کو ایک علمی زبان بھی کہہ سکیں گے۔ زمانہ حال ترقی کا زمانہ ہے۔ ہمارے خیالات بہ نسبت گزشتہ نسلوں کے زیادہ وسیع اور زیادہ کشادہ ہیں۔ خیالات کے اظہار کے لیے ضروری ہے کہ زبان ہو اور زبان بھی وہی جس میں کہ ہمارے خیالات بہ آسانی منتقل ہوسکیں۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ ہماری زبان میں اور زبانوں کے خیالات کس قدر منتقل کیے جا رہے ہیں۔ زبان اُردو کی مثال ایک بچہ کی سی ہے کہ پہلے رینگتا ہے، پھر گھٹنوں چلتا ہے، پھر اپنے پیروں پر کھڑا ہو کر چلتا ہے اور پھر دوڑنے لگتا ہے۔ اسی طرح ہماری زبان نے بھی بتدریج ترقی کی ہے اور اپنے ابتدائی مراحل طے کرنے کے بعد اب تیزی کے ساتھ قدم اُٹھا رہی ہے۔ ہم وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ ان لوگوں کا دعویٰ قطعی باطل ہے جو کہتے ہیں کہ ''ہمارا زمانہ اُردو زبان کا دورِ انحطاط'' ہے۔ اُردو ترقی کر رہی ہے اور جوں جوں اُردو بولنے والی نسلیں ترقی کرتی جائیں گی اور جیسے جیسے یہ نسلیں متمدن نسلوں میں شمار ہونے لگیں گی اُن کی زبان بھی ایک علمی زبان شمار کی جائے گی۔ اُردو زبان ایک علمی زبان بن چلی ہے اور ایک نہ ایک دن کامل علمی زبان بن کر رہے گی۔

''تمام ہندوستان کے لوگ جو اُردو بولتے ہیں اہلِ زبان اور تمام ہندوستان کے وہ لوگ جو اُردو کی خدمت کرتے ہیں زبان دان ہیں۔ لیکن ان سب کا سرچشمہ دہلی

اور لکھنؤ ہے۔ گویا دہلی اور لکھنؤ ایک ایسا کالج ہے جہاں سے زبان کی سند ملتی ہے۔ ان میں اولیت کا تاج دہلی کے سر ہے۔" (خواجہ عبدالرؤف لکھنوی) مگر ہمیں یہ دیکھ کر افسوس ہوتا ہے کہ اہلِ دہلی اپنے موروثی وقار کو دن بہ دن کھوتے جاتے ہیں۔ جس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ہمارے ہاں کے اہلِ قلم حضرات کو مکروہاتِ دُنیا نے کچھ ایسا گھیرا ہے کہ وہ یا تو قلم ہی چھوڑ بیٹھے ہیں اور یا کوئی اچھا ذریعہ نہ ہونے کی وجہ سے خاموش ہیں۔ لکھنؤ میں زبان کا چرچہ ہے۔ کتنی ہی انجمنیں ہیں جو کہ تحفظِ ادب کے لیے قائم کی گئی ہیں۔ شعرو سخن کی گرم بازاری ہے۔ آئے دن مشاعرے ہوتے رہتے ہیں۔ مباحثے ہوتے ہیں اور زبان کی ترقی کے لیے ہر ممکن کوشش کی جاتی ہے اور اہلِ لکھنؤ کو اپنے ارادوں میں خاطر خواہ کامیابی بھی ہو رہی ہے۔ دہلی میں اہلِ قلم کا کال نہیں اور وہ لوگ بڑی غلطی پر ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ دہلی اب برائے نام رہ گئی ہے۔ وجہ صرف یہ ہے کہ ہمارے ہاں زبان کا بہت کم چرچہ ہے۔ ایک انجمن بھی ایسی نظر نہیں آتی جس کا مقصد زبان اُردو کی ترقی ہو۔ شعروسخن کا بازار بھی سرد ہے۔ کبھی برس دو برس میں سن لیتے ہیں کہ فلاں جگہ محفلِ شعراء قائم ہوئی ہے۔ ان خامیوں کی وجہ سے تبادلۂ خیالات تو مطلق ہوتا ہی نہیں اور چونکہ زبان کی ترقی کی کوشش نہیں کی جاتی اس لیے اہلِ دہلی کی ٹکسالی زبان بھی کس مپرسی کی حالت میں پڑی ہوئی ہے۔ ہمارے حوصلے پست ہوگئے ہیں اور باہر والے ہم کو ایک اجڑی ہوئی محفل سمجھتے ہیں۔

یہاں ہم یہ واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ اس زبان میں دہلی کا کوئی قصور نہیں۔ بلکہ یہ اہلِ دہلی کی انتہائی بد مذاقی ہے کہ وہ اس قدر بے التفاتی برت رہے ہیں۔ دہلی اب بھی وہی بائیس خواجاؤں کی چوکھٹ ہے جو پہلے تھی اور یہ ان ہی بزرگان دین کی برکت ہے جو یہاں کی خاک میں آسودہ ہیں کہ آج باوجود ہماری کم توجہی اور بے اعتنائی کے، دہلی کی فصاحت و بلاغت وعظمت زبان کا نام اب بھی زباں زدِ خلائق ہے اور ایک عالم میں دہلی کی ٹکسالی زبان کا سکہ جاری ہے......

ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

......اور جب کوئی مسئلہ زبان دریافت کرنا ہوتا ہے تو دہلی یا لکھنؤ ہی کے اساتذہ سے رجوع کیا جاتا ہے۔ ہمیں آج بھی وہی فخر حاصل ہے جو کہ نصف صدی پیشتر تھا۔ یعنی......

اُردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغ
ہندوستاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

قاعدہ ہے کہ ہر چیز کی ترقی کے لیے ایک تو جدو جہد ضروری ہے اور دوسرے اس کی قدر دانی۔ ہمارے ہاں زبان کی جدو جہد کچھ رہی سہی باقی بھی ہے مگر قدر دانی بالکل ہی مفقود ہے۔ پنجاب نے زبان اُردو کی ترقی کے لیے جدو جہد بھی کی اور قدر دانی بھی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ آج ترقی اُردو کا سہرا پنجاب ہی کے سر ہے۔ دکن میں قدر دانی پہلے ہوئی اور جدو جہد بعد میں۔ ہند کے مشہور اہلِ قلم کی قدر دانی دکن ہی میں ہوئی اور چونکہ علم دوست اصحاب کی قدر دانی و پرورش اب بھی وہاں ہوتی ہے، اس لیے اچھے لکھنے والوں کی بڑی تعداد دکن میں ہے۔ اُردو کا چرچہ دکن میں سب سے زیادہ ہے، اس لیے وہاں کا ہر شخص مذاق صحیح رکھتا ہے......

ہر کجا چشمۂ بود شیریں
مردم و مرغ و مور گرد آئند

بہ لحاظِ خدمت و ترقی اُردو لکھنؤ دہلی سے بڑھا ہوا ہے اور لکھنؤ کو بڑھا ہوا رہنا بھی چاہئے تھا۔ کیوں کہ لکھنؤ کے اہلِ قلم میں ایک بڑی تعداد ان لوگوں کی ہے جن کے آباؤ اجداد دہلی کے تھے اور دہلی کے اجڑنے پر لکھنؤ چلے گئے تھے۔ دہلی کے پیچھے رہ جانے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ یہاں اچھے لکھنے والے کچھ دکن چلے گئے اور کچھ لکھنؤ۔ کیونکہ انہی دو مقاموں میں ان کی پرورش ہوئی اور دہلی ان کے چلے جانے سے تقریباً خالی ہی رہ گئی۔ باوجود اس قدر ادبی نقصان کے خدا کا شکر ہے کہ دہلی اب بھی اُردو کا مرکز ہے اور بہ آواز بلند کہتی ہے......

نسیم دہلوی ہم مخزنِ بابِ فصاحت ہیں
کوئی اُردو کو کیا سمجھے کہ جیسا ہم سمجھتے ہیں

کسی زبان کو ترقی دینے کے لیے رسالوں کا جاری کرنا بھی ایک عمدہ طریقہ ہے۔ اس میں جہاں جدو جہد ضروری ہے وہاں قدر دانی بھی لازمی ہے۔ ملک کے گوشہ گوشہ سے جرائد و رسائل جاری ہیں۔ نیویارک کی آبادی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ہر منٹ ایک بچہ پیدا ہوتا ہے اور ہر منٹ ایک موت ہوتی ہے۔ کم وبیش یہی ہمارے ملک کے رسالوں اور اخباروں کے بارے میں بھی کہا جا سکتا ہے کہ ہر روز ایک اخبار یا رسالہ جاری ہوتا ہے اور ہر روز ایک بند ہو جاتا ہے۔ کسی اخبار یا رسالہ کا جاری رہنا یا بند ہو جانا اس کے حسن و قبح پر موقوف ہے۔ یہاں ''حسن و قبح'' کی تصریح وتشریح کر دینی مناسب ہے۔ حسن وہ جو کہ اُردو بولنے والے افراد کے بڑے حصے کی نظروں میں حسن ہے۔ قبح بھی علیٰ ہذا القیاس۔ یہ ہماری بد قسمتی ہے کہ ہمارے ہاں کے ادبی مذاق کا معیار اس قدر گرا ہوا ہے کہ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے العصر، ادیب، نقاد جیسے پایۂ کے پرچے صفحۂ ہستی سے حرفِ غلط کی طرح مٹ گئے اور جو بقید حیات ہیں ان کی قلیل اشاعت کا رونا سنتے سنتے ہمارے کان پک گئے۔

پُرانے رسالوں کی بے قدری میں نیا رسالہ نکالنا عالمِ صحافت کی ترقی کے عجیب سامانوں میں ہے۔ بُرے پرچے ہی اچھے پرچے کے محرک ہوتے ہیں اور جب اچھا پرچہ نکل آتا ہے تو بُرے پرچے داغِ مفارقت دے جاتے ہیں۔ اس کی مثال یوں سمجھئے کہ چاند کے چڑھتے ہی ستارے ماند پڑ جاتے ہیں۔ اس کشمکشِ باہمی میں میدان اسی کے ہاتھ رہتا ہے جو کہ ہر طرح اس کے لائق ہوتا ہے۔ یا یوں کہیے کہ جو مذاق عامہ کے موافق ہوتا ہے وہی بازی لے جاتا ہے۔

دہلی سے کئی رسالے جاری ہیں، جن میں اچھے بھی ہیں اور برے بھی۔ ان کی میں مزید وضاحت کرنا نہیں چاہتا کیوں کہ علم دوست اصحاب سے یہ حقیقت پوشیدہ نہیں ہے کہ ان میں سے کون سا اچھا ہے اور کون سا بُرا۔ ہاں اتنا ضرور کہیں گے کہ یہاں کا اچھا اور پنجاب کا یا لکھنؤ کا اوسط درجہ کا پرچہ برابر ہے اور اسی سے ہماری بے التفاتی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ دہلی کی اس بد مذاقی اور اس شدید کمی کو پورا کرنے کے لیے

ضروری ہوا کہ ایک علمی و ادبی رسالہ مناسب حالات وضرویاتِ وقت کے نکالا جائے جو اگر باہر کے پرچوں سے بیس نہیں تو اُنیس بھی نہیں رہے اور دہلی کے ان اچھے لکھنے والوں کے مضامین اس میں شائع ہوں جو کہ ایک اچھا ذریعہ نہ ہونے کی وجہ سے خاموش ہیں۔ چنانچہ ساقی کو اس خدمت کی انجام دہی کے لیے پیش کیا جاتا ہے کہ میگساران سخن کی کیف اندوزی کے لیے نظم ونثر کے جرعہ ہائے لطیف فراہم کرتا رہے۔

اَیں نامہ کہ بود نطع ایں فرش
من می برمش بہ کنگرۂ عرش
ایں لعل کہ داشت پائے در گل
من می نہمش بہ کرسی دل
ایں جرعہ کہ ریختند برخاک
من می کشمش بجام افلاک

ہم اپنی بے بضاعتی کے باوجود اپنی ناچیز علمیت کے موافق زبان اُردو کی خدمت کرنے کے لیے کمر بستہ ہیں۔ ہمارا نصب العین یہ ہے کہ ساقی ایک ایسا جامعہ ہو کہ ہر شخص اس کے مطالعہ سے محظوظ ہو۔

کلیہ ہے کہ کمال کا حال ایک ہی دفعہ معلوم نہیں ہوسکتا۔ اس پرچہ میں بھی ہماری مرضی کے موافق ساری خوبیاں جمع نہ ہوسکیں۔ اچھے لکھنے والے اس بات کے منتظر ہیں کہ پہلے پرچے کو دیکھ لیں تب لکھیں۔ ہمیں بھی منظور ہوا کہ پرچہ کا معیار دیکھ کر لکھیں۔ غرض پہلے پرچہ میں یہ ضد نہیں کی گئی کہ ساری خوبیاں ختم کردی جائیں۔ اس لیے ہم چاہتے ہیں کہ ساقی کے میکش اس کی پہلی کوشش سے اس کے غایت اہتمام کا قیاس نہ کرلیں۔ اس کی خوبیاں آئندہ معلوم ہوتی جائیں گی۔ اس وقت مشتے از خروارے آپ کے رو برو ہے۔ ہماری طرف سے تو یہ اقرار ہے کہ جس قدر اس پرچہ کی قدر کی جائے گی اسی قدر اس کی خوبیاں بڑھتی جائیں گی۔ اب انتظار ہے تو آپ کے اظہارِ کرم کا۔

از جوش و خرِد خود چہ گویم
ایں بادہ توئی و من سبویم

اب جولوگ اپنی زبان کا حق سمجھتے ہیں ساقی کی ترقی سے غافل نہ رہیں۔ تمام ضروری کاموں پر اس کی ترقی کو مقدم سمجھیں۔ کیوں کہ ساقی کی ترقی زبانِ اُردو کی ترقی ہے اور زبان اُردو کی ترقی آپ پر فرض ہے۔

''ساقی'' میں صرف وہی مضامین درج کیے جائیں گے جو کہ معیارِ ادب پر پورے اتریں گے۔ اس لیے اگر کسی صاحب کا مضمون شائع نہ ہوسکے تو اس سے وہ پست ہمت نہ ہوں بلکہ کوشش کریں کہ آئندہ اس سے بہتر مضمون لکھیں۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کہ ایک طالب علم امتحان میں ناکامیاب رہتا ہے اور امتحان میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے دوبارہ محنت کرتا ہے اور چونکہ وہ زیادہ محنت کرتا ہے اس لیے کامیاب ہوجاتا ہے۔

○○

''ساقی'' کا دُوسرا اِداریہ

(۱۹۴۸ء)

(کراچی سے شائع ہونے والے ساقی کا پہلا ارادیہ)

الحمدللہ کہ ساقی کی صورت دوبارہ دکھائی دی......

گو میں رہا رہینِ ستم ہائے روزگار
لیکن تیرے خیال سے غافل نہیں رہا

پورے ایک سال بعد ساقی کے چھپنے کا موقع آیا۔ اس تمام عرصے میں ساقی جاری کرنے کی کوشش کی گئی لیکن نامساعد واقعات نے ہمیشہ مایوس کیا۔ دلّی کے چھٹنے اور ثاث البیت کے لٹنے نے دل و دماغ ماؤف کر دیا تھا لیکن وقت کے ساتھ تعطل و جمود رفع ہوا۔ اپنی بربادی پر صبر آ گیا۔ ہمت مردانہ نے دور سے آواز دی......

آفتابِ تازہ پیدا بطن گیتی سے ہوا
آسماں ٹوٹے ہوئے تاروں کا ماتم کب تلک؟

اور جرأتِ رندانہ نے بیدار ہو کر ایک بار پھر دُنیائے عمل میں لا کھڑا کیا۔ چاروں طرف تباہی و بربادی کا اندھیرا پھیلا ہوا تھا، لیکن امید کی ننھی سی کرن جگمگا رہی تھی اور سرگرم عمل ہونے کا اشارہ کر رہی تھی۔ گزشتہ زندگی ایک حسین خواب بن چکی تھی۔ اب نہ جائداد تھی، نہ کاروبار تھا اور نہ بینک کا روپیہ تھا۔ آمدنی کے سارے ذرائع مسدود ہو چکے تھے۔ احباب مدد فرمانا چاہتے تھے لیکن مجھے تو دولتِ پاکستان سے اپنی روزی آپ پیدا کرنی تھی۔ جس نے ہزاروں جھمیلوں میں سے نکال کر مجھے لاہور پہنچایا تھا وہی آئندہ

بھی میرا کفیل ہوگا اور بہ فضلہٖ مجھے ہر طرح کی آسائش مل گئی۔ کچھ نہ ہوتے ہوئے بھی سب کچھ مل گیا۔ پاکستان مل گیا تو سب کچھ مل گیا۔ نفسا نفسی کے عالم میں کسی سے بے مروتی کی شکایت بے جا ہے۔ تاہم ان دوستوں کی محبت ساری عمر یاد رہے گی جنھوں نے ڈھارس بندھائی۔ ان میں سب سے پیش پیش ایم اسلم ہیں جن کے خلوص نے میرے سارے غم دھو دیئے۔ میں نے لاہور کو اپنا وطنِ ثانی بنایا تھا لیکن چند ناگزیر وجوہ کی بنا پر مجھے کراچی منتقل ہونا پڑا اور یہیں سے ساقی جاری ہو رہا ہے۔ لاہور سے میرا تعلق منقطع نہیں ہوا ہے بلکہ میرا بیشتر وقت لاہور ہی میں گزرتا ہے۔ لاہور سے کوئی کیسے جدا ہوسکتا ہے؟ میرے عسکری صاحب بھی لاہور ہی میں ہیں اور ساقی مرتب کرنے میں کوشاں رہتے ہیں۔ اگر ان کی اعانت مجھے حاصل نہ ہوتی تو ساقی اب بھی چھپنے نہ پاتا۔ یہ پہلا پرچہ عجلت میں تیار کیا گیا ہے تاہم اپنے سابقہ معیار سے ساقط نہیں سمجھا جاسکتا۔ امید ہے کہ آئندہ شمارے بہتر سے بہتر ہوتے جائیں گے۔

مشہور پریس کراچی کے مالک حکیم محمد تقی صاحب نے طباعت کا ذمہ لے کر حقِ دوستی اور حقِ وطن ادا کیا۔ اگر ہر قدم پر تائید ایزدی شاملِ حال نہ ہوتی تو ساقی کا خدا جانے کب تک انتظار رہتا۔

ساقی جنوری ۱۹۳۰ء میں جاری ہوا تھا تو مشکلات پیش آئی تھیں ان سے کچھ زیادہ ہی اس وقت پیش آرہی ہیں۔ ہمارے پاس سوائے جذبہ خدمت کے اب اور کچھ نہیں ہے۔ اس لیے اب ساقی کو زندہ رکھنا آپ کا کام ہے۔ پچھلا سارا اندوختہ ہجرتِ عظیم کی بھینٹ چڑھ گیا۔ ساقی کے اس نئے دورِ حیات کو اس طرح قائم رکھ سکتے ہیں کہ زیادہ سے زیادہ ساقی کی اشاعت کو خود خریدیں اور دوسروں کو اس کی خریداری پر مائل کریں۔ اس کی آمدنی پر نہ تو میرا پہلے دارومدار تھا اور نہ اب انحصار ہے۔ اس کی آمدنی اسی کی بہتری پر صرف ہوتی ہے۔ گزشتہ اُنیس برس میں ساقی نے جو کچھ پیش کیا سب آپ کے سامنے ہے۔ اب آپ خود اندازہ کیجئے کہ ساقی آئندہ کیا ہوگا۔ قدردانی شاملِ حال رہی تو انشاء اللہ پچھلے دور سے بھی بڑھ چڑھ کر شائع ہوگا۔ ہم اس فرض میں کوتاہی نہیں کریں گے۔ اب اپنی ذمہ داری نبھائیں گے۔ امید ہے کہ سب کام سدھ ہوجائیں گے۔

○○

''ساقی'' کا آخری اداریہ

(۱۹۶۷ء)

حملہ تو بڑا سخت ہوا تھا مگر زندگی تھی، بچ گیا۔ خدمت کرنے کی کچھ اور مہلت مل گئی۔ رسمِ دُنیا تو یہ ہے کہ پکی عمر والوں کو چھٹی دے دی جاتی ہے تا کہ وہ باقی عمر سکون سے گزار دیں۔ مگر شاید ادب کی نوعیت بھی عشق جیسی ہے کہ......

اس کو چھٹی نہ ملی جس کو سبق یاد ہوا

تقریباً سبھی عیادت کرنے والوں نے اس نیک خواہش کا اظہار کیا کہ مجھے طویل عمر ملنی چاہئے تا کہ اُردو ادب کی خدمت ہوتی رہے۔ خود اپنا بھی یہ حال ہے کہ......

سو بار بندِ عشق سے آزاد ہم ہوئے
پر کیا کریں کہ دل ہی عدو ہے فراغ کا

جیتے جی تو میں ادب سے قطع تعلق کر نہیں سکتا۔ مگر سدا کون جیا ہے؟ اس لیے ذرا اس پر بھی غور کر لینا چاہئے کہ......

کون ہوتا ہے حریف مئے مرد افگنِ عشق
ہے مکرر لبِ ساقی پہ صلا میرے بعد

○○

اُردو زبان کا مسئلہ

برادرِ مکرم طفیل صاحب۔ سلام مسنون۔

تازہ ''نقوش'' میں آپ کا اداریہ ''طلوع'' پڑھا۔ آپ نے اس میں اُردو کے ایک نہایت اہم مسئلے کو چھیڑا ہے۔ یہ مسئلہ جتنا اہم ہے اتنا ہی نازک بھی ہے۔ خصوصاً میرے لیے کہ میرے بیان سے بعض آبگینوں کو ٹھیس لگنے کا اندیشہ ہے۔ سچی بات کڑوی ہوتی ہے مگر آپ مصر ہیں تو عرض کرتا ہوں۔

رکھیو غالبؔ مجھے اس تلخ نوائی سے معاف
آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

''طلوع'' کا پہلا فقرہ ہی محلِ نظر ہے۔ آپ نے پہلے ہی سے یہ فرض کر لیا کہ آپ کے علاوہ اور سب تنگ دل ہیں۔ جبھی تو آپ نے لکھا ہے۔ ''آپ بھی دل میں کشادگی پیدا کرلیں۔'' اگر میں اسے آپ کی تنگ دلی قرار دوں تو کیسا؟

جی ہاں، اُردو بڑی اچھی اور بڑی پیاری زبان ہے اور بڑی نرالی زبان ہے۔ کیوں کہ اُردو بولنے والے مردوں کی زبان اور ہے اور عورتوں کی زبان اور۔ اور عورتوں کی زبان بھی اپنی جگہ پر ترقی یافتہ ہے اور اتنی وسیع کہ مولانا سید احمد، صاحبِ فرہنگ آصفیہ، عورتوں کے محاوروں کی ایک جامع لغات ''لغات النساء'' کے نام سے لکھ گئے ہیں، دُنیا کی شاید ہی کوئی ترقی یافتہ زبان ایسی ہو کہ اس میں مردوں اور عورتوں کی زبانیں الگ الگ ہوں۔ عورتوں کی زبان میں اگر شاعری دیکھنی ہو تو ریختیاں ملاحظہ

فرمائیے۔ ان کے مضامین شاید ثقہ طبیعتوں پر ناگوار گزریں تو گزریں، زبان کا چٹخارہ یقیناً مزہ دے جائے گا۔

دُنیا کی دوسری بڑی زبانوں کی طرح اُردو بھی مقامی بولیوں اور دوسری زبانوں کو اپنے اندر جذب کرتی چلی آرہی ہے۔ اس کا تو خمیر ہی زبانوں اور بولیوں کے آمیزے سے اٹھا ہے۔ چھوت چھات کی یہ نہ تو پہلے کبھی قائل تھی اور نہ اب ہے۔ زندہ زبانیں چھوت چھات کو نہیں مانتیں اور نہ اچھوت رہنا پسند کرتی ہیں۔ ان کا تال میل سب سے ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے اُردو ہرجائی بھی ہے، حریص بھی ہے، جس کی جو چیز پسند آتی ہے لے کر اپنے اندر جذب کر لیتی ہے، کبھی پرائی چیز کو جوں کا توں رہنے دیتی ہے اور کبھی اس کی شکل ہی بدل ڈالتی ہے۔ یہ عادت بھی اس نے اپنی ترقی پذیر بہنوں سے سیکھی ہے۔ جبھی تو من موہنی بن گئی اور اس کا جادو سارے ہندوستان پر چل گیا تھا۔ بھلا جس نے عوام میں جنم لیا ہو، سرکاروں، درباروں میں قدم رکھا ہو، بادشاہوں کی منہ چڑھی رہی ہو، اس کی بڑھوتری کیسے رک سکتی تھی؟ ککڑی کی بیل کی طرح بڑھتی ہی چلی گئی اور ہندوستان کی سرحدوں کو پھلانگ کر دوسرے براعظموں پر بھی چولائی کی طرح پھیلنے لگی۔ اب دُنیا میں آپ جہاں چاہے چلے جائیں، اُردو بولنے والے آپ کو مل ہی جائیں گے، اور صاحب غضب کی ڈھیٹ زبان ہے، بڑی سخت جان۔ ہمسایہ ملک میں اُردو کو نہ صرف اچھوت بنایا جارہا ہے، بلکہ اسے قتل کرنے کے سامان کیے جارہے ہیں، مگر یہ ہے کہ ڈٹی ہوئی ہے اور برابر بڑھتی ہی جا رہی ہے۔ عجب بلا ہے کہ یونانی صنمیات کے ہائیڈرا کی طرح اگر اس کا سر قلم کیا جاتا ہے تو ایک کے بدلے دو سر نکل آتے ہیں۔ اُردو کسی کے مارے نہیں مر سکتی۔ یہ تو یونہی نئے نئے میدان مارتی چلی جائے گی۔ کوئی صاحب اگر اس کے باب میں چھوت چھات کے وہم میں مبتلا ہیں تو اس وہم کو دل سے نکال دیں۔

جی ہاں کسی زمانے میں اُردو کے دو مرکز تھے۔ پہلا مرکز دلّی اور دوسرا لکھنؤ۔ اگر دونوں مرکزوں میں روز مرہ، تذکیر و تانیث اور بعض لفظوں کے استعمال میں فرق تھا تو

کیا غضب آ گیا؟ ہر زبان جغرافیائی اور مقامی لحاظ سے چولے بدل لیتی ہے۔ انگریزی زبان کو دیکھو کہ اسکاٹ لینڈ میں، آئرلینڈ میں، ویلز میں، پھر ان پڑوسی ملکوں سے نکل کر سات سمندر پار کے ملکوں میں کس کس طرح اور کس کس فرق سے بولی جا رہی ہے۔ اور تو اور امریکہ ہی کو لے لیجئے۔ انگریز ہی تو جا کر امریکہ میں بسے تھے۔ اپنی زبان انگریزی ہی تو ساتھ لے گئے تھے۔ ان ہی انگریزوں کی اولاد کو دیکھئے کہ اب کیسی بولی بول رہے ہیں اور لکھ رہے ہیں۔ انہوں نے تو لفظوں کے حروف تک بدل ڈالے اور لفظ کے حروف تلفظ سے ہم آہنگ کر دیئے۔ تبدیلی تو صاحب اس حد تک بھی ہو سکتی ہے۔ دلّی اور لکھنؤ کے ذرا ذرا سے فرق پر کیوں گرفت کی جائے؟ یہ بھی زبان کے زندہ ہونے کا ثبوت ہے کہ وہ مقامی اثرات کو قبول کرتی رہتی ہے۔ اگر دلّی سے نکل کر لکھنؤ، بہار، پنجاب اور حیدرآباد دکن وغرہ میں اُردو اپنے نئے ماحول کے اثرات قبول نہ کرتی تو البتہ تعجب کی بات ہوتی اور اُردو مسدود ہو کر حجریات میں شامل ہو جاتی۔ اُردو بولنے والوں کی طرح اُردو بھی کشادہ دل ہے۔ اگر ایسی نہ ہوتی تو حضرت امیر خسرو ہی کے زمانے میں ٹھٹھر کر مرجاتی۔ مرتی وہ زبانیں ہیں جو تنگ دل ہوتی ہیں اور جن کے بولنے والے تنگ دل ہوتے ہیں جیسے سنسکرت موت کے گھاٹ اتر گئی۔

زبان کے مرکز کسی کے قائم کیے سے قائم نہیں ہوتے۔ جس طرح فطری زبانیں خود بخود بنتی چلی جاتی ہیں، زبان کے مرکز بھی خود بخود بن جاتے ہیں۔ جس شہر میں ثقہ اہل زبان زیادہ ہوتے ہیں مستند شاعر اور ادیب زیادہ ہوتے ہیں وہ شہر مرکز بن جاتا ہے اور زبان کی سند اسی شہر کے بزرگانِ ادب سے ملنے لگتی ہے۔ دلّی میں جب تک مغل بادشاہوں کی خوش اقبالی اور درباروں میں فارغ البالی رہی، اہل ہنر اور اہلِ کمال بھانت بھانت کے کھنچ کر آتے رہے اور اس شہر کے نام کو چار چاند لگاتے رہے۔ اس شہر کو انہوں نے اپنا وطن بنایا اور اسی شہر میں پیوندِ خاک ہو گئے۔

چپے چپے پہ ہیں یاں گوہرِ غلطاں، تہہِ خاک
دفن ہوگا نہ کہیں اتنا خزانہ ہرگز

دلّی ان اہل کمال کی وجہ سے زبان کی ٹکسال بنی اور اسی ٹکسال سے اُردو کا سکہ جاری ہوا۔ جب مغل بادشاہی برائے نام رہ گئی اور شاہی خزانے خالی ہو گئے تو متوسلینِ شاہی اور اہلِ ہنر اور اہلِ فن نے ترکِ وطن کر کے پورب کا رخ کیا۔ فیض آباد اور فیض آباد کے بعد لکھنؤ کا شاہی دربار ان کا مرجع بنا۔ دلّی کی کوکھ اجڑتی رہی اور لکھنؤ کی کوکھ ہری ہوتی رہی۔ مرکز اینٹ پتھر سے نہیں بنتا۔ اہلِ کمال سے بنتا ہے۔ چنانچہ لکھنؤ دوسرا مرکز بنا۔

ہر کجا چشمۂ بود شیریں
مردم و مور و ملخ گرد آیند

جو سخت جاں تھے وہ دلّی ہی میں رہے۔ لال قلعہ میں مغلوں کی شمع جھلملا رہی تھی۔ اس کے گرد پروانے جمع ہوتے رہے۔ انہیں کے دم سے دلّی کی مرکزیت قائم رہی۔ لہٰذا دونوں مرکز اپنی اپنی جگہ پر قائم رہے۔ حالات و واقعات اور ان سے بڑھ کر ماحول نے ان دونوں مرکزوں میں چھوٹے چھوٹے سے اختلافات پیدا کر دیئے جو آگے چل کر بڑے بڑے معرکوں کی شکل اختیار کر گئے۔ جب دو برتن ہوتے ہیں تو کھڑک ہی جاتے ہیں۔ دونوں اپنی اپنی بات پر اڑے رہے۔

وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے ہم اپنی وضع کیوں بدلیں

یہ اختلافات بھی زبان کی ترقی کا ذریعہ بن گئے کہ اُردو کے دو بڑے دبستان قائم ہو گئے۔ دبستانِ دہلی اور دبستانِ لکھنؤ۔ دوسرے شہر والوں نے جسے پسند کیا اس کی تقلید و پیروی کرنے لگے۔ اُردو کے لیے دونوں آنکھیں برابر تھیں۔ ان میں سلوک بھی رہا اور چشمکیں بھی ہوتی رہیں۔ تو یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ دُنیا کی ریت ہی یہ ہے۔ ہم اختلاف اس لیے کرتے ہیں کہ ہم میں اتفاق ہو۔

آپ نے بڑے مزے کی بات کہی ہے کہ ''جو چیز لکھنؤ سے مونث چلتی تھی، وہ دلّی پہنچ کر مذکر بن جاتی تھی۔'' یہ فقرہ نا تمام ہے اسے یوں ہونا چاہئے۔ ''جو چیز لکھنؤ سے مونث چلتی تھی وہ دلّی پہنچ کر مذکر بن جاتی تھی اور لاہور پہنچ کر مخنث''، یعنی مذکر بھی اور

مونث بھی۔ یہ خرابی ہے دو کشتیوں میں ایک ساتھ پاؤں رکھنے کی۔

اب یہ کہ ''لکھنؤ نہ وہ لکھنؤ ہے۔ نہ دلّی وہ دلّی ہے۔ اُردو کے طالب علم کدھر جائیں؟ کسے اپنا امام تسلیم کریں؟ کس سے سند پائیں؟'' اس مسئلہ کو واقعی حل کرنے کی ضرورت ہے۔ آپ یہ نہ بھولیے کہ ۱۹۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد دلّی اور لکھنؤ سے زیادہ لاہور اُردو علم و ادب اور زبان کا مرکز بن گیا تھا۔

۱۸۵۶ء میں شاہان اودھ کی بساط الٹی اور اس کے ایک سال بعد لال حویلی اُجڑی۔ اہلِ کمال آشفتہ حال ہوئے اور جس کے جہاں سینگ سمائے نکل گیا۔ مولانا محمد حسین آزاد اور مولانا حالؔی نے لاہور کو اپنے لیے پسند کیا۔ کسی نے رام پور اور کسی نے حیدرآباد دکن کی راہ لی۔ آگے چل کر دکن بھی اُردو کا ایک مرکز بن گیا۔ بہار والوں کو بھی بہار کے مرکز ہونے پر اصرار رہا۔ مگر یہ سارے مرکز اب ختم ہو چکے ہیں (سوائے لاہور کے) لہٰذا آپ یہ سوال کرنے میں حق بجانب ہیں کہ......

> ''اُردو کے طالب علم اب کدھر جائیں؟ کسے اپنا امام تسلیم کریں، سند کس سے پائیں؟''

سند اس سے لی جاتی ہے جو سند دینے کے اہل ہوتے ہیں۔ شہروں سے سند نہیں لی جاتی۔ مستند اہلِ زبان جہاں بھی ہوں ان سے سند لیجئے۔ مستند مصنفوں کی مستند تصنیفوں سے سند لیجئے۔ اگر سائلؔ و بیخودؔ سے سند لی جاتی تھی تو جوشؔ ملسیانی سے بھی سند لی جاتی تھی اور لی جاتی ہے۔ اگر امیرؔ و داغؔ، آزاد و سرشارؔ مر چکے ہیں تو ان کے دیوان اور ان کی کتابیں تو نہیں مریں؟ وہ اپنی گزار گئے مگر ہمارے لیے ہدایت کے چراغ تو چھوڑ گئے۔

''چھوڑیئے صاحب!'' کی بھی ایک ہی رہی۔ یہ آپ کے چھڑائے کب چھوٹتے ہیں؟ انہوں نے تو آبِ حیات پیا ہے اور اُردو کو آبِ حیات پلایا ہے۔ ہاں اُردو کو چھوڑ دیجئے تو ان سے آپ کا پیچھا چھوٹ جائے گا۔ آپ ماضی سے اپنا رشتہ منقطع کرنے کے بعد کہاں رہ جائیں گے؟ آج کا ماحول اتنا تو نہیں بدلا کہ امیرؔ و داغؔ اس میں ناکارہ ثابت ہوں۔ ابھی تو ہم مرزا مظہر جانِ جاناں اور سوداؔ اور میرؔ کو بھی نہیں چھوڑ

سکے۔ یہ خیال بھی آپ کا صحیح نہیں ہے کہ.....

''اُردو کو دھکے مار کر اپنے گھر سے نکال دیا گیا ہے۔''

جن ۱۴ زبانوں کی سرپرستی بھارت کی حکومت کر رہی ہے ان میں سے ایک اُردو بھی ہے۔ ہر چند کہ بھارت کی قومی زبان ہندی قرار دی گئی ہے۔ پھر بھی بھارت کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک اُردو ہی راج رچ رہی ہے۔ بلکہ یوں کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ ہندی کی چھاتی پر مونگ دل رہی ہے۔ بارہ سال کے بعد میں ایک خیر سگالی کے وفد میں دلّی گیا تھا۔ مجھے تو ۲۴ لاکھ کی آبادی میں ایک بھی ہندی بولنے والا نہیں ملا۔ ہاں لکھنے والے بہت سے ملے۔ مگر وہ بھی بولتے اُردو ہی ہیں۔ پھر پانچ کروڑ مسلمان جو وہاں ہیں وہ کونسی زبان بولتے ہیں؟ ہندو تو ہندی بولتا ہی نہیں، مسلمان کیا کھا کر ہندی بولے گا؟ بھارت میں کاغذ پر قومی زبان ہندی ہے مگر آج بھی بھارت کی عام زبان اُردو ہی ہے۔ اُردو کے دشمن تک اُردو بولنے پر مجبور ہیں اور اگر ہٹ دھرمی سے ریڈیو وغیرہ پر ہندی بولتے ہیں تو کسی کے پلے نہیں پڑتا کہ کیا فرمایا گیا۔ لاچار ہو کر آل انڈیا ریڈیو کو روزانہ ایک اُردو بلیٹین بھی نشر کرنا پڑا اور کسی کا تو ذکر ہی کیا پنڈت جواہر لال نہرو کی تقریر جب چاہے سن لیجیے۔ ایک آدھ لفظ مصلحتاً ہندی کا بیچ میں ڈال دیتے ہیں۔ ورنہ ساری تقریر اُردو ہی میں ہوتی ہے۔ بقول آپ کے ''دھکے مار کے'' تو ہمیں نکالا گیا ہے۔ تو ہوا یہ کہ ہمارا سب کچھ وہاں رہ گیا مگر ہماری زبان ہمارے ساتھ یہاں آ گئی۔ ''پاکستان اُردو کے لیے پناہ گاہ بن گیا۔'' اور مغربی پاکستان کی قومی زبان اُردو بن گئی۔ یہاں بھی اُردو خوش نصیب رہی۔

اُردو کا مسکن تو سرحد کے دونوں طرف دلوں میں ہے۔ مغربی پاکستان اُردو کا من ہے۔ ''آئندہ چل کر اُردو کا ڈھانچہ کیا ہوگا؟'' اس کا جواب تو مستقبل ہی دے گا۔ اُردو کی تاریخ میں اس کی تدریجی ترقی دیکھیے اور یہ دیکھیے کہ حضرت امیر خسرو کے وقت میں اُردو کیا تھی؟ اور رفتہ رفتہ وہ اُردو کیسے بنی، جس کے وارث ہم ہیں۔ اس کے بعد آپ اندازہ لگا سکیں گے کہ مستقبل میں اُردو کیسی ہوگی۔ اُردو تو ہمیشہ اپنے ماحول سے

متاثر ہو کر بدلتی چلی آ رہی ہے۔ مقامی زبانوں کے الفاظ اس میں ہمیشہ نفوذ کرتے رہے ہیں۔ دکھنی اُردو کی بین مثال ہمارے سامنے ہے۔ پشتو، پنجابی، سندھی اور بلوچی کے الفاظ اور محاورے بھی ''حسب ضرورت'' اس میں جگہ پاتے جائیں گے۔ یہ چھوٹی زبانیں تو اُردو کے لیے خون صالح مہیا کریں گی، خدانخواستہ ان زبانوں سے اُردو کو کسی قسم کا بیر نہیں ہے۔ اُردو تو دامن پھیلا کر ان سے امداد لے گی۔ چھوٹے دریا ہمیشہ بڑے دریا میں شامل ہو کر اسے زندہ رکھتے ہیں۔ اسی طرح اُردوئے معلیٰ ہے، آج کل کی اُردو کو ضرورت ہوگی تو اس سے بھی مدد لے گی، اعلیٰ درجے کی اُردو کو چھوڑ کر ہم ادنیٰ درجے کی اُردو کو رواج نہیں دے سکتے۔ مگر اس کے ساتھ ہی آپ کا یہ کہنا کہ......

''آج اگر کوئی یہ اعتراض کرے کہ ''میں نے جانا ہے'' غلط ہے تو وہ کوئی دانش مندی کا ثبوت نہیں دے گا۔'' دل کو نہیں لگا۔ ایک طرف تو آپ اُردوئے معلیٰ کو رواج دینا ایک غیر دانشمندانہ فعل قرار دیتے ہیں اور دوسری طرف آپ غلط اُردو کو رواج دینے پر مصر ہیں کیوں کہ آپ سمجھتے ہیں کہ ''آج اُردو کو اہلِ پنجاب کے مزاج کا ساتھ دینا ہوگا۔'' یہ ''نے'' کا اشقلہ، کوئی تیس سال پہلے محمد دین تاثیر مرحوم نے چھوڑا تھا۔ مرحوم کے دماغ میں نت نئی شرارتیں جنم لیتی تھیں۔ چنانچہ انہوں نے اپنی ایک غزل میں یہ مصرعہ رکھ دیا تھا......

تُو نے اُلفت مجھ سے کرنی ہے تو کر میرے لیے

اس وقت اس پر خاصی لے دے ہوئی تھی اور تاثیر کا مقصد بھی یہی تھا کہ کچھ ہنگامہ ہو۔ انہوں نے لکھا تھا کہ مجھے اُس میں زیادہ ترنم معلوم ہوتا ہے۔ مگر یہ ترنم صرف تاثیر ہی کو سنائی دیا اور بس ایک ہی دفعہ سنائی دیا۔ اس کے بعد انہوں نے بھی اپنی نظم یا نثر میں اس ترنم کا استعمال نہیں کیا۔ اس وقت لاہور ہی میں ڈاکٹر اقبال، شیخ عبدالقادر، ظفر علی خاں، سالکؔ، مہرؔ، امتیاز علی تاجؔ، پطرسؔ، حامد علی خان، صلاح الدین احمد، میرؔاجی، حفیظؔ، حسرتؔ جیسے جلیل القدر بزرگانِ ادب موجود تھے۔ کسی نے تاثیر کی تائید نہیں کی۔ کسی نے اس مترنم ''نے'' کو اختیار کر کے اپنی تخلیقات کو وقیع تر نہیں بنایا اور اس

تیس سال کے عرصے میں پنجاب کے ہزاروں اچھے شاعروں اور ادیبوں میں سے کسی نے اس ترنم زدہ بدعت کو اختیار نہیں کیا۔

ڈاکٹر تاثیر نہایت ذہین اور قابل آدمی تھے۔ مگر انہوں نے بھی پطرس کی طرح ادب کا کوئی علمی کام نہیں کیا۔

ایک دفعہ تاثیر نے ایک مشہور ماہنامہ میں کسی شاعر کا تذکرہ لکھا اور اس کا نمونۂ کلام بھی پیش کیا۔ ہمارے محققین میں بڑی واہ واہ ہوئی۔ بعد میں تاثیر نے بتایا کہ سرے سے اس شاعر کا وجود ہی نہیں تھا۔ سب من گھڑت تھی۔ نمونۂ کلام بھی خود ہی گھڑ دیا تھا۔ مرحوم کو ایسی انوکھی شرارتیں سوجھا کرتی تھیں۔

اب تیس سال بعد آپ کو اس پر اصرار ہوا ہے کہ ''میں نے جانا ہے'' کو صحیح مانو ورنہ پنجاب کا مزاج برہم ہو جائے گا۔

جی تو میں اسے غلط ہی کہوں گا۔ لاہور ہی میں اب بھی کئی مستند بزرگ خدا کے فضل سے موجود ہیں۔ چلئے مولانا مہر اور مولانا صلاح الدین احمد (اور حضرات بھی ہوں گے جو اس وقت یاد نہیں آ رہے) سے اس ''نے'' کے بارے میں ان کی رائے اور لے لیجئے۔

بولنے کی زبان اور ہوتی ہے اور لکھنے کی اور۔ بولنے میں مقامی الفاظ اور محاورے اور لہجہ سب چلتا ہے۔ مگر لکھنے میں اہلِ زبان ہی کی تقلید کی جاتی ہے۔ دکن کے کسی ادیب یا شاعر کو ہو (ہاں) نکو (نہیں) پن (لیکن) پانی نہانا۔ میرے کو (مجھے) اور سینکڑوں مقامی الفاظ اور محاوروں کو اپنی تخلیقات میں داخل کرتے آپ نے کبھی دیکھا؟ اگر من مانی کرنے کی ادب و شعر میں کھلی چھٹی مل جاتی تو اُردو مینارِ بابل بن جاتی۔

آپ شوق سے ''میں نے جانا ہے'' اور ''تو نے آنا ہے'' اپنے مضامین میں لکھنا شروع کیجئے۔ آج کی اور مستقبل کی اُردو نے اگر قبول کر لیا تو چشم ما روشن، دلِ ما شاد، زندہ زبانوں میں الفاظ آتے رہتے ہیں اور جاتے رہتے ہیں۔ اگر کسی لفظ کی ضرورت زبان کو ہوتی ہے تو وہ اسے قبول کر لیتی ہے، ورنہ کھوٹے سکے کی

طرح نکال کر باہر کرتی ہے۔

زبانیں بڑی سست رفتاری کے ساتھ چولے بدلتی ہیں۔ میرامنؔ کی ''چہار درویش'' آج بھی ہماری رہ نمائی کر رہی ہے۔ اللہ بخشے بابائے اُردو مولوی عبدالحق فرمایا کرتے تھے کہ جس طرح ایمان تازہ کرنے کے لیے قرآن شریف پڑھا جاتا ہے، میں اپنی زبان تازہ کرنے کے لیے ''چہار درویش'' پڑھا کرتا ہوں۔

جب تک ایسی کلاسیکس زندہ ہیں ہم ان سے روگردانی نہیں کر سکتے مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہماری زبان نئے الفاظ حسبِ ضرورت اپنے اندر شامل نہ کرتی رہے۔ جب آپ فرمائیں گے......

''بادشاہو! ناراض ہونے کی ضرورت نہیں۔'' تو آپ کا مخاطب بھلا مانس کہے گا:

''چنگا جی۔''

اس پر اہلِ سرحد، اہل سندھ اور اہلِ بلوچستان کی آئندہ بننے والی اُردو کا قیاس کر لیجیے۔ آپ تو دلّی اور لکھنؤ کے تھوڑے سے اختلافات ہی پر معترض ہیں۔ مغربی پاکستان کے ان چار ''اہلوں'' کی مختلف مستقبل کی اُردوؤں کے متعلق کیا ارشاد ہے؟

دیکھیے مستقبل کی اُردو آپ کے یا میرے کہنے سے نہیں بنے گی۔ زبان کی نمو فطری ہوتی ہے کیوں کہ زندگی سے اس کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ آپ کا خیال ہے کہ ''اس خودرَو پودے کی نشو و نما میں غیر فطری باڑیں نہ لگائی جائیں۔'' مگر زبانوں کو اگر مادر پدر آزادی دے دی جائے، اس کی رکھوالی کرنے والا کوئی نہ ہو، کوئی روکنے ٹوکنے والا نہ ہو، کلاسیکس اور اُردوئے معلّٰی سے تعلق منقطع کیا جائے تو اس زبان کا حشر کیا ہوگا؟ جھاڑ جھنکاڑ کا ایک جنگل نہ بن جائے گا؟ آزادی کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ ہر زمانے میں کچھ ایسے لوگ ہوتے ہیں جو زبان کی تراش خراش کر کے اسے خوب صورت بناتے رہتے ہیں۔ یہ تراش خراش ایک غیر فطری حرکت ہوتی ہے مگر آرٹ کا کام ہی یہ ہے کہ آزاد فطرت میں جو کچھ حسین ہے اسے تراش خراش کر غیر فطری طور پر مفید اور حسین تر بنائے۔ باڑیں خوش نمائی کے لیے ہی لگائی جاتی ہیں اور انہیں مالی تراش کر خوشنما بناتے

ہیں۔ یہ مالی یا رکھوالے ہمارے وہ ادیب و شاعر ہیں جنہیں بصارت کے ساتھ بصیرت بھی ملی ہے، جن کی نظر زبان کی ان باریکیوں تک پہنچ جاتی ہے جن تک سب کی نظریں نہیں پہنچ سکتیں۔ جیسے نظامِ عالم کو قائم رکھنے کے لیے غوث، ابدال، قطب، مجذوب وغیرہ صاحبِ خدمت ہوتے ہیں، زبان کے بھی صاحبِ خدمت ہوتے ہیں۔ یہ اپنی خاموش خدمت میں لگے رہتے ہیں۔ ہمیں اتنا زیادہ زبان کے باب میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ فطری عمل بھی جاری رہے گا اور اس کی آراستگی بھی ہوتی رہے گی۔

زمانے کے ساتھ ساتھ زبانیں بدل جاتی ہیں۔ یہ بھی ایک فطری عمل ہے۔ دکھنی اُردو آج ہمیں غیر مانوس نظر آتی ہے تو یہ بھی ایک فطری بات ہے۔ شیکسپیئر کی انگریزی بھی اب بولی اور لکھی نہیں جاتی۔ نصف صدی یا ایک صدی تو نہیں البتہ تین چار صدی بعد اگر ہم کسی طرح اس دُنیا میں آسکے تو اُردو کی شکل بھی شاید ہم سے پہچانی نہ جاسکے گی۔ شاید اس وقت اس کا نام بھی کچھ اور ہو کیوں کہ اُردو اپنی صورت کے ساتھ نام پلٹتی چلی آرہی ہے۔ پاکستان بن جانے کے بعد اُردو کے نادان دوستوں نے اس کا نام پلٹ کر ''پاکستانی'' رکھنے کی تحریک پیش کی تھی۔ ممکن ہے کہ چند صدیوں بعد اس کا نام بھی بدل جائے تو پھر اس میں ایسا کون سا اندیشہ ہے جس کے لیے ہم دبلے ہونے لگیں؟ ہمارا کام یہ ہے کہ ہمیں جو امانت ملی ہے اسے بنا سنوار کر آنے والی نسل کو سونپ جائیں۔ آگے وہ جانیں اور ان کا کام۔

اُردو صرف لال قلعہ کی زبان نہیں ہے۔ اُردو لال قلعہ سے دو سو سال پہلے بھی موجود تھی۔ یوں کہیے کہ لال قلعہ میں پہنچ کر اُردو اُردوئے معلّٰی بنی۔ ورنہ اُردو خاص و عام سب کی زبان تھی۔ ہر طبقے کی زبان تھی اور طبقے ہی کے اعتبار سے اس کی طبقاتی شکلیں مروج تھیں۔ لال قلعہ کی زبان گلی کوچوں کی زبان بن ہی نہیں سکتی تھی جیسے ونڈسر پیلس کی انگریزی نچلے طبقوں کی زبان نہیں بن سکتی۔ پڑھے لکھے شرفاء اور ثقہ حضرات کی زبان گلی کوچوں اور بازار کی زبان سے مختلف ہوتی ہے۔ آپ کا خیال یہ ہے کہ ''اُردو لال قلعہ کی زبان ہے اسے آج مغربی پاکستان کے گلی کوچوں کی زبان بننا ہوگا، ورنہ --- ورنہ اس

ڈولی کا بوجھ ہمارے کندھے سہار نہ سکیں گے۔'' یہ اچھی ضد ہے کہ یا تو آگ میں موتو ورنہ مسلمان ہو، جی صاحب! یہ فطری عمل کے خلاف ہے۔ ایسا تو دلّی میں بھی نہیں ہوا۔ جہاں لال قلعہ موجود ہے کہ دلّی کے گلی کوچوں میں لال قلعہ کی زبان بولی گئی ہو۔ مغربی پاکستان کے گلی کوچوں میں جو زبانیں بولی جا رہی ہیں انہیں اگر آپ سنیں تو آپ کے رونگٹے کھڑے ہو جائیں۔ یہ آموختہ زبانیں ہیں۔ گجراتی اُردو، مکرانی اُردو، بلوچی اُردو، سندھی اُردو، سرائیکی اُردو، پنجابی اُردو، پوٹھاری اُردو، پشتو اُردو اور سب سے زیادہ انگریزی اُردو۔

مغربی پاکستان میں تو ابھی زبانوں کی باؤلی ہنڈیا پک رہی ہے۔ جب یہ پک چکے گی تو ہماری مستقبل کی اُردو اس میں سے برآمد ہوگی اور اس کے بولنے اور لکھنے والے ہماری تحریروں کو اسی نظر سے دیکھیں گے جس نظر سے آج ہم ''سب رس'' کی اُردو کو دیکھ رہے ہیں۔ ہم اور آپ اس وقت اس ڈولی کا بوجھ سہارنے کے لئے موجود نہیں ہوں گے۔ اس وقت کوئی اور کہار ہوں گے۔

آپ نے اچھا کیا کہ اس مسئلہ کو چھیڑ دیا۔ آپ کی بعض باتوں سے اختلاف کیا جا سکتا ہے اور صحیح فیصلہ کے لیے اختلاف ضروری ہوتا ہے۔ حکومت کے اداروں میں بھی حزبِ مخالف ہوتا ہے لہٰذا آپ اختلاف سے دلگیر نہ ہوں۔ آپ نے ایک بات خلوص و محبت سے کہی ہے۔ سوتیلی ماں کی زبان سے نہیں سگی ماں کی زبان سے۔ مگر سگی ماں بھی تو بے راہ روی سے بالاتر نہیں ہوتی۔ بعض دفعہ جذبات کی رو میں بہہ جاتی ہے۔ ہر شخص کو اپنی زبان پیاری ہوتی ہے۔ ادیبوں اور شاعروں کو اور بھی زیادہ۔ کیوں کہ زبان کا بنانا سنوارنا اور اسے ترقی دینا انہی کا کام ہوتا ہے۔ اسے سیکھنے اور سلیقے سے برتنے کے لیے انہیں سینکڑوں معیاری کتابوں کا مطالعہ کرنا ہوتا ہے۔ پھر انہیں مشق و مزاولت کے ہفت خواں طے کرنے پڑتے ہیں۔ اس پر بھی برسوں کے بعد ان کی نثر یا نظم میں چٹخارہ پیدا ہوتا ہے۔

امیرؔ اک مصرعۂ ترتیب کہیں صورت دکھاتا ہے
بدن میں خشک جب ہوتا ہے شاعر کے لہو برسوں

زبان کا معاملہ آزادی کا نہیں پابندی کا ہے۔ ادیبوں کا ایک ایک لفظ زبان و بیان کی کسوٹی پر پرکھا جاتا ہے کیوں کہ ادیب سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ نفیس اور قابل تقلید نثر لکھے گا۔ ہر ادیب کی امکانی کوشش یہی ہونی چاہئے۔ تو اس کا دعویٰ کوئی نہیں کرسکتا کہ وہ بے عیب نثر لکھتا ہے، یا اس سے کوئی غلطی ہو ہی نہیں سکتی۔ ہمارے سامنے رہ نمائی اور تقلید کے لیے اسلاف کے اعلیٰ نمونے ہیں۔ دلّی اور لکھنؤ کے نمونے بڑی حد تک مثالی سمجھے جاتے ہیں۔ کنگز انگلش کے بعد آکسفورڈ اور کیمبرج کی انگریزی مثالی تصور کی جاتی ہے۔ اب دلّی اور لکھنؤ مرکز نہیں رہے تو لاہور اور کراچی مرکز بن گئے ہیں اور لاہور تو ایک صدی سے اُردو کا مرکز بنا ہوا ہے۔ کراچی قیام پاکستان کے بعد بن رہا ہے، کیونکہ دلّی اور لکھنؤ کی بیشتر آبادی کراچی میں منتقل ہوگئی ہے اور اب اس ۲۲ لاکھ آبادی کے شہر میں اُردو کے مقتدر ادارے بھی قائم ہو چکے ہیں اور لاہور کی طرح کراچی میں بھی اُردو کا کچھ کام نہیں ہو رہا ہے۔

مشرقی پاکستان کی داستان اندوہناک ہے وہ بھی کسی وقت لکھی جائے گی۔

پنجاب کے احسانات سے جو انکار کرے وہ کافر، زندہ باد زندہ دلانِ پنجاب۔

— جب تک اُردو کے مخلص خادم موجود رہیں گے ''اُردو کی مانگ کا سیندور نہیں لٹ سکتا۔''

○○

ساز و آواز

راگ رنگ کی ایک رات

دہلی میں یوں تو بے شمار موسیقار تھے مگر گانے والوں میں مظفر خاں، چاند خاں اور رمضان خاں۔ سارنگی نوازوں میں ممن خاں اور بندو خاں۔ ستار بجانے والوں میں برکت اللہ خاں۔ تال کے سازوں میں اللہ دیئے خاں پکھاوجی اور نتھو خاں طبلہ نواز پورے ہندوستان میں منفرد سمجھے جاتے تھے۔ ان سب فنکاروں کا تعلق دیسی ریاستوں سے تھا۔ کیونکہ دلی کی بادشاہی ختم ہو جانے کے بعد فرنگیوں نے اہل ہنر کی قدر نہ کی۔ روزی کے مارے سارے فنکاروں کو ریاستوں ہی میں آسرا ملا۔ شاہی زمانہ میں ان کی بڑی بڑی جاگیریں تھیں جو ۱۸۵۷ کے ہنگامے میں تلپٹ ہو گئیں۔ یہ تو اب آخر میں فنکار ناقدری کی وجہ سے گرتے گرتے اتنے پست ہو گئے تھے کہ ان میں سے اکثر کو نانِ شبینہ بھی میسّر نہ ہوتی تھی ورنہ محمد شاہ بادشاہ دہلی کے زمانے میں نعمت خاں (سدارنگ) کی یہ کیفیت تھی کہ وہ سوائے بادشاہ کے کسی اور کے ہاں گانے نہیں جاتا تھا۔ خود اس کے گھر میں روزانہ محفل ہوتی تھی بلکہ موسیقی کا دربار سجتا تھا۔ دربار اکبری کے رتن میاں تان سین نے تو وہ عروج پایا کہ ان کا نام ضرب المثل بن گیا۔ آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کے درباری گائیک تان رس خاں کو گاؤں گراؤں انعام میں ملے ہوئے تھے۔ دلی میں چتلی قبر سے آگے دائیں ہاتھ کو گلی تان رس خاں اب بھی موجود ہے جس میں تان رس خاں کی عظیم الشان حویلی آج بھی اپنی عظمت رفتہ پر کھڑی آنسو بہا رہی ہے۔

۱۹۴۷ء کے وسط میں جب چھرے گھونپے جا رہے تھے اور شام کے چھ بجے سے

صبح کے چھ بجے تک کرفیو لگ رہا تھا، دلی کے دو چار منچلوں کو سوجھی کہ ایک ایسا جلسہ تان رس خاں کی حویلی میں ہو جائے جس میں تمام اہل کمال اپنے اختلافات کو بالائے طاق رکھ کر شریک ہوں۔ دلی کے ایک رئیس زادے تھے جنہوں نے اس فن میں اِتنا درک حاصل کر لیا تھا کہ تمام کام کرنے والوں نے انہیں گنی مان لیا تھا۔ خوش اخلاق آدمی تھے اس لئے ان کی ڈیوڑھی گانے بجانے والوں کا مرکز بن گئی تھی۔ انہی کی کوششوں سے ان لوگوں کے اختلافات بہت کچھ دور ہو گئے تھے اور ان میں یک جہتی پیدا ہو گئی تھی۔ یا تو ایک کو ایک کھائے جا رہا تھا یا یہ صورت ہو گئی کہ شیر بکری ایک گھاٹ پانی پینے لگے تھے۔ انہی رئیس زادے کی یہ تجویز تھی اور یہی صاحب سب کو نیوتا دیتے پھرے، اور ایک شام کو کوئی دو سو نامی گرامی گائیک اور بجائیک چھ بجے سے پہلے پہلے تان رس خاں کی حویلی میں جمع ہو گئے۔ صدر دالان میں دری چاندنی کا فرش لگا ہوا تھا۔ دو چار بڑے بوڑھے مہمانوں کی پذیرائی کر کے انہیں حسب مراتب بٹھاتے گئے، پس دالان اور پیش دالان دونوں بھر گئے۔ صحن میں دیگیں چڑھی ہوئی تھیں۔ پخت و پز کے نگراں اُستاد عمری رکاب دار تھے جو دور دور براتوں میں کھانا پکانے کے لئے بلائے جاتے تھے۔ یہ دلی کے اسی علاقے کے رہنے والے تھے اس لئے انہوں نے اپنی خدمات مفت پیش کی تھیں۔ چھ بجے کے بعد نہ تو کوئی اندر آ سکتا تھا اور نہ اندر سے باہر ہی کوئی جا سکتا تھا۔ لہٰذا دروازے بند کر دئے گئے تھے۔ جلسہ شروع ہوا۔ پان سگریٹ۔ حقہ اور برف کے پانی سے تواضع ہوتی رہی۔ بھائی چارے کا وہ زور تھا کہ کوئی شخص دوسرے کو بھائی کا سابقہ یا لاحقہ لگائے بغیر مخاطب نہ کرتا تھا۔ اس جلسہ کا تفصیلی بیان باعث طوالت ہوگا اس لئے اختصار کے ساتھ عرض کرتا ہوں۔

کھانے سے پہلے سازوں کا پروگرام ہوا۔ ہونہار نوجوانوں نے اپنے اپنے گھروں کا باج طبلے پر سنایا۔ کسی نے قاعدہ کھولا۔ کسی نے ریلا پھینکا۔ کسی نے گت اور پرن سنائے۔ کسی نے تِپلی اور چوپلی کا حساب پیش کیا۔ اس کے بعد طے ہوا کہ کھانے سے فارغ ہو لیا جائے۔ دونوں دالانوں میں دسترخوان بچھ گئے، دہرا کھانا چنا گیا۔ زردہ

بریانی، قورمہ اور شیر مال۔ سب نے خوب سیر ہو کر کھایا۔

کھانے کے بعد آخر میں اُستادوں کی باری آئی۔ تبرکاً انہوں نے بھی علم سینہ کا مظاہرہ کیا۔ محفل میں کوڑھ ایک بھی نہیں تھا اس لئے سب کو خوب خوب اور با موقع داد ملی۔

آخر میں اُستاد گامی خاں جوڑی لے کر بیٹھے۔ انہوں نے محسوس کر لیا کہ حاضرین تین گھنٹہ تک طبلہ سنتے سنتے اکتا چکے ہیں۔ لہٰذا انہوں نے باج کے ساتھ اس کا بیان شروع کر دیا۔ اُستاد گامی خاں کا رشتہ کئی پشت اوپر اُستاد مکھو خاں سے جاملتا تھا۔ یہ مکھو خاں وہ تھے جو خواجہ میر دردؔ کی ماہانہ محفلوں میں پکھاوج اور طبلہ بجایا کرتے تھے۔ لال قلعہ کے اکثر شہزادے ان کے شاگرد تھے۔ اُستاد گامی خاں نے دلی کا خاص باج سنایا جسے ڈبیا کا باج کہتے ہیں۔ پورب اور جاوڑہ کے باج سے اس کا فرق بتایا، پھر اپنے پرکھوں کی گتیں سنائیں۔ جب مکھو خاں کا طبلہ سنانے پر آئے تو ان سے منسوب ایک عجیب وغریب واقعہ بھی سنایا۔

''دادا مکھو شہزادوں کو تعلیم دینے لال قلعہ روزانہ بعد مغرب جایا کرتے تھے۔ ایک دن صاحب عالم کی ڈیوڑھی پر پہونچے تو دربان نے کہا۔ ''اُستاد توقف فرمایئے۔ صاحب عالم اپنے اگن کی چہکار سے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔ میں اطلاع کئے دیتا ہوں۔'' دادا جی مونڈھے پر بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر بعد طلبی ہوئی۔ صاحب عالم دالان میں فروکش تھے۔ دادا جی سات سلام کرتے آگے بڑھے، اگن کا پنجرا دالان کی بیچ کی محراب میں لٹکا ہوا تھا۔ نگاہ روبرو ہونے کی وجہ سے دادا جی نے دیکھا نہیں۔ آدمی تھے اونچے پورے قد کے۔ دالان میں جو داخل ہوئے تو شامت اعمال ان کا سر اگن کے پنجرے سے ٹکرا گیا۔ لو میاں اگن نے بولنا بند کر دیا۔ صاحب عالم کی تیوری پر بل پڑ گئے۔ دادا جی کے ہوش اُڑ گئے۔ ہاتھ جوڑ کر بولے۔ ''خطا معاف، خانہ زاد نے دیکھا نہیں۔'' صاحب عالم نے برہمی سے کہا۔ ''اُستاد تمہاری ٹکر سے جانور بھڑک کر خاموش ہو گیا۔ اب یہ نہیں بولے گا۔'' دادا جی نے عرض کیا۔ ''حضور کے اقبال سے بولے گا۔'' مگر اگن نے چپ سادھ لی۔ صاحب عالم نے کہا۔ ''اُستاد اگر اگن نہ بولا تو آج تمہاری خیر نہیں۔''

دادا جی کے پیروں تلے کی زمین نکل گئی کہ خبر نہیں صاحب عالم ناراضگی میں کیا کر گزریں۔ ہوش و حواس قائم کر کے بولے۔ ''حضور کے اقبال سے ضرور بولے گا۔'' یہ کہہ کر سامنے سے طبلے کی جوڑی اٹھائی اور محراب میں پنجرے کے نیچے بیٹھ کر ایک گت بجانی شروع کی۔ اللہ کی شان چندمنٹ کے بعد اگن نے چہکنا شروع کر دیا اور جوں جوں گت کی لے بڑھتی جاتی تھی اگن کی چہکار تیز ہوتی جاتی تھی۔ صاحب عالم کی باچھیں کھل گئیں اور بولے۔ ''سبحان اللہ! اُستاد آج جیسا طبلہ ہم نے سنا، نہ کسی نے سنا اور نہ کوئی سنے گا۔'' یہ کہہ کر آواز دی۔ ''ارے کوئی ہے؟'' خدام دوڑ پڑے۔ فرمایا۔ ''اُستاد کے ہاتھ کچل دو۔'' حکم حاکم مرگ مفاجات۔ دادا جی کے ہاتھ کچل کر بھرتہ کروائے گئے۔

دادا جی قلعہ سے افتاں و خیزاں اپنے گھر آئے۔ کس سے داد فریاد کرتے؟ زبردست مارے اور رونے نہ دے۔ اسی عالم بیچارگی میں ڈولی میں پڑ کر اپنے پیرومرشد داتا ملن شاہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ انہوں نے کیفیت سنی اور حال دیکھا تو ان کی آنکھوں سے جلال ٹپکنے لگا۔ اسی حالت جذب میں دادا جی کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لئے اور بولے۔ ''جا تو اچھا ہو جائے گا۔'' ان کی دُعا اور اللہ کے فضل سے دادا جی کے ہاتھ کچھ عرصہ میں بالکل ٹھیک ہو گئے۔''

یہ واقعہ سنانے کے بعد اُستاد گامی خاں نے کہا۔ ''میرے بزرگوں سے گت سینہ بہ سینہ مجھے پہونچی ہے۔ آج یہاں سبھی گُنی موجود ہیں، وہ گت سناتا ہوں۔''

یہ کہہ کر اُستاد نے گت شروع کی۔ پہلے آہستہ، پھر رفتہ رفتہ لے بڑھتی گئی اور سچ مچ یہ معلوم ہونے لگا جیسے چڑیاں چہچہا رہی ہیں۔ سب نے کہا۔ ''سبحان اللہ، ماشاء اللہ! بے شک یہ وہی گت ہو سکتی ہے۔'' رئیس زادہ نے کہا.....

بے جان بولتا ہے مسیحا کے ہاتھ میں

طوالت کے خیال سے اس جلسہ کی تفصیل کو چھوڑتا ہوں۔ صرف ایک واقعہ ایسا اور ہے، جس کا بیان خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔

اُستاد بندو خاں سارنگی نواز بھی یکتائے روزگار تھے۔

اُنہوں نے اپنے لئے بانس کی ایک سارنگی بنائی تھی۔ یہ سارنگی جتنی چھوٹی تھی اتنی ہی اس کی آواز بڑی تھی۔ تار اور طربیں ملا کر اُستاد بولے۔ ''آج میں بھی آپ حضرات کو ایک عجوبہ سناؤں گا۔'' سب متوجہ ہو گئے، بولے۔ ''آپ لوگوں نے دیپک راگ کا نام تو بہت سنا ہوگا۔ مگر کسی کو گاتے بجاتے نہیں سنا ہوگا۔ میں آپ کو آج دیپک راگ سناؤں گا۔'' اُستاد چاند خاں (جو موسیقی کے عالم بھی ہیں اور اُستاد بندو خاں کے ماموں زاد بھائی اور خلیفہ بھی ہیں) تڑپ کر بول اُٹھے۔ ''نہیں بھائی صاحب دیپک نہ بجایئے۔ کچھ اور بجا لیجئے۔'' بندو خاں نے مسکرا کر کہا۔ ''چاند خاں، ڈرو مت دیپک سے آگ نہیں لگے گی۔'' چاند خاں صاحب نے کہا۔ ''بھائی سنتے تو یہی چلے آئے ہیں کہ دیپک سے بجھے ہوئے چراغ جل اٹھتے ہیں اور آگ لگ جاتی ہے۔ آگ لگ جانا کوئی اچھی بات تھوڑی ہے۔ اس لئے یہ راگ متروک ہو چکا ہے۔ ہم اگر دیپک کی اس روایت کو نہ بھی مانیں تب بھی یہ تو مانتے ہیں کہ دیپک منحوس راگ ہے۔ اس کے گانے بجانے سے ضرور کوئی نقصان پہونچ جاتا ہے۔'' بندو خاں صاحب نے کہا۔ ''چاند خاں، تم تو پنڈت ہو۔ کتابیں پڑھ پڑھ کر عجیب عجیب باتیں سناتے ہو۔'' دو بڑے اُستادوں میں اختلاف کو بڑھتے دیکھ کر رئیس زادے نے کہا آپ دونوں حضرات صحیح فرما رہے ہیں۔ مگر ہمارے اعمال و افعال اس درجہ غلط ہو گئے ہیں کہ دُعا میں بھی اثر نہیں رہا۔ دراصل دیپک شام کا ایک راگ ہے جو چراغ جلے گایا بجایا جاتا ہے کہ اسی وجہ سے اس کا نام دیپک یا چراغ رکھا گیا۔ دیپک سے چراغ نہیں جلتے بلکہ چراغ جلتے ہیں تو دیپک گایا بجایا جاتا ہے۔ اب رہ گیا سعد و نحس کا معاملہ تو بعض وہمی باتیں بھی سچ ہو جایا کرتی ہیں۔''

یہ بات سب کی سمجھ میں آ گئی مگر چاند خاں صاحب دیپک کو منحوس ہی بتاتے رہے۔ بندو خاں صاحب نے کہا۔ ''اچھا سن تو لو آئندہ نہیں بجائیں گے۔'' یہ کہہ کر انہوں نے دیپک شروع کر دیا۔ راگ میں کوئی غیر معمولی بات نہ تھی، سیدھا سادا راگ

تھا۔ خان صاحب نے خوب جی لگا کر بجایا مگر جب تک بجاتے رہے خواہ مخواہ طبیعت مکدر رہی۔ شاید وہم اپنا کام کر گیا۔ انہوں نے اپنی سارنگی رکھی ہی تھی کہ صبح کی اذانیں ہونے لگیں۔ دلوں کا تکدر دُور ہوا......

موذن مرحبا بروقت بولا
تری آواز مکّے اور مدینے

اذانیں ختم ہوئیں تو پھر سب ہنسنے بولنے لگے۔ چائے کا آخری دور چلا اور سب کی زبان پر یہی تھا کہ ایسا جلسہ دِلّی میں کبھی بھی حاضرین کے ہوش میں نہیں ہوا۔ چھ بجے جب کرفیو ختم ہوا تو صحبتِ شب برخاست ہوئی اور سب اپنے اپنے گھروں کو سدھارے۔

دِلّی میں فسادات بڑھتے ہی چلے گئے۔ ستمبر کے پہلے ہفتے میں دِلّی میں آگ لگنی شروع ہوئی۔ مسلمان مارے جا رہے تھے اور ان کے گھر لٹ رہے تھے۔ قرول باغ ختم ہوا۔ سبزی منڈی ختم ہوئی۔ پہاڑ گنج ختم ہوا۔ آدھا شہر جل چکا تھا۔ شہر کے کئی لاکھ مسلمان پرانے قلعے اور ہمایوں کے مقبرے میں جا پڑے تھے۔ پرانی دِلّی میں بھیروں ناچ رہا تھا۔ ہم سب بھی جان بچا کر کسی نہ کسی طرح پاکستان پہونچ گئے۔ بندو خان صاحب بھی لاہور پہونچے اور ایک سال کے بعد کراچی آ گئے۔ انہیں کوئی جگہ رہنے کی یہاں ڈھنگ کی نہیں ملی۔ ہار کر لالوکھیت کے ویرانے میں پڑ رہے۔ نہایت عسرت و تنگدستی میں آخری عمر بسر ہوئی۔ چاند خاں صاحب دِلّی ہی میں رہ گئے۔ اب بھی وہیں ہیں۔ سالہا سال کے بعد ان سے ملاقات ہوئی تو میں نے اُنہیں دِلّی کا وہ آخری جلسہ یاد دلایا۔ خاں صاحب فقیر منش اور رقیق القلب آدمی ہیں، آبدیدہ ہو گئے۔ بولے۔ ''بھائی صاحب آپ نے دیکھ لی دیپک کی نحوست! دِلّی کو لوکا لگ گیا۔ وہ دِلّی ہی میں ہیں مگر ہمارے دِلوں میں فراق کی آگ لگی ہوئی ہے۔ یہ آگ آنسوؤں سے بھی نہیں بجھتی۔ ایک ایک کو آنکھیں ڈھونڈتی ہیں اور نظریں مایوس پلٹتی ہیں۔''

اور میں اکثر سوچتا ہوں کہ کیا واقعی ۱۹۴۷ء میں جو دِلّی بھسم ہو گئی تو بقول چاند

خاں صاحب کے راگ کی آگ میں جلی تھی؟ یا یہ محض ایک سوء اتفاق تھا، دلی کی قسمت ہی میں یہ لکھا ہے کہ جلتی ملتی رہے۔

دل کے پھپھولے جل اُٹھے سینے کے داغ سے
اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

○○

ہمارے ساز

موسیقی کے تین عناصر ہیں۔ گانا، بجانا اور ناچنا۔ یہ سب ذرائع ہیں اظہارِ جذبات کے۔ فن کار کسی جذبے کی تصویر بناتا ہے یا خود تصویر بن جاتا ہے اور سننے والے یا دیکھنے والے کے دل میں بھی وہی جذبہ پیدا کر دیتا ہے۔ کمالِ فن یہی ہے کہ فن کار دوسروں کو بھی اسی طرح متاثر کرے جس طرح خود متاثر ہوتا ہے۔ موسیقی میں اگر تاثر نہ ہو تو وہ موسیقی نہیں ہوتی، شور و شغب بن جاتی ہے۔ گلوئی موسیقی کی ہم آہنگی یا نقالی کے لیے سازی موسیقی وضع ہوئی۔ سازوں کی ایجاد کے بارے میں وثوق سے نہیں کہا جا سکتا کہ کون سا ساز کب وضع ہوا، تاہم اتنا یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ گانے اور ناچنے کی طرح ساز بنانے کا تصور بھی فطرت ہی نے انسان کو دیا، آبشاروں کا ترنم، دریاؤں کی روانی، ہوا کے جھونکے، سمندر کی لہریں، اُن سب کی سریلی آوازیں سازوں کے قالب میں ڈھل گئیں۔ یونانِ قدیم کی ایک روایتی کہانی ہمیں بتاتی ہے کہ ایک حکیم اپنے دورانِ سفر میں دھوپ اور گرمی سے تھک کر ستانے کے لیے تھوڑی دیر کو ایک گھنے درخت کے سائے میں لیٹ گیا۔ ہوا کے ہر جھونکے کے ساتھ اس درخت میں سے سریلی آوازیں آنے لگیں۔ حکیم نے بہت دیکھا بھالا مگر اسے کچھ پتہ نہ چل سکا کہ یہ آوازیں کہاں سے آ رہی ہیں۔ جب یہ آوازیں برابر آتی رہیں تو حکیم سے ضبط نہ ہو سکا اور اس کا سبب معلوم کرنے کی غرض سے درخت پر چڑھ گیا۔ درخت کی پھننگ پر حکیم نے دیکھا کہ ایک مرے ہوئے بندر کی آنتیں دو ڈالیوں میں الجھ کر تن گئی ہیں۔ ان سے جب ہوا

کے جھونکے ٹکراتے ہیں تو ان میں کپکپی پیدا ہوتی ہے اور اس ارتعاش سے نغمے پیدا ہوتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اس حکیم نے اسی اصول پر وایولن ہارپ بنایا۔ اس بربط میں رودے یعنی تانت کے تار لگائے اور اسے مکان کے اوپر ہوا کے رخ پر جڑ دیا۔ ہوا کے نرم اور تیز جھونکوں سے طرح طرح کے نغمے اس بربط سے پیدا ہونے لگے۔ زمانے کی ترقی کے ساتھ ساتھ تانت اور تار کے مختلف ساز وجود میں آتے گئے۔ اسی طرح روایت ہے کہ پہاڑ کی جھریوں اور سوراخوں میں سے ہوا کے گزرنے سے سیٹیوں کی آوازیں سن کر پھونک سے ساز بجانے کا تصور متقدمین کو ملا، یا نرسلوں میں سے ہوا کے سنسنانے سے بانسری بجانے کا تخیل پیدا ہوا۔ بہر حال اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ سازوں کی ایجاد کے باب میں بھی فطرت ہی انسان کی معلم اول ہے۔

ساز تین قسم کے ہوتے ہیں......

ا۔ گز سے بجنے والے: جیسے چکارہ، دلربا، طاؤس، سارنگی، سارندہ وایولن اور چیلو۔

۲۔ ضرب سے بجنے والے: جیسے بین، ستار، رباب، ڈھولک، طبلہ اور پیانو۔

۳۔ پھونک سے بجنے والے: جیسے کارنٹ، کلارنٹ، بانسری اور مشک باجہ۔

دلربا صورت شکل میں ستار سے ملتا جلتا ہے۔ ستار کی طرح اس کے گلو میں پردے بندھے ہوتے ہیں۔ باج کے تار کے علاوہ جوڑا کھرج، پنچم اور ٹیپ کے تار بھی ہوتے ہیں۔ آس دینے کے لیے پردوں کے نیچے طربیں ہوتی ہیں۔ اسکا پیٹ یا ساؤنڈ بکس سارنگی سے مشابہ ہوتا ہے۔ قدیم ایرانی تصویروں میں دریا کی شکل کے ساز پائے جاتے ہیں۔ موجودہ دلربا پنجاب کا تحفہ ہے۔ تار پر انگلی رکھ کر اسے بجایا جاتا ہے، پردوں سے اس کے سُر متعین کیے جاتے ہیں۔

سارنگی دلربا سے آدھے قد و قامت کا ساز ہے۔ یہ ساز سوا ہندوستان اور پاکستان کے دُنیا بھر میں کہیں نہیں پایا جاتا۔ اس ساز میں تین باج کے تار تانت کے ہوتے ہیں۔ ان پر تین سپتکیں بجائی جاتی ہیں۔ تار کی موٹائی پر کھرج کا دار و مدار ہوتا ہے۔ گونج پیدا کرنے کے لیے طربوں کے تین set ہوتے ہیں۔ یہ ساز ناخنوں

سے بجایا جاتا ہے۔ اس طرح کہ تانت کے پہلو سے ناخن ملا کر رکھا جاتا ہے۔ بائیں ہاتھ کی انگلیوں کے ناخن رگڑ دے کر اوپر یا نیچے کھسکائے جاتے ہیں اور دائیں ہاتھ سے باج کے تار پر گز چلایا جاتا ہے۔ سارنگی میں پردے نہیں ہوتے اس لیے یہ سب سے دشوار ساز سمجھا جاتا ہے۔ گلے کے ساتھ سنگت کرنے اور راگ کے نازک مقامات ادا کرنے میں یہ ساز اپنا جواب نہیں رکھتا۔ اس کے پیٹ پر پتلی کھال منڈھی ہوتی ہے جس سے آواز میں گونج پیدا ہوتی ہے۔ جو کچھ گایک کے گلے سے ادا ہوتا ہے اسے سارنگی نواز اپنے ناخنوں سے ادا کر دیتا ہے۔ ہماری زبان کا محاورہ ''ناخنوں میں ہونا'' اسی سے استعارہ ہے۔

وایولن: اہلِ مغرب کی سارنگی ہے۔ نازک سی کمر، صراحی دار گردن۔ کہا جاتا ہے کہ جب ہسپانیہ میں مسلمان راج رجتے تھے کسی مسلم فن کار نے اسے ایجاد کیا۔ اس کے چار تار ہوتے ہیں جن پر انگلیاں چلائی جاتی ہیں۔ وایولن کا نچلا حصہ تھوڑی کے نیچے دبا لیا جاتا ہے تاکہ ساز ہلنے نہ پائے۔ دائیں ہاتھ سے گز چلایا جاتا ہے اور بائیں ہاتھ کی انگلیاں تاروں پر دوڑتی ہیں۔

چیلو: بڑی وایولن ہوتی ہے۔ قد و قامت میں وایولن سے چوگنی۔ اس کے بھی چار تار ہوتے ہیں موٹی تانت کے۔ گز سے بجایا جاتا ہے۔ کھرج دار ہے۔ اس سے آرکسٹرا بھاری بھرکم ہو جاتا ہے اور شکوہ پیدا ہوتی ہے۔ بھاری اور بڑا ساز ہونے کی وجہ سے چیلو زمین پر لٹکا کر بجایا جاتا ہے۔

سارندہ: سرحدی ساز ہے۔ وایولن سے بھی چھوٹا ہوتا ہے۔ اس کا گنجارہ دل کی شکل کا ہوتا ہے اور آگے سے کُھلا ہوتا ہے۔ تار فولاد کے ہوتے ہیں۔ گز سے بجایا جاتا ہے۔ آواز تیز ہوتی ہے۔ سرحدی دھنوں کے لیے سب سے موزوں ساز ہے۔ اب ہمارے سازینے میں بھی شامل ہو گیا ہے۔

ستار: ضرب سے بجنے والے سازوں میں ستار ہر دلعزیز ساز ہے۔ کہا جاتا ہے کہ بین کے جواب میں اُمیر خسرو نے ستار بنایا۔ اس میں ابتداً صرف تین تار تھے۔

جس کی وجہ سے ''سہ تار'' اس کا نام رکھا گیا۔ امتدادِ زمانہ کے ساتھ اس کے تاروں کی تعداد میں اضافہ ہوگیا اور اس میں بیسیوں تار اور طربیں لگ گئے۔ ایک تونبہ اور گز سوا گز کی ڈانڈ ہوتی ہے جس میں سروں کے فاصلوں کے حساب سے پردے بندھے ہوتے ہیں۔ تار کا نکاؤ بائیں ہاتھ کی انگلیوں سے پردوں پر ہوتا ہے اور دائیں ہاتھ کی انگشت میں مضراب پہن کر باج کے تار پر ضرب لگائی جاتی ہے۔ تار کے کھنچنے سے مینڈ پیدا کی جاتی ہے۔ مینڈ سے سروں کے نازک مقامات ادا کیے جاتے ہیں۔

رباب: قد و قامت میں سارنگی کے برابر ہوتا ہے مسلمانوں کے ساتھ اس سرزمین پر آیا۔ اسی کا نام سرود بھی ہے جسکی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ شروع شروع میں رودے کے تین تار ہوتے تھے۔ یوں اس کا نام ''سہ رود'' پڑا۔ اب سرود میں فولاد کے تار ہوتے ہیں اور رباب میں رودے کے۔

طبلہ: ہندوستان کا قدیم تال کا ساز پکھاوج ہے۔ جو ڈھولک کی شکل کا ہوتا ہے۔ روایت ہے کہ امیر خسرو نے پکھاوج کو بیچ میں سے کاٹ کر دو ٹکڑے کر لیے اور دایاں اور بایاں الگ الگ بنا دیئے۔ دایاں سُر میں ملایا جاتا ہے اسی وجہ سے اس کے تسموں میں لکڑی کے گٹے لگائے گئے ہیں۔ انہیں سے طبلے کے آٹھوں گھاٹ ایک سُر میں ملائے جاتے ہیں۔ طبلہ تال کا ساز ہے، گویا گانے بجانے کی میزان ہے۔ اس کے بول پکھاوج، ڈھولک تاشے وغیرہ سے الگ ہوتے ہیں۔

ڈھولک: قوالوں کا ساز ہے۔ اس کی آواز اور بول طبلے سے الگ ہوتے ہیں۔ اس میں پکھاوج یا طبلے کی طرح گٹے نہیں ہوتے۔ ڈوریوں میں چھلے ہوتے ہیں جن سے ڈھولک کو چڑھایا اتارا جاتا ہے۔ بائیں ہاتھ کی پڑی میں گدا ہوتا ہے جس کی وجہ سے گونج پیدا ہوتی ہے۔

بانسری: ہر ملک میں قدیم سے بجتی چلی آ رہی ہے، اس کی مختلف شکلیں ہیں۔

ہندوستان میں کرشن مرلی نے شہرت پائی۔ مغرب کے علم الاصنام میں جنگل کے دیوتا PAN نے بانسری بجائی۔ مولانا روم نے......

بشنواز نے چوں حکایت می کند
از جدائی ہا شکایت می کند

.....کہہ کر ''نے'' کو لافانی شہرت دے دی۔ بانسری بانس یا دھات یا ابونائیٹ کی بنائی جاتی ہے۔ اس میں بالعموم چھ سوراخ ہوتے ہیں جن پر انگلیاں رکھی اور ہٹائی جاتی ہیں۔ شہنائی، نفیری، قرنا، سرنا، بوق، کلارنٹ وغیرہ سب اس کی مختلف شکلیں ہیں۔

کلارنٹ: مغرب کی ترقی یافتہ بڑی بانسری ہے، اس میں سوراخ بھی ہوتے ہیں اور چابیاں بھی۔ ایک ہی کلارنٹ کھرج کے سروں میں بھی بجائی جاسکتی ہے اور ٹیپ کے سروں میں بھی۔ اس میں بانس کی پتی mouth piece میں لگائی جاتی ہے۔ جس کے اہتزاز سے آواز پیدا ہوتی ہے۔ سوراخوں اور چابیوں سے سُر متعین کیے جاتے ہیں۔

کارنٹ: ایک چھوٹا سا پیتلی باجہ ہے۔ بگل کی شکل کا۔ اس میں صرف تین چابیاں ہوتی ہیں جن میں اسپرنگ لگے ہوتے ہیں۔ ان تین چابیوں ہی سے سارے سُر ادا کیے جاتے ہیں۔ ہر چابی سے کئی کئی سر پیدا ہوتے ہیں۔ چابی کو جتنا کم یا زیادہ دبایا جائے اتنا ہی سُر اُترتا یا چڑھتا ہے۔ کلارنٹ کی طرح کارنٹ بھی مغربی آرکسٹرا کا ساز ہے جو اَب ہمارے سازینے میں بھی شامل ہوگیا ہے۔

○○

افسانہ و افسوں

دِیوار

ــ ژاں پال سارتر
ترجمہ : شاھد احمد دھلوی

انہوں نے ہمیں ایک بڑے سے سفید رنگ کے کمرے میں دھکیل دیا۔ میری آنکھیں چندھیانے لگیں۔ روشنی سے ان میں چکا چوند ہو رہی تھی۔ جب آنکھیں ذرا ٹھیک ہوئیں تو مجھے ایک میز نظر آئی۔ اس کے چاروں طرف چار آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ یہ آدمی فوجی نہیں تھے۔ سب کے سب کچھ کاغذات دیکھ رہے تھے۔ دوسرے قیدیوں کو پیچھے کی طرف کھڑا کیا گیا تھا اور ان تک پہنچنے کے لیے ہمیں پورے کمرے میں سے گزرنا پڑا۔ ان میں سے کئی ایسے تھے جنہیں میں جانتا تھا۔ باقی نہ جانے کون تھے۔ میرے سامنے جو دو قیدی تھے ان کے رنگ اُجلے اور سر گول تھے۔ ایک دوسرے سے بہت مشابہ۔ غالبًا یہ فرانسیسی تھے۔ ان میں جو چھوٹا تھا، بار بار گھبرا کر اپنا پاجامہ اوپر کو کھینچتا تھا۔

تین گھنٹے تک کارروائی ہوتی رہی۔ میں بے دم ہو رہا تھا اور میرا سر خالی خالی سا ہو گیا تھا۔ یہ کمرہ خوب گرم تھا اور مجھے اچھا لگ رہا تھا۔ کیونکہ چوبیس گھنٹے ہم سردی سے کانپتے رہے تھے۔

قیدیوں کے نگراں ایک ایک کر کے قیدی کو میز کے آگے لاتے اور وہ چاروں آدمی ان کا نام اور کام پوچھتے۔ کام کم اور وقت زیادہ ضائع ہو رہا تھا۔ کبھی کچھ پوچھ لیا کبھی کچھ۔ ''کبھی تمنے کسی اسلحہ ساز کارخانے کو برباد کیا؟'' یا ''۹ تاریخ کی صبح کو تم کہاں

تھے اور کیا کر رہے تھے؟''

جواب یا تو وہ سنتے ہی نہیں تھے یا یہ ظاہر نہیں کرتے تھے کہ سن رہے ہیں۔اک ذرا خاموش ہو کر سامنے تکتے اور پھر کچھ لکھنے لگتے۔ ٹام سے انہوں نے پوچھا۔''تم نے بین الاقوامی دستے میں شرکت کی ہے۔کیا یہ سچ ہے؟'' ٹام اِس سے اِنکار نہیں کر سکتا تھا، کیونکہ تلاشی کے وقت اُس کی جیب سے کاغذات برآمد ہو چکے تھے۔جوان سے اُنہوں نے کچھ بھی دریافت نہیں کیا۔اس کا نام پکارنے کے بعد وہ دیر تک لکھتے رہے۔

جوان بولا۔''وہ میرا بھائی جوز ہے جو انقلابی ہے۔آپ کو بخوبی علم ہے کہ وہ یہاں اب نہیں ہے۔ میں کسی پارٹی سے تعلق نہیں رکھتا۔ مجھے سیاسیات سے کبھی دلچسپی نہیں رہی۔'' انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ جوان نے پھر بولنا شروع کر دیا۔''میں نے کچھ نہیں کیا۔دوسروں کی سزا میں بھگتنا نہیں چاہتا۔''

اس کے ہونٹ کانپنے لگے۔ایک محافظ نے اُسے چپ کرا دیا۔اب میری باری آئی۔

''تمہارا نام پابلو ابی امی ٹا ہے؟''

میں نے کہا۔''جی ہاں۔''

اس شخص نے کاغذات کو دیکھا اور پھر مجھ سے پوچھا۔''رامن گرس کہاں ہے؟''

''مجھے نہیں معلوم۔''

''تم نے ۶ر تاریخ سے ۱۹ر تاریخ تک اُسے اپنے گھر میں چھپائے رکھا۔''

''نہیں۔''

پھر انہوں نے کچھ لکھا اور محافظ مجھے باہر لے گئے۔گلیارے میں ٹام اور جوان دو محافظوں کے بیچ میں کھڑے تھے۔ہم سب مل کر چل پڑے۔

ٹام نے ان میں سے ایک سے پوچھا۔''اب کیا ہوگا؟''

محافظ نے پوچھا۔''کیا؟''

''یہ کوئی تحقیقات تھی یا مقدمہ؟''

محافظ نے کہا۔''یہ مقدمہ تھا۔''

''ہمارا اب کیا ہوگا؟''

محافظ نے رکھائی سے جواب دیا۔ ''اپنی اپنی کوٹھری میں تمہیں تمہارا فیصلہ سنا دیا جائے گا۔''

ہماری جو کوٹھری تھی وہ دراصل ایک اسپتال کا تہہ خانہ تھا۔ یہاں بڑی سردی تھی اور سرد ہوا کے جھونکے اس میں بہت آتے تھے۔ ساری رات ہم کانپتے رہے۔ دن کو بھی سردی کم نہ ہوئی۔ میں نے پچھلے پانچ دن ایک گرجا کے تہہ خانے میں گزارے تھے۔ یہ ایک طرح کا مجسمہ تھا، پرانے زمانے کا۔ وہاں قیدی بہت سارے تھے اور جگہ کم تھی۔ اس لیے جہاں جگہ ہوتی وہیں انہیں بند کر دیا جاتا تھا۔ مجھے اس میں قید ہونے کا غم نہیں تھا۔ سردی نے مجھ پر زیادہ اثر نہیں کیا تھا مگر تنہائی نے مار لیا تھا۔ گلیارا لمبا اور اجیرن تھا۔ اس تہہ خانے میں ساتھی بھی تھے۔ جواُن کو تو چپ لگ گئی تھی۔ وہ سہا ہوا تھا اور ابھی اس کی عمر ہی کیا تھی، جو اسے کچھ کہنا سننا آتا۔ مگر ٹام اچھا ساتھی تھا اور ہسپانوی زبان خوب بولتا تھا۔

تہہ خانے میں ایک بنچ تھی اور چار چٹائیاں۔ جب ہمیں یہاں واپس لایا گیا تو ہم خاموشی سے بیٹھ کر انتظار کرتے رہے۔

چند لمحے بعد ٹام بولا۔ ''ہم سب تو ختم ہوئے۔''

میں نے کہا۔ ''مجھے بھی یہی معلوم ہوتا ہے۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ بچّے کے ساتھ کچھ نہیں ہوگا۔''

ٹام بولا۔ ''اس کے خلاف تو کوئی بات ہے نہیں۔ بس یہی ہے کہ وہ ایک فوجی کا بھائی ہے۔''

میں نے جواُن کی طرف دیکھا۔ وہ اس طرح بیٹھا تھا جیسے اس نے کچھ سنا ہی نہیں۔

ٹام نے پھر کہا۔ ''تمہیں معلوم ہے۔ سارا گوسا میں یہ کیا کر رہے ہیں؟ قیدیوں کو سڑکوں پر لٹا کر ان پر لاریاں چلاتے ہیں۔ یہ بات ایک مراقشی فراری نے بتائی۔ وہ کہتے ہیں کہ اس میں گولہ بارود کی کفایت رہتی ہے۔''

مجھے ٹام کی یہ بات کچھ بُری لگی۔ ایسی بات کہنے کا کیا موقع تھا؟ میں نے جل کر کہا۔ ''مگر پٹرول کی بچت تو نہیں ہوتی۔''

ٹام نے پھر کہنا شروع کر دیا۔ ''وہاں سڑکوں پر اس کام کی نگرانی کے لیے افسر منہ میں سگریٹ دبائے اور جیبوں میں ہاتھ ڈالے ٹہلتے رہتے ہیں۔ تم سوچتے ہو گے کہ جو قیدی زندہ رہ جاتے ہیں، انہیں یہ افسر مار ڈالتے ہوں گے۔ نہیں، ایسا نہیں ہوتا۔ زخمیوں کو یونہی چھوڑ دیا جاتا ہے۔ گھنٹوں وہ پڑے چیخا کرتے ہیں۔ عراقشی کہہ رہا تھا۔ ''جب میں نے پہلی دفعہ یہ بات دیکھی تو میری ہمت نے جواب دے دیا۔''

میں نے کہا۔ ''مگر یہ حرکت وہ یہاں نہیں کریں گے۔ اگر گولہ بارود ہی کم ہو تو اور بات ہے۔''

تہہ خانے میں روشنی چار موکھوں میں سے آتی تھی اور بائیں طرف چھت میں ایک گول روشن دان تھا جس میں سے آسمان نظر آتا تھا۔ اس پر ایک تختہ لگا ہوا تھا۔ یہ اصل میں کوئلہ اندر ڈالنے کی کھڑکی تھی۔ عین اس کھڑکی کے نیچے کوئلے کی خاک کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ اس کوئلے کا مقصد اصل میں اسپتال کو گرم رکھنا تھا۔ مگر جب سے لڑائی چھڑی تھی مریض یہاں سے ہٹا دیئے گئے تھے۔ کوئلہ یونہی پڑا رہ گیا۔ کھڑکی کھلی رہ گئی اور بارش کے ساتھ اندر پانی بھی آتا رہا اور کوئلہ بھیگتا رہا۔

ٹام نے کانپنا شروع کر دیا۔ بولا۔ ''یا اللہ! میں تو جما جا رہا ہوں۔ سردی نے پھر کھانا شروع کر دیا۔''

وہ اُٹھ کھڑا ہوا اور ہاتھ پاؤں ہلانے کی ورزشیں کرنے لگا۔ ہاتھ کے ہر جھکولے کے ساتھ سفید بالوں بھرے سینے پر سے اس کی قمیص کھل جاتی۔ پھر وہ چت لیٹ گیا اور ٹانگیں اونچی کر کے قینچی کی ورزش کرنے لگا۔ اس کا دھڑ کانپ رہا تھا۔ ٹام مضبوط آدمی تھا مگر موٹا بہت تھا۔ مجھے معاً ان گولیوں اور سنگینوں کا خیال آیا جو اس نرم گوشت کے ڈھیر میں جلد ہی داخل ہونے والی تھیں۔ اگر وہ دبلا ہوتا تو شاید مجھے اِتنا شدید احساس نہ ہوتا۔

سردی سے میں جما تو نہیں تھا مگر نہ تو اپنے کندھے ہلا سکتا تھا اور نہ ہاتھ۔ رہ رہ کر مجھے محسوس ہوتا تھا کہ میرا کچھ کھو گیا ہے اور میں نے چاروں طرف نظر دوڑائی کہ میرا کوٹ کہاں ہے؟ اور پھر یکا یک خیال آیا کہ انہوں نے ہمیں کوٹ دیا ہی کب تھا۔ مصیبت یہ تھی کہ انہوں نے ہمارے کپڑے لے کر اپنے فوجیوں کے دے دیئے تھے۔ ہمارے پاس صرف اپنی قمیصیں تھیں۔ یا وہ سوتی پاجامے جو مریضوں کو گرمیوں میں پہنائے جاتے ہیں۔ کچھ دیر کے بعد ٹام اٹھ کر بیٹھ گیا اور میرے پاس آ کر ہانپنے لگا۔

''کچھ گرمی آئی؟''

''یا اللہ! کچھ بھی نہیں۔ سانس الگ بے قابو ہو گیا۔''

شام کو کوئی آٹھ بجے ایک افسر آیا اور اس کے ساتھ دو اور آدمی تھے۔ اس کے ہاتھ میں ایک کاغذ تھا۔ پہرہ دار سے اس نے پوچھا۔ ''ان تینوں کے کیا نام ہیں؟''

پہرہ دار نے کہا۔ ''استین باک، ابی ای ٹا اور میر بل۔''

افسر نے آنکھ سے چشمہ لگایا اور فہرست دیکھنے لگا۔

'استین باک، استین باک۔ یہ رہا، تمہیں موت کی سزا دی گئی ہے۔ کل صبح تمہیں گولی مار دی جائے گی۔''

یہ کہہ کر اس نے پھر فہرست دیکھنی شروع کر دی اور بولا۔ ''باقی دونوں کو بھی۔''

جوان نے گھبرا کر کہا۔ ''یہ نہیں ہو سکتا، مجھے نہیں۔''

افسر نے تعجب سے اس کی طرف دیکھا۔

''تمہارا کیا نام ہے؟''

''جوان میر بل۔''

افسر نے کہا۔ ''ٹھیک ہے۔ تمہارا نام بھی ہے۔ تمہیں موت کی سزا ملی ہے۔''

جوان نے کہا۔ ''مگر میں نے تو کچھ بھی نہیں کیا۔''

افسر نے کندھے اُچکائے اور ٹام اور میری طرف پلٹ کر بولا۔ ''کیا تم باسک ہو؟''

''باسک کوئی نہیں ہے۔''

افسر کو تاؤ آ گیا۔ انہوں نے مجھ سے کہا۔ ''یہاں تین باسک ہیں۔ ان کے پیچھے کہاں کہاں بھاگتا پھروں؟ تو ظاہر ہے کہ تمہیں پادری کی ضرورت نہیں ہوگی۔''

ہم نے اسے جواب دینے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ وہ بولا۔ ''ایک بلجین تھوڑی دیر میں آئے گا۔ اسے اجازت دے دی گئی ہے کہ رات تمہارے ساتھ گزارے۔'' افسر نے فوجی سلام مارا اور باہر چلا گیا۔

ٹام بولا۔ ''دیکھا، میں نے تم سے کیا کہا تھا؟ نرم دل ہیں یہ لوگ۔''

میں نے کہا۔ ''ہاں، مگر بچّے کے لیے بہت بُرا ہوا۔''

میں نے یہ بات از راہِ انصاف کہی تھی۔ بچے سے مجھے محبت نہیں تھی۔ اس کا چہرہ بہت سکڑا ہوا، نقش مڑے تڑے اور خوف و اذیت سے بدنما ہوگئے تھے۔ ابھی تین دن پہلے وہ بچہ ہی تھا اور بچوں ہی جیسی باتوں سے لبھایا کرتا تھا۔ مگر اب تو سترا بہترا نظر آتا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ اب وہ کمسن کبھی نہ دکھائی دے گا۔ چاہے اسے چھوڑ ہی کیوں نہ دیا جائے۔ میں چاہتا تھا کہ مجھے اس پر ترس آئے لیکن ترس کھانے سے مجھے نفرت ہوتی ہے۔ مجھے ترس کے نام سے ڈر لگتا ہے۔ وہ اور کچھ نہ بولا۔ بس سفید پڑ گیا۔ اس کے ہاتھ اور چہرہ دھوئے ہوئے کپڑے کی طرح سفید پڑ گئے۔ وہ پھر بیٹھ گیا اور پھٹے پھٹے دیدوں سے زمین کو گھورنے لگا۔ ٹام سلیقے کا آدمی تھا۔ اس نے بچے کا بازو اپنے ہاتھ میں لینا چاہا تو اس نے زور سے جھٹک دیا اور عجیب طرح کا منہ بنایا۔

میں نے چپکے سے کہا۔ ''رہنے دو اسے۔ دیکھتے نہیں وہ اب پھوٹنے ہی والا ہے۔''

ٹام نے بادلِ ناخواستہ علیحدگی اختیار کی۔ وہ تو چاہتا تھا کہ بچے کو دلاسا دے۔ اس طرح اس کا اپنا بھی کچھ وقت گزر جاتا اور اپنی زبوں حالی پر غور کرنے سے بھی بچا رہتا۔ مگر مجھے اس سے کوفت ہو رہی تھی۔ میں نے کبھی مرنے پر غور ہی نہیں کیا تھا۔ کبھی ایسا اتفاق ہی نہیں ہوا۔ مگر اب وقت آ پہنچا تھا اور اب کچھ اور کرنا بھی کیا تھا؟

ٹام نے بولنا شروع کر دیا۔ مجھ سے پوچھنے لگا۔ ''تم نے بھی کسی کو ٹھکانے لگایا؟''

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔

اس نے مجھے بتانا شروع کر دیا۔ ''جب سے اگست شروع ہوا ہے میں نے چھ آدمی مارے ہیں۔'' یہ اسے ٹھیک یاد نہیں رہا تھا کہ کس کس جگہ۔ میں دیکھ رہا تھا کہ وہ جان بوجھ کر یاد نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں نے خود کبھی اس کی اہمیت کو نہیں سمجھا۔ شاید بڑی اذیت ہوتی ہو۔ مجھے گولیوں کا خیال آیا اور اس جلتی ہوئی بوچھاڑ کا جو میرے جسم کو توڑ کر گزر جائے گی۔ یہ سب باتیں اصل سوال کے دائرے سے خارج تھیں۔ مجھے سکون سا تھا۔ سوچنے سمجھنے کے لیے ہمارے پاس پہاڑ سی رات باقی تھی۔ ٹام نے بولنا بند کر دیا۔ میں نے کن انکھیوں سے اس کی طرف دیکھا تو دیکھا کہ وہ بھی سفید پڑ گیا ہے اور بڑا بیزار دکھائی دے رہا ہے۔ میں نے دِل میں کہا۔ ''شروع ہو گیا کام۔''

اب رات ہو چکی تھی اور سوراخوں سے جو روشنی آ رہی تھی کوئلے کے ڈھیر سے مل کر کالا چکتّا بنا رہی تھی۔ چھت کی کھڑکی میں سے مجھے ایک تارا بھی دکھائی دیا۔ رات صاف اور جمانے دینے والی ہوگی۔ دروازہ کھلا اور پہرے دار اندر آئے۔ ان کے پیچھے پیچھے ایک اُجلے رنگ کا آدمی گلابی خاکی وردی پہنے ہوئے تھا۔ انہوں نے سلام کیا۔

وہ بولا ''میں ڈاکٹر ہوں۔ ان تکلیف دہ حالات میں مجھے اختیار دیا گیا ہے کہ آپ کی اذیت کم کرنے میں مدد دوں۔'' اس کی آواز خوشگوار اور شائستہ تھی۔

میں نے اس سے پوچھا۔ ''آپ یہاں کیا کرنے آئے ہیں؟''

''میں ہر طرح آپ کی خدمت کے لیے حاضر ہوں۔ ان آخری ساعتوں کی اذیت کو آپ کے لیے کم کرنے کی ہر ممکن کوشش کروں گا۔''

''آپ ہمارے پاس کیوں آئے ہیں؟ بے شمار اور آدمی پڑے ہیں — ہسپتال ان سے پٹا پڑا ہے۔''

اس نے بے سوچے سمجھے جواب دیا۔ ''انہوں نے مجھے یہاں بھیجا ہے۔'' پھر جلدی سے کہنے لگا۔ ''اچھا تم سگریٹ پینا چاہتے ہو؟ میرے پاس سگریٹ ہیں بلکہ سگار بھی ہیں۔''

اس نے ہمیں انگریزی سگریٹ دیے اور سگار بھی مگر ہم نے لینے سے انکار

کر دیا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا اور وہ کچھ پریشان سا ہو گیا۔

میں نے اس سے کہا۔ ''آپ یہاں ترس کھا کر تو آئے نہیں ہیں۔ اس کے علاوہ میں آپ کو جانتا بھی ہوں۔ جس دن میں گرفتار ہوا بارکوں کے آگے صحن میں آپ کو میں نے فاشسٹوں کے ساتھ دیکھا تھا۔'' میں ابھی بولے جا رہا تھا کہ ایکا ایکی کچھ ایسی بات ہوئی کہ جس نے مجھے متعجب کر دیا۔ اس ڈاکٹر کی موجودگی سے میری دلچسپی ایک دم ختم ہوگئی۔ بالعموم جب میں کسی کے سر ہو جاتا ہوں تو پھر مشکل ہی سے اُس کا پیچھا چھوڑتا ہوں۔ بہر حال اس وقت بات کرنے کی خواہش بالکل معدوم ہو چکی تھی۔ میں نے کندھوں کو اُچکا کر دوسری طرف دیکھنا شروع کر دیا۔ کچھ دیر بعد پھر اُدھر دیکھا۔ ڈاکٹر میری طرف عجیب عجیب نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ پہرہ دار ایک چٹائی پر بیٹھ گئے۔ دبلا، پیڈرو اپنے انگوٹھوں کو گھما رہا تھا۔ دوسرا پہرے دار بار بار اپنے سر کو جھٹکا دیتا تھا کہ کہیں نیند نہ آ جائے۔

پیڈرو نے ڈاکٹر سے پوچھا۔ ''کیا آپ کے لیے روشنی لاؤں؟''

اس نے سر ہلا دیا۔ میں جانتا تھا کہ وہ نرا کاٹھ کا اُلو ہے۔ لیکن بدفطرت نہیں ہے۔ اس کی اُبلی ہوئی نیلی آنکھوں سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ جو کچھ بھی برائی کرتا ہے محض عقل کی کمی کی وجہ سے کرتا ہے۔ پیڈرو باہر گیا اور ایک تیل کا لیمپ لیے واپس آیا۔ لیمپ اس نے بنچ کے سرے پر رکھ دیا۔ روشنی تو وہ کچھ دیتا نہ تھا۔ مگر نہ ہونے سے بہتر تھا۔ کل ساری رات ہم اندھیرے ہی میں رہے تھے۔

میں کچھ دیر تک چھت میں روشنی کے اس حلقے کو دیکھتا رہا جو لیمپ کی چمنی نے بنایا تھا۔ مجھے بڑا لطف آیا۔ پھر یکایک میں چونک پڑا۔ روشنی کا حلقہ غائب ہو گیا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ مجھ پر ہزاروں من وزن رکھا ہوا ہے اور میں کچلا چلا جا رہا تھا۔ یہ موت کا خوف نہیں تھا، دہشت بھی نہیں۔ اس کا کوئی نام ہی نہیں تھا۔ گال جل رہے تھے اور سر درد سے پھٹا جا رہا تھا۔

میں نے اپنے آپ کو بدقت جنبش دی اور اپنے دونوں ساتھیوں کی طرف دیکھا۔

ٹام اپنے دونوں ہاتھوں میں سر چھپائے ہوئے تھا۔ مجھے صرف اس کی سفید موٹی گدی دکھائی دے رہی تھی۔ چھوٹا جوان زیادہ بدحال تھا۔ اس کا منہ کھلا ہوا تھا اور نتھنے پھڑک رہے تھے۔ ڈاکٹر اس کے پاس گیا اور اسے تسلی دینے کے لیے کندھے پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

مگر اس کی آنکھیں ویسی ہی سرد رہیں۔ پھر میں نے دیکھا کہ بلجیین کا ہاتھ آہستہ آہستہ جوان کے کندھے پر سے پھسل کر بانہہ پر آیا اور پھر کلائی پر پہنچا۔ جوان نے کوئی توجہ نہ کی اور چپکا ہی رہا۔ جلدی سے ڈاکٹر نے تین انگلیاں اس کی کلائی پر جمائیں۔ پھر ذرا سا پیچھے ہٹا تاکہ میری طرف اس کی پیٹھ ہو جائے۔ لیکن میں نے آگے جھک کر دیکھا کہ اس نے جیب میں سے گھڑی نکال کر دیکھی اور پھر بچے کی کلائی کو چھوڑ دیا۔

بے جان ہاتھ چھوڑ کر وہ پھر دیوار سے جا لگا۔ پھر جیسے اسے کوئی بڑی ضروری بات ایکا ایکی یاد آ گئی ہو۔ اس نے اپنی نوٹ بک نکالی اور اس میں کچھ لکھ لیا۔

مجھے بڑا غصہ آیا۔ حرام زادہ! اگر میری نبض دیکھنے آیا تو ایسا گھونسہ رسید کروں گا کہ یاد رکھے گا۔

وہ میرے نزدیک آیا تو نہیں مگر مجھے محسوس ہوتا رہا کہ وہ مجھے دیکھ رہا ہے۔

میں نے نظریں اٹھا کر سیدھی اس کے چہرے پر گاڑ دیں۔

غیر انسانی سی آواز میں اُس نے کہا۔ ''تمہیں سردی نہیں لگ رہی؟''

اُسے سردی لگ رہی تھی اور اس کا رنگ نیلا ہو رہا تھا۔

میں نے کہا۔ ''نہیں مجھے سردی نہیں لگ رہی۔''

اس نے میری طرف دیکھنا بند نہیں کیا۔ میں جلد ہی سمجھ گیا اور میں نے اپنا منہ دونوں ہاتھوں میں چھپا لیا۔ میں پسینے میں نہا رہا تھا۔ اس تہہ خانے میں، اس کڑکتے جاڑے میں، برفیلی ہواؤں کے جھونکوں میں، مجھے پسینہ آ رہا تھا! میں نے سر کے بالوں میں انگلیاں دوڑائیں۔ پسینے سے بال گیلے ہو رہے تھے۔ اسی وقت میں نے دیکھا کہ میری قمیض بھیگ کر جسم سے چپک گئی ہے۔ کم از کم ایک گھنٹے سے پسینہ نچڑ رہا تھا اور مجھے کچھ بھی خبر نہ تھی لیکن بلجیین جانور نے خوب تاڑ لیا تھا۔ اس نے میرے گالوں پر قطرے

لڑھکتے دیکھ لیے تھے اور سوچتا ہوگا کہ یہ تو انتہائی خوف کی علامت ہے اور اسے خودسردی لگ رہی تھی جو صحت اور تندرستی کی علامت ہے۔ یہ سوچ کر ڈاکٹر کو بڑا ناز اور فخر محسوس ہوا ہوگا۔ جی میں آئی کہ اٹھ کر اس کا منہ توڑ دوں۔ مگر میں نے اس ارادے سے ابھی حرکت بھی نہیں کی تھی کہ میری خفت اور غصہ دونوں غائب ہوگئے۔ میں بینچ پر بے توجہی سے پھر بیٹھ گیا اور اپنی گردن پر رومال سے پسینہ پوچھنے لگا۔ کیونکہ پسینہ اب بالوں میں بہہ بہہ کر گدی پر آرہا تھا اور بڑا گھناؤنا معلوم ہورہا تھا۔ میں نے پونچھنا بند کردیا۔ کیونکہ بیکار ثابت ہورہا تھا۔ میرے کولھوں پر بھی پسینہ بہہ رہا تھا اور پاجامہ بینچ سے چپک رہا تھا۔

کم عمر جواُن ایک دم سے بولا۔ ''کیا تم ڈاکٹر ہو؟''

بلجیین نے کہا۔ ''ہاں۔''

''کیا بہت...... بہت دیر تک تکلیف ہوتی ہے؟''

بلجیین نے بڑی شفقت سے پوچھا۔ ''کب......؟ نہیں، جلدی ہی ختم ہوجاتی ہے۔''

ایسا معلوم ہورہا تھا جیسے کسی بیمار کو دلاسا دے رہا ہو۔

''مگر مجھے...... مجھے کسی نے بتایا تھا...... بعض دفعہ باڑھ دو دفعہ مارنی پڑتی ہے۔''

بلجیین نے کندھے اُچکا کر کہا۔ ''کبھی کبھی۔ ایسا ہوجاتا ہے بعض دفعہ کہ پہلی باڑھ میں سارے اعضائے رئیسہ بچ جائیں اور آدمی نہ مرے۔''

جوان نے کہا۔ ''تو وہ اپنی بندوقیں دوبارہ بھرتے ہوں گے اور پھر نشانہ لگاتے ہوں گے؟'' ایک لمحہ سوچ کر خشک آواز میں پھر بولا۔ ''اس میں تو کچھ دیر لگتی ہوگی۔''

اسے تکلیف کا بے حد خوف تھا اور لے دے کر یہی خیال بار بار اسے ستا رہا تھا۔ یہ احساس محض اس کے بچپن کی وجہ سے تھا۔ مجھے اس کا زیادہ خیال نہیں تھا اور یہ کوئی خوف کی وجہ نہیں تھی کہ مجھے اس قدر پسینہ آرہا تھا۔

میں اُٹھا اور کوئلے کی خاک کے ڈھیر تک چلا گیا۔ ٹام چونکا اور اس نے مجھے نفرت کی نگاہوں سے دیکھا۔ میرا جوتا چرچراتا تھا، اس سے اسے طیش آیا۔ میں سوچ رہا تھا کہ کہیں میرا چہرہ بھی ایسا ہی خوف زدہ تو نہیں ہورہا جیسا کہ ٹام کا؟ میں نے دیکھا کہ

اس کے بھی پسینے چھوٹ رہے تھے۔ آسمان بالکل صاف پڑا تھا۔ اس کونے میں روشنی بالکل نہیں تھی۔ ذرا سر اوپر کو اٹھایا اور سات ستاروں کا جھمکا دکھائی دیا۔ لیکن یہ اب ویسا نہیں دکھائی دیتا تھا اور ہر گھڑی بھولی بسری باتیں یاد آتی رہتی تھیں۔ جب صبح ہوئی اور آسمان نیلا اور سخت نظر آنے لگا تو مجھے اٹلانٹک کے ساحل یاد آئے۔ دوپہر کو میں نے سورج دیکھا اور مجھے سیول کا ایک میکدہ یاد آیا جہاں میں نے ''مانزانیلا'' پی اور زیتون کے پھل کھائے تھے۔ تیسرے پہر کو میں گہرے سائے میں تھا اور مجھے اُن اندھیرے سایوں کا خیال آیا جو روم کے اکھاڑوں پر اس طرح چھا جاتے ہیں کہ آدھے تو اندھیرے میں چھپ جاتے ہیں اور آدھے دھوپ میں جگمگاتے رہتے ہیں۔ ساری دُنیا کو اس طرح آسمان میں منعکس دیکھنا خاصا تکلیف دہ ثابت ہوا۔ مگر اب میں جتنا بھی چاہوں، آسمان کو تکتا رہوں۔ میرے لیے آسمان کے کوئی معنی نہیں رہے تھے۔ اس حالت میں ہی آسمان بہتر تھا۔ میں جا کر ٹام کے قریب بیٹھ گیا...... تھوڑا سا وقت اور گزر گیا۔

ٹام نے نیچی آواز میں بولنا شروع کیا۔ اسے ہمیشہ ہی بولنا پڑتا تھا۔ ورنہ اس کے خیالات تمام گڈمڈ ہو جاتے تھے۔ میں سمجھا کہ مجھ سے کہہ رہا ہے۔ مگر وہ میری طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔ یقیناً وہ مجھ سے ڈر رہا تھا کہ کہیں مجھے دیکھ نہ لے۔ کیوں کہ میرا رنگ سفید پڑ گیا تھا اور پسینے بہہ رہے تھے۔ ہم سب ایک جیسے تھے اور چغلی کھانے میں آئینہ سے بھی بدتر تھے۔ اس نے بلجبین کی طرف دیکھا، یہی تو ایک شخص زندہ تھا۔

''کیا تمہاری سمجھ میں آتا ہے؟ میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آ رہا۔''

میں نے بھی چپکے چپکے بولنا شروع کر دیا۔ پھر بلجبین کی طرف دیکھا۔

''کیا بات ہے؟''

''ہمارے ساتھ کچھ ہونے والا ہے۔ کیا ہوگا؟ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔''

ٹام کے پاس سے ایک عجیب طرح کی بو آ رہی تھی۔ مجھے ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ میری قوتِ شامہ اتنی تیز کبھی بھی نہیں تھی جتنی کہ اس وقت۔ میں نے نفرت سے ناک چڑھائی۔

''تمہیں جلدی ہی معلوم ہو جائے گا۔''

ٹام نے ضدی پنے سے کہا۔'' کچھ صاف سمجھ میں نہیں آتا۔ میں آسانی سے بہادر بن سکتا ہوں مگر مجھے آخر معلوم تو ہو! سنو، وہ ہمیں احاطے میں لے جائیں گے۔ چلو ٹھیک ہے۔ وہ لوگ ہمارے سامنے قطار بنا کر کھڑے ہو جائیں گے۔ کتنے ہوں گے وہ؟''

''مجھے نہیں معلوم۔ پانچ یا آٹھ ہوں گے۔ زیادہ نہیں ہوں گے۔''

''چلو ٹھیک ہے۔ آٹھ ہوں گے۔ ان سے کہا جائے گا۔''نشانہ لو۔'' اور میں دیکھوں گا کہ آٹھ رائفلیں میری طرف اٹھ گئیں۔ سوچتا ہوں اس وقت جی یہی چاہے گا کہ دیوار پھٹ جائے اور میں اس میں سما جاؤں۔ میں اپنی پوری طاقت سے دیوار میں سما جانے کی کوشش کروں گا اور دیوار ایک کابوس کی طرح مجھے بے بس کر دے گی۔ یہ سب کچھ تو میرے تصور میں آتا ہے۔ کاش تم جان سکو کہ یہ سب باتیں کس آسانی سے میرے تصور میں آجاتی ہیں۔''

میں نے کہا۔''بس بھائی بس۔ تصور ہمارے پاس بھی ہے۔''

''بڑی سخت تکلیف ہوتی ہوگی۔ معلوم ہے تمہیں؟ شکل وصورت بگاڑنے کے لیے وہ آنکھوں اور منہ کا نشانہ لیتے ہیں۔''

مجھے زخموں کی موجودگی ابھی سے معلوم ہو رہی تھی۔ ایک گھنٹے سے میرے سر اور گردن میں درد ہو رہا تھا۔ سچ مچ کا درد نہیں۔ اس سے بھی بدتر۔ ایسا درد جس کو میں اگلے دن بھی محسوس کرتا رہا۔ اور اس کے بعد؟''

میں خوب سمجھ رہا تھا کہ اس کا مطلب کیا ہے، مگر میں ظاہر کر رہا تھا کہ جیسے کچھ بھی نہیں سمجھ رہا۔ رہا درد کا سوال تو میرے جسم میں جگہ جگہ درد تھا، جیسے چھوٹے چھوٹے کئی زخموں کا ڈھیر لگا ہوا ہو۔ اس کا کوئی مداوا میرے پاس نہیں تھا۔ لیکن ٹام کی طرح میں اسے کوئی اہمیت نہیں دیتا تھا۔

میں نے بگڑ کر کہا۔''اس کے بعد لالہ وگل اُگیں گے۔''

اُس نے پھر آپ ہی آپ بولنا شروع کر دیا۔ اس کی نظریں بلجین پر ہی جمی

ہوئی تھیں۔ ڈاکٹر معلوم ہوتا تھا کہ سن ہی نہیں رہا۔ مجھے معلوم تھا وہ کیا کرنے آیا ہے۔ کوئی نہ کوئی ایسی بات جس کا ہمیں خیال بھی نہیں ہوگا اس کی دلچسپی کا باعث بن جائے گی۔ وہ ہمارے جسموں کو دیکھنے آیا تھا۔ ان جسموں کو جو زندہ عذاب میں مبتلا تھے۔

ٹام نے کہا۔ ''یہ سب ایک کابوس ہے۔ میں جانتا ہوں کہ کسی بات کو سوچوں، احساس ہوتا ہے کہ میں نے اسے سوچ سمجھ لیا ہے اور اس کی حقیقت واضح ہوگئی ہے اور اتنے ہی میں وہ گرفت سے نکل جاتی ہے اور غائب ہو جاتی ہے۔ میں نے اپنے آپ سے کہا بعد میں کچھ بھی نہیں ہوگا۔ لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کے کیا معنیٰ ہیں۔ کبھی کبھی وہ لمحے بھی آجاتے ہیں جب معلوم ہوتا ہے کہ میں اس کی تہہ کو تب پہنچا کہ اب پہنچا...... مگر وہ اتنے ہی میں تحلیل ہو جاتی ہے۔ میں نے پھر تکلیف اور گولیوں اور دھماکوں پر غور کرنا شروع کر دیا۔ میں قسم کھاتا ہوں کہ میں مادہ پرست ہوں۔ میں دیوانہ نہیں ہونے کا۔ مگر کوئی کل بگڑی ہوئی ضرور ہے۔ میں اپنی لاش کو دیکھتا ہوں۔ یہ کوئی دشوار امر نہیں ہے۔ مگر یہ میں ہوں جو دیکھتا ہوں، خود اپنی آنکھوں سے۔ مجھے یہ سوچنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ یہ سوچنے کی کہ میں کوئی چیز بھی پھر نہیں دیکھ سکوں گا۔ کوئی بات پھر نہیں سن سکوں گا۔ لیکن دُنیا کا کارخانہ دوسروں کے لیے اسی طرح چلتا رہے گا۔ کسی کو اس ڈھنگ سے نہیں بتایا گیا کہ وہ اس طرح سوچے پابلو۔ تم میرا یقین کرو۔ ایسا پہلے بھی ہو چکا ہے۔ ساری ساری رات جاگ کر، کسی چیز کے انتظار میں۔ مگر وہ چیز اس کی طرح نہیں تھی۔ اس نے تو ہماری قوت ہی سلب کر لی پابلو اور ہم اپنے آپ کو تیار بھی نہیں کر سکے۔''

میں نے اس سے پوچھا۔ ''میں تمہارے لیے کسی پادری کو بلوا دوں تاکہ تم اپنے گناہوں کا اقرار کر کے پاک ہو جاؤ۔''

اس نے مجھے جواب نہیں دیا۔ میں نے دیکھا کہ وہ ولیوں کی طرح بے رنگ آواز میں بار بار میرا نام لینا چاہتا تھا۔ میں نے اس کا کچھ زیادہ خیال نہیں کیا۔ بالعموم سارے آئرش ایسے ہی ہوتے ہیں۔ مجھے کچھ موہوم سا خیال تھا کہ اس کے پاس سے پیشاب کا بھبکا آرہا ہے۔ حقیقت میں مجھے ٹام کے ساتھ کچھ زیادہ ہمدردی نہیں تھی اور

ہمدردی ہونے کی کوئی وجہ بھی نظر نہیں آتی تھی، کیونکہ ہم دونوں کو ایک ساتھ مرنا تھا اور لوگوں کے ساتھ ہمدردی کرنے کی نوعیت دوسری ہے۔ مثلاً رامن گرس کے ساتھ۔ مگر ٹام اور جوان کے ساتھ ہوتے ہوئے بھی میں اکیلا تھا۔ میں تنہائی کو ترجیح بھی دیتا تھا۔ رامن گرس کے ساتھ میں نرمی سے پیش آتا، لیکن اس وقت میں نہایت سنگ دل ہو رہا تھا اور سنگ دل ہی رہنا چاہتا تھا۔

وہ بے سوچے سمجھے بڑبڑاتا رہا۔ ظاہر ہے کہ وہ اس لیے بولے جا رہا تھا کہ سوچنے سے بچا رہے۔ فطری طور پر مجھے اس سے اتفاق تھا۔ جو کچھ وہ کہہ رہا تھا وہی میں بھی کہہ سکتا تھا۔ یوں مرنا فطری امر نہیں تھا، مگر چونکہ مجھے اب مرنا تھا۔ اس لیے کوئی چیز بھی مجھے فطری نہیں معلوم ہو رہی تھی۔ کوئلوں کا ڈھیر، بنچ، پیڈرو کا گندہ چہرہ۔ مجھے صرف اس بات سے چڑ ہو رہی تھی کہ مجھے بھی وہی سوچنا پڑ رہا تھا جو ٹام سوچ رہا تھا اور میں جانتا تھا کہ رات بھر، ہر پانچ منٹ بعد، ہم ایک ہی سی باتیں سوچتے رہیں گے، ایک ہی وقت میں اور ایک ہی ساتھ ہمارے پسینے چھوٹیں گے اور ہم کانپتے رہیں گے۔ میں نے کن انکھیوں سے اس کی طرف دیکھا اور یہ پہلا موقع تھا کہ اس میں تبدیلی دکھائی دی۔ موت اس کے منہ پر لکھی ہوئی تھی۔ میری خودداری کو ٹھیس لگی۔ ٹام کے ساتھ میں چوبیس گھنٹے سے تھا۔ میں نے اس کی باتیں سنی تھیں۔ اس سے باتیں کی تھیں۔ میں جانتا تھا کہ ہم دونوں میں کوئی مماثلت نہیں ہے۔ لیکن اب ہم دونوں بالکل ایسے تھے جیسے جڑواں بھائی۔ محض اس وجہ سے کہ ہم دونوں کو ایک ساتھ مرنا تھا۔ ٹام نے میری طرف دیکھے بغیر میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

''پابلو، معلوم نہیں...... معلوم نہیں وجود بالکل ہی ختم ہو جاتا ہے یا نہیں۔''

میں نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا اور کہا۔ ''ابے سور۔ ذرا اپنے نیچے تو دیکھ۔''

اس کے دونوں پاؤں کے بیچ میں تالاب سا بنا ہوا تھا اور پاجامہ میں سے قطرے ٹپک رہے تھے۔

بلجین قریب آیا اور بناوٹی توجہ سے پوچھنے لگا۔ ''کیا آپ کی طبیعت خراب ہے؟''

ٹام نے بدمزاجی سے کہا۔ ''میں نہیں جانتا یہ کیا ہے، مگر مجھے ڈر نہیں لگ رہا۔

میں قسم کھا کر کہتا ہوں مجھے ڈر نہیں لگ رہا۔''

بلجین نے اپنی کاپی میں کچھ لکھ لیا۔ ہم اسے دیکھتے رہے۔ کمسن جوان بھی اُسے دیکھتا رہا۔ ہم تینوں اس کی طرف اس لیے دیکھ رہے تھے کہ وہ زندہ تھا۔ اس کی حرکات وسکنات سب زندہ آدمیوں کی سی تھیں۔ تفکرات زندہ آدمیوں جیسے تھے۔ اس تہہ خانے میں وہ اسی طرح کانپ رہا تھا، جس طرح زندہ دل کو کانپنا چاہئے۔ اس کا جسم خوب بنا ہوا اور پوری طرح اس کے اختیار میں تھا۔ ہم تینوں— ہمیں اپنے تن بدن کا ہوش نہیں رہا تھا۔ یا کم از کم اس حد تک، جس حد تک بلجین کو تھا۔ میں نے بھی اپنے پاجامے کو ٹٹولنا چاہا تھا مگر میری ہمت نہ پڑی۔ میں نے بلجین کو اپنی ٹانگیں جھکاتے دیکھا۔ اپنے رگ پٹھوں پر اسے کامل اختیار تھا اور وہ یہ بھی سوچ سکتا تھا کہ کل کیا ہوگا۔ ہم تینوں، بے خون کے بھوت اسے تک رہے تھے اور خفاشوں کی طرح اس کا خون چوس رہے تھے۔

بلجین نے اس سلسلے کو یوں توڑا کہ کمسن جوان کے قریب گیا۔ کیا کسی طبی وجہ سے وہ جوان کی گردن چھو رہا تھا یا یہ کوئی ہمدردی کا جذبہ عود کر آیا تھا؟ اگر یہ مہربانی تھی تو ساری رات میں پہلی مرتبہ ظاہر ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھ نے جوان کے سر اور گلے کو چھوا۔ جوان اسے ویسے ہی گھورے گیا اور کچھ نہ بولا۔ پھر ایک دم سے اس نے بلجین کا ہاتھ اپنے ہاتھوں سے پکڑ لیا۔ ان سفید سوکھے ہوئے پنجوں میں ایک موٹے چربیلے ہاتھ کا ہونا ایسی کوئی دلچسپ چیز نہیں تھی۔ میں منتظر رہا کہ دیکھئے اب اور کیا ہوتا ہے اور ٹام بھی یہی سوچ رہا ہوگا لیکن بلجین اس کا کوئی مطلب نہیں نکال سکا۔ وہ مشفقانہ انداز سے مسکراتا رہا۔

ذرا سی دیر بعد جوان نے اس موٹے چربیلے ہاتھ کو اپنے منہ کی طرف کھینچا اور اسے کاٹنا چاہا۔ بلجین نے جلدی سے اپنا ہاتھ کھینچ کر چھڑا لیا اور الٹے پیروں پیچھے ہٹ کر پھر دیوار سے جا لگا۔ ایک لمحہ کے لیے اس نے ہم سب کی طرف خوف سے دیکھا۔ اسے یکایک خیال آیا ہوگا کہ ہم اس کی طرح کے آدمی نہیں ہیں۔ میں نے ہنسنا شروع کیا اور ایک محافظ چونک کر اٹھ کھڑا ہوا۔ دوسرا اس طرح سو رہا تھا کہ آنکھیں کھلی تھیں اور سفید

سفید دیدے دکھائی دے رہے تھے۔

میں ایک ہی وقت میں تھکا ہوا بھی تھا اور گھبرایا ہوا بھی۔ صبح کیا ہونے والا ہے یا مرنے کے بارے میں کچھ بھی سوچنا نہیں چاہتا تھا۔ اس سے کوئی فائدہ نہیں نکل سکتا تھا۔ ذہن میں الفاظ ہی الفاظ یا خلا ہی خلا آئے گا۔ کسی اور بات پر خیال جماتا تو مجھے بندوق کی نالیں یا رائفلیں اپنی طرف لگی ہوئی دکھائی دیتیں۔ بیسیوں ہی دفعہ میں نے اپنے آپ کو مرتے دیکھا اور ایک دفعہ تو ایسا معلوم ہوا کہ واقعی مجھے مار دیا گیا ہے۔ شاید میری آنکھ لگ گئی ہوگی۔ وہ مجھے دیوار کی جانب گھسیٹ کر لے جا رہے تھے اور میں ان سے کشمکش کر رہا تھا۔ میں ان سے معافی مانگ رہا تھا۔ میں گھبرا کر اٹھ بیٹھا اور میں نے بلجیین کی طرف دیکھا، کہیں ایسا تو نہیں ہوا کہ میں سوتے میں چیخنے لگا ہوں۔ مگر وہ کھڑا اپنی مونچھوں پر تاؤ دے رہا تھا۔ اس نے کوئی غیر معمولی بات نہیں دیکھی تھی۔ اگر میں چاہتا تو شاید تھوڑی دیر کے لیے سو جاتا۔ میں اڑتالیس گھنٹے سے جاگ رہا تھا۔ میرا پلیتھن نکل چکا تھا۔ زندگی کے دو گھنٹے کیوں ضائع کیے جائیں۔ صبح جب وہ مجھے آکر جگائیں گے تو نیند کے خمار میں مجھے ان کے پیچھے پیچھے گھسٹنا پڑے گا اور میں چوں کیے بغیر ڈھیر ہو جاؤں گا۔ یہ میں نہیں چاہتا تھا۔ کسی بے زبان جانور کی طرح میں مرنا نہیں چاہتا تھا۔ میں سمجھنا چاہتا تھا۔ اس کے علاوہ مجھے خوف تھا کہ سوتے میں کابوس کے دورے نہ پڑ جائیں۔ میں نے اٹھ کر ٹہلنا شروع کر دیا۔ دماغ کے خلا کو بھرنے کے لیے میں نے اپنی ساری زندگی کو یاد کرنا شروع کر دیا۔ پچھلی باتیں جوق در جوق اُبل پڑیں۔ اچھی بھی اور بری بھی۔ یا شاید آج پہلی دفعہ اچھے برے کی تخصیص پیدا ہوئی تھی۔ چہرے ہی چہرے یا کہانیاں ہی کہانیاں۔ ایک نئے بھرتی ہوئے نوجوان کا چہرہ دوبارہ دیکھا۔ یہ ویلنشیا میں مارا گیا تھا۔ مامون کا چہرہ دیکھا۔ رامن گراس کا چہرہ۔ اور پھر کہانیاں یاد آئیں۔ ۱۹۲۶ء میں کس طرح بے کار پھرتا رہا۔ کس قدر قریب تھا کہ میں بھوک سے مر جاؤں۔ وہ رات یاد آئی جو میں نے غرناطہ کے ساحل پر گزاری تھی۔ میں نے تین دن سے کھانا نہیں کھایا تھا اور مجھے سخت طیش آ رہا تھا۔ میں مرنا نہیں چاہتا تھا۔

اس پر مجھے ہنسی آئی۔ کتنی شدت سے میں مسرتوں، عورتوں اور آزادی کے پیچھے دوڑتا تھا! کیوں؟ میں ہسپانیہ کو آزاد کرانا چاہتا تھا۔ میں انقلابیوں کی جماعت میں شریک ہو گیا تھا۔ جگہ جگہ تقریریں کرتا پھرتا تھا۔ میں نے اس سب کچھ کو دین وایمان سمجھ رکھا تھا اور اپنے کو سمجھ لیا تھا کہ غیر فانی ہوں۔

اس لمحے میں مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میری ساری زندگی میرے سامنے آگئی ہے اور میں نے دل میں کہا۔ "یہ سب جھوٹ ہے۔" اس کی قدر و قیمت ہی کیا ہے۔ یہ تو ختم ہوگئی۔ تعجب ہوتا تھا کہ میں کیسے آوارہ پھرتا تھا اور لڑکیوں سے کیسے مذاق کرتا تھا۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ میں اس طرح مروں گا تو اٹھ کر پھلی بھی نہ پھوڑتا۔ میری زندگی میرے سامنے تھی، ختم شدہ — جیسے تھیلے میں بند ہو۔ لیکن اس کے اندر کی ہر چیز نا تمام تھی۔ تھوڑی دیر کے لیے میں نے اسے جانچنا چاہا۔ میں کہنا چاہتا تھا "آہا! کیسی حسین زندگی ہے!" مگر اسے جانچا ہی نہیں جا سکتا تھا۔ یہ تو صرف ایک ہیولیٰ تھا۔ ابدیت کی شاہراہ پر اپنے نشانِ راہ بنانے ہی میں میں نے اپنی ساری زندگی صرف کر دی تھی اور خاک بھی سمجھ میں نہیں آیا تھا — مجھے کسی بات کا افسوس نہیں تھا — بے شمار چیزیں تھیں جن کا افسوس کیا جا سکتا تھا۔ مثلاً شراب نوشی میں میرا منزا نیلا پینے کا ذوق یا قرطبہ کے قریب ایک چھوٹی سی کھاڑی میں نہانا۔ مگر موت نے سب کو غارت کر دیا تھا۔

بلجیین کے دماغ میں ایک دم سے ایک خوشگوار تجویز آئی اور وہ ہم سے کہنے لگا۔ "میرے دوستو! میں یقین دلاتا ہوں۔ بشرطیکہ فوجی منتظمین اجازت دیں گے — کہ اگر تم اپنے کسی پیارے کو چٹھی لکھو تو میں اسے پہنچا دوں گا۔"

ٹام نے کراہتے ہوئے کہا۔ "میرا کوئی نہیں ہے۔"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ٹام تھوڑی دیر منتظر رہا۔ پھر تعجب سے میری طرف دیکھنے لگا۔

"کیا کونشا کو کوئی پیغام نہیں بھیجو گے؟"

"نہیں۔"

مجھے اس اشارے پر نفرت ہونے لگی۔ یہ میرا قصور تھا۔ میں نے کل رات کو کونشا کا ذکر کیا تھا۔ مجھے کرنا نہیں چاہئے تھا۔ میں اس کے ساتھ ایک سال تک رہا۔ ایک دن پہلے اگر پانچ منٹ بھی اس کے ساتھ گزارنے کی مجھے اجازت مل جاتی تو میں معاوضے میں اپنا ہاتھ تک کٹوا ڈالتا۔ یہی شدت تھی جس کی وجہ سے میں نے اس کا تذکرہ کر دیا۔ میں بے قابو ہو گیا تھا۔ لیکن اب تو میں اسے دیکھنا تک گوارا نہیں کر سکتا تھا— اس سے مجھے کچھ نہیں کہنا تھا۔ میں اسے اپنی آغوش تک میں لینے کو تیار نہیں تھا۔ مجھے اپنے جسم سے خوف لگ رہا تھا۔ کیوں کہ وہ سفید پڑ گیا تھا اور پسینے چھوٹ رہے تھے۔ اسے دیکھ کر شاید اس سے بھی ایسی ہی نفرت ہو جاتی جیسی کہ اپنے آپ سے۔ کونشا جب میری موت کی خبر سنے گی تو روئے گی۔ مہینوں اپنی زندگی پر موت کو ترجیح دے گی، مگر اس سے کیا ہوتا ہے؟ مرنا تو مجھے ہے۔ مجھے اس کی حسین ملائم آنکھوں کا خیال آیا۔ جب وہ میری طرف دیکھتی تو ایسا معلوم ہوتا کہ کوئی چیز اس میں سے نکل کر مجھ میں آ گئی ہے۔ مگر اب تو سب کچھ ختم ہو چکا تھا۔ اگر وہ مجھے اب دیکھے تو اس کی نظر بھی اس کی آنکھوں ہی میں رہ جائے گی۔ مجھ تک نہیں پہنچے گی۔ میں اکیلا تھا۔

ٹام بھی اکیلا تھا، مگر اس طرح کا اکیلا نہیں۔ وہ بنچ پر پاؤں پھیلائے بیٹھا تھا۔ اس نے بنچ کو مسکرا کر دیکھا۔ اسے حیرت ہو رہی تھی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر بنچ کو بڑی احتیاط سے چھوا۔ اس نے جلدی سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا اور کانپنے لگا۔ اگر میں ٹام ہوتا تو بنچ کو اس طرح چھونا مجھے پسند نہ آتا۔ یہ تو گھٹیا تماشے کی سی بات ہوئی۔ ہاں یہ میں نے بھی محسوس کیا کہ تمام چیزیں پرانی دکھائی دے رہی تھیں۔ دھندلی اور کچھ گھلی ہوئی۔ میرے لیے یہی کافی تھا کہ بنچ، لیمپ، کوئلے کی خاک کے ڈھیر کو دیکھوں اور محسوس کروں کہ میں مرنے والا ہوں۔ ظاہر ہے کہ میں موت کے بارے میں واضح طور پر نہیں سوچ سکتا تھا لیکن میں اسے ہر جگہ دیکھ سکتا تھا۔ چیزوں میں، چیزوں کی بتدریجِ ہیئت میں، اجتناب، جیسے کسی مرنے والے کی بالیں پر چپکے چپکے باتیں کی جاتی ہیں۔ یہ اس کی اپنی موت تھی جسے ٹام نے بنچ پر چھوا تھا۔

میں جس حالت میں اب تھا اگر کوئی مجھ سے آ کر یہ کہتا کہ میری جاں بخشی ہوگئی ہے اور میں اپنے گھر جا سکتا ہوں تب بھی میں ایسا ہی سرد رہتا۔ کئی گھنٹے انتظار کرنا یا کئی سال انتظار کرنا— بات ایک ہی ہے۔ جب یہ فریب زائل ہو جائے کہ ہم کبھی نہیں مریں گے۔ ایک طرح سے تو مجھے کسی بات کی پروا نہیں رہی تھی۔ مجھے سکون تھا مگر کس قیامت کا سکون! جسمانی طور پر ان آنکھوں سے دیکھ رہا تھا، ان کانوں سے سن رہا تھا۔ مگر میں، میں نہیں تھا۔ پسینے از خود چھوٹ رہے تھے اور کپکپی تھی کہ خود بخود لگ رہی تھی۔ میں اپنے جسم کو اب خود بھی نہیں پہچان سکتا تھا۔ مجھے اسے دیکھنا پڑتا تھا، یہ جاننے کے لیے کہ اس کا کیا حشر ہونے والا ہے۔ میرا جسم ایسا ہو گیا تھا جیسے کسی اور کا جسم ہو۔ بعض دفعہ ایسا معلوم ہوتا کہ ایک بوجھ ہے۔ جو مجھے دبا رہا ہے۔ کبھی ایسا معلوم ہوتا کہ مجھے بڑے کپڑے سے باندھ دیا گیا ہے۔ ایک دفعہ میں نے اپنے پاجامے کو چھوا، وہ گیلا تھا۔ نہیں نہیں یہ پسینے سے گیلا ہوا تھا یا پیشاب سے؟ احتیاطاً میں نے جا کر کوئلے کی خاک کے ڈھیر پر پیشاب کیا۔

بلجین نے اپنی گھڑی نکال کر دیکھی اور بولا۔ ''ساڑھے تین بجے ہیں۔''

بدمعاش کہیں کا۔ جان کر اس نے وقت بتایا تھا۔ ٹام اچھل پڑا۔ اب تک ہم نے سوچا نہیں تھا کہ وقت گزرا جا رہا ہے۔ کالی رات نے ہم کو گھیر رکھا تھا۔ مجھے یہ بھی یاد نہیں تھا کہ رات کب اور کیسے شروع ہوئی تھی۔

کمسن جوان نے رونا شروع کر دیا۔ وہ اپنے ہاتھ مل مل کر اور گڑگڑا کر کہنے لگا۔ ''میں مرنا نہیں چاہتا۔ میں مرنا نہیں چاہتا۔'' وہ ہاتھ اٹھائے ادھر اُدھر بھاگتا پھرا۔ پھر ایک چٹائی پر گر پڑا اور روتا رہا۔

ٹام نے اسے دیکھ کر افسوس کیا۔ وہ جوان کی تسلی بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ بات بھی یہی تھی کہ اس سے کوئی فائدہ نہ ہوتا۔ وہ ہم سے زیادہ شور مچا رہا تھا۔ مگر وہ ہم سے کم متاثر تھا۔ وہ اس مریض کی طرح تھا جو اپنی بیماری کا مقابلہ بخار سے کرتا ہے۔ جب بخار نہیں ہوتا تو اس کی حالت زیادہ مخدوش ہوتی ہے۔

وہ روتا رہا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ اسے اپنے اوپر ترس آ رہا تھا۔ اسے موت کا خیال نہیں ستا رہا تھا۔ ایک لمحے کے لیے میں اپنے اوپر ترس کھا کر رونا چاہتا تھا۔ مگر ہوا اس کا الٹا۔ میں نے لڑکے کی طرف دیکھا۔ میں نے اس کے دبلے، جھکولے کھاتے کندھے دیکھے اور میری انسانیت ختم ہوگئی۔ اب نہ تو مجھے اپنے اوپر ترس آ رہا تھا اور نہ ہی دُوسروں پر۔ میں نے دل میں کہا۔ ''میں کم ہمتوں کی طرح نہیں مروں گا۔''

ٹام اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ گول روشن دان کے عین نیچے جا کھڑا ہوا اور صبح کا انتظار کرنے لگا۔ مجھے ضد سوار تھی مجھے مردانہ وار مرنا تھا اور اس کا خیال تھا۔ اس سب پر چونکہ ڈاکٹر نے وقت بتا دیا تھا۔ اس لیے لمحے پھسلتے ہوئے معلوم ہو رہے تھے۔ جیسے قطرہ قطرہ ہو کر پانی بہہ رہا ہو۔

ابھی اندھیرا ہی تھا کہ ٹام کی آواز سنائی دی۔ ''اُن کی آواز سن رہے ہو؟''

''ہاں۔''

احاطے میں لوگ چل پھر رہے تھے۔ ''کم بخت کر کیا رہے ہیں؟ اندھیرے میں تو گولی نہیں چلا سکتے۔''

کچھ دیر بعد خاموشی ہوگئی۔ میں نے ٹام سے پوچھا۔ ''پو پھٹ رہی ہے۔''

پیڈرو نے اٹھ کر لیمپ بجھا دیا اور اپنے ساتھی سے کہنے لگا۔ ''میں تو مر گیا سردی سے۔''

تہہ خانے میں مدھم روشنی ہوگئی تھی۔ دور سے ہمیں دھماکوں کی آواز آ رہی تھی۔

میں نے ٹام سے کہا۔ ''کام شروع ہوگیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے پیچھے احاطے میں ہیں۔''

ٹام نے ڈاکٹر سے سگریٹ مانگا۔ مجھے سگریٹ یا شراب کی ضرورت نہیں تھی۔ اب بس باڑ پر باڑ چلتی رہے گی۔

ٹام نے کہا۔ ''تم سمجھے؟'' وہ کچھ اور کہنا چاہتا تھا مگر چپکا ہو رہا۔ اس نے دروازے کی طرف دیکھا۔ دروازہ کھلا اور ایک لفٹنٹ اور چار سپاہی اندر آئے۔ ٹام کا سگریٹ گر پڑا۔

''اسٹین باک؟''

ٹام نے جواب نہیں دیا۔ پیڈرو نے ٹام کی طرف اشارہ کیا۔

''جوان میربل؟''

''وہ ہے چٹائی پر۔''

لفٹنٹ نے کہا۔ ''اُٹھو۔'' جوان ہلا تک نہیں۔ دو فوجیوں نے اس کے کندھے پکڑ کر کھڑا کیا مگر ان کے چھوڑتے ہی وہ پھر چٹائی پر ڈھیر ہو گیا۔

سپاہی سوچ میں پڑ گئے۔

لفٹنٹ نے کہا۔ ''یہ کوئی پہلا آدمی نہیں ہے جس کی یہ حالت ہوئی ہے۔ تم دونوں اسے اٹھالو۔ وہ سب کام وہاں ٹھیک کر لیں گے۔''

ٹام کی طرف پلٹ کر بولا۔ ''چلو، ادھر آؤ۔''

ٹام دو سپاہیوں کے بیچ میں ہو کر چل پڑا۔ دو سپاہی ان کے پیچھے پیچھے لڑکے کو اٹھائے روانہ ہوئے۔ وہ بے ہوش نہیں ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں اور گالوں پر آنسو بہہ رہے تھے۔ جب میں بھی باہر نکلنے کو ہوا تو لفٹنٹ نے مجھے روک دیا۔

''تم ابی ایٹا ہو۔''

''ہاں۔''

''تم یہیں ٹھہرو۔ ابھی تھوڑی دیر میں وہ تمہیں بلوائیں گے۔''

وہ سب باہر نکل گئے۔ بلجین اور دونوں پہرے دار بھی چلے گئے۔ میں اکیلا رہ گیا۔ مجھے نہیں معلوم میرے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ جو کچھ بھی ہونا ہے جلدی ہو جائے۔ باڑ مارنے کی آواز مقررہ وقفوں سے آ رہی تھی۔ ہر آواز پر میں لرزنے لگتا۔ میں چیخنا اور اپنے بال کھسوٹنا چاہتا تھا لیکن میں نے اپنے ہاتھ جیبوں میں ٹھونس لیے۔ کیوں کہ میں ڈھنگ سے مرنا چاہتا تھا۔

ایک گھنٹے کے بعد وہ آئے اور ایک چھوٹے کمرے میں مجھے لے گئے۔ کمرے میں سگار کی بُو بسی ہوئی تھی اور اس میں گرمی ناقابل برداشت تھی۔ یہاں دو افسر

بیٹھے سگار پی رہے تھے۔ کاغذات ان کے گھٹنوں پر رکھے ہوئے تھے۔

''کیا تمہارا نام ابی ایٹا ہے۔''

''جی ہاں۔''

''رامن گرس کہاں ہے؟''

''مجھے معلوم نہیں۔''

جو مجھ سے سوال کر رہا تھا پستہ قد اور موٹا تھا۔ عینک میں سے اس کی آنکھیں سخت دکھائی دے رہی تھیں۔ اس نے مجھ سے کہا۔ ''ادھر آؤ۔''

میں اس کے قریب گیا۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا اور میرا بازو پکڑ کر کچھ اس طرح مجھے دیکھنے لگا کہ میں زمین میں دھنس جانا چاہتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے پوری طاقت سے میرے چٹکیاں لیں۔ یہ مجھے تکلیف دینے کے لیے نہیں کیا جا رہا تھا۔ بلکہ مجھ پر داؤں مارا جا رہا تھا — وہ مجھ پر چھا جانا چاہتا تھا۔ اس نے یہ بھی ضروری سمجھا کہ اپنا گندہ سانس میرے منہ پر چھوڑے۔ ہم اسی طرح ایک لمحے کے لیے کھڑے رہے اور مجھے ہنسی آنی شروع ہوئی۔ بھلا ان باتوں کا اثر اس پر کیا ہوسکتا ہے جو مرنے کو کھڑا ہو۔ سب بیکار ثابت ہوا۔ اس نے مجھے زور سے دھکیل دیا اور پھر بیٹھ گیا۔ بولا۔ ''اُس کی جان پر تمہاری جان کی بازی لگی ہے۔ اگر تم ہمیں بتا دو کہ وہ کہاں ہے تو تمہیں چھوڑ دیا جائے گا۔''

یہ دونوں آدمی، سجے سجائے ہاتھوں میں ہنٹر، پیروں میں لمبے جوتے پہنے، یہ دونوں بھی مرنے والے تھے، گو اتنی جلدی نہیں جتنی جلدی کہ میں مرنے والا تھا۔ ان کا یہ کام تھا کہ فہرستوں میں نام چھانٹتے رہیں۔ لوگوں کو قید کرنے اور انہیں مروانے میں اپنا سارا وقت صرف کرتے رہیں۔ اسپین کے مستقبل کے بارے میں ان کی اپنی رائے تھی اور دوسرے معاملوں میں بھی ذاتی رائے چلاتے تھے۔ ان کی حرکتیں مضحکہ خیز اور نفرت انگیز تھیں۔ ان کا نقطۂ نظر مجھے تو جچتا نہ تھا اور وہ خاصے سڑی سودائی معلوم ہوتے تھے۔

موٹا آدمی مجھے گھورتا رہا اور اپنے جوتے پر ہنٹر بجاتا رہا۔ اس کی ہر حرکت سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی بڑا خونخوار جانور ہے۔

''کیوں — سمجھ میں آیا؟''

"مجھے نہیں معلوم گرس کہاں ہے۔ وہ تو غالباً میڈرڈ میں ہے۔"

دُوسرے افسر نے بھدا سفید ہاتھ سستی سے اٹھایا۔ یہ سستی بھی بناوٹی تھی اور خودساختہ۔ میں ان کی ایک ایک بات کو تاڑ رہا تھا اور مجھے تعجب ہو رہا تھا کہ ایسے بھی آدمی ہوں گے جوان کی حماقت آمیز باتوں میں آجاتے ہوں گے۔

اُس نے آہستہ سے کہا۔ "تمہیں سوچنے کے لیے پاؤ گھنٹہ دیا جاتا ہے۔ لے جاؤ اسے مال خانہ میں۔ پاؤ گھنٹے کے بعد واپس لانا۔ اگر پھر بھی یہ انکار ہی کرتا رہا تو ہم اسے فوراً گولی سے اڑادیں گے۔"

انہیں معلوم تھا کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔ میں نے رات بھر انتظار کیا تھا۔ اس کے بعد جب وہ ٹام اور جوان کو باڑ مار رہے تھے تو ایک گھنٹہ اور میں نے تہہ خانے میں انتظار کیا تھا اور اب وہ مجھے مال خانے میں بند کر رہے تھے۔ یہ سب انہوں نے کل شام ہی طے کرلیا ہوگا۔ انہیں یقین ہوگا کہ بالآخر میرے اعصاب جواب دے جائیں گے اور پھر وہ مجھ سے سب کچھ اگلوالیں گے۔

مگر وہ غلطی پر تھے۔ میں مال خانے میں ایک اسٹول پر بیٹھ گیا۔ کیوں کہ میں بہت کمزور ہوگیا تھا اور میں نے سوچنا شروع کر دیا۔ مگر اُن کی تجویز پر نہیں۔ حقیقتاً مجھے معلوم تھا کہ گرس کہاں ہے۔ شہر سے چار کلومیٹر کے فاصلے پر وہ اپنے ایک رشتہ کے بھائی کے ہاں چھپا ہوا تھا۔ یہ بھی میں جانتا تھا کہ جب تک یہ مجھے اذیتیں نہیں پہنچائیں گے اس وقت تک میں بھید دینے کا نہیں (مگر معلوم نہیں ہوتا تھا کہ انہیں اذیت رسانی کا خیال ہی نہیں آیا) باقی سب کچھ میرا خوب سوچا سمجھا ہوا تھا اور مجھے اس سے کوئی دلچسپی بھی نہیں رہی تھی۔ ہاں میں اپنے اس طرز عمل کی وجہ معلوم کرنا چاہتا تھا۔ گرس کا پتہ دینے کے بجائے میں مرجانا چاہتا تھا۔ کیوں؟ رامن گرس کی مجھے واقعی اب کوئی پروا نہیں رہی تھی۔ صبح ہونے سے ذرا پہلے اس کی دوستی میرے دل میں مرچکی تھی۔ اسی وقت کونشا کی محبت نے بھی دم توڑا تھا۔ اسی وقت میری زندہ رہنے کی آرزو بھی مٹ چکی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ میں اس کی عزت اب بھی کرتا تھا۔ وہ مضبوط تھا۔ مگر یہ وجہ تو

ایسی نہیں تھی کہ میں اس کے بدلے مرنے کو تیار تھا۔ اس کی زندگی کی قیمت میری زندگی سے زیادہ نہیں تھی۔ کسی زندگی کی کچھ بھی قیمت نہیں تھی۔ دیوار سے ایک آدمی کو لگا کر وہ اس پر اتنی گولیاں چلانا چاہتے تھے کہ وہ مر جائے۔ چاہے میں ہوں یا گرس ہو، یا کوئی اور۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ مجھ سے زیادہ اسپین کے لیے مفید ثابت ہوگا۔ مگر مجھے اسپین یا انقلاب کی ذرہ بھر پروا نہیں تھی۔ خیر کچھ بھی ہو۔ میں گرس کا پتہ دے کر اپنی جان بچا سکتا تھا اور میں یہ ہرگز کرنے پر آمادہ نہیں تھا۔ یہ فیصلہ کچھ مسخرا پن بھی معلوم ہوتا تھا۔ پھر خیال آیا کہ یہ میری ضد ہے اور کچھ نہیں۔ کیا میں اس قدر موٹی عقل کا ہو گیا ہوں؟

مجھ پر ایک عجیب طرح کی مسرت چھا گئی۔ وہ مجھے لینے آ گئے اور دونوں افسروں کے سامنے لے گئے۔ ایک چوہا ہمارے پیروں میں سے ہو کر بھاگا اور مجھے ہنسی آئی۔ میں نے ایک محافظ کی طرف پلٹ کر کہا۔ ''دیکھا تم نے چوہا۔''

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ بڑا بھیا تک بنا ہوا تھا اور شاید سنجیدگی کو ضرورت سے زیادہ عزیز رکھتا تھا۔ میں ہنسنا چاہتا تھا مگر میں نے بڑے ضبط سے کام لیا۔ اس خوف سے کہ اگر ہنسنا شروع ہوا تو پھر ختم نہیں ہوگا۔ محافظ نے اپنی مونچھ کو مروڑی دی۔

میں نے کہا۔ ''تمہیں اپنی مونچھیں کاٹ ڈالنی چاہئیں۔''

مجھے کچھ عجیب سا معلوم ہو رہا تھا کہ یہ زندہ بھی ہے اور اپنے چہرے پر بالوں کو اگنے بھی دیتا ہے۔ اس نے ایک ہلکی سی لات میرے رسید کی اور میں چپکا ہو گیا۔

افسر نے کہا۔ ''ہاں جی! تم نے سوچ لیا؟''

میں نے ان کی طرف اس طرح دیکھا جیسے وہ کوئی عجیب و غریب کیڑے ہوں۔ میں نے کہا۔ ''میں جانتا ہوں وہ کہاں ہے۔ وہ قبرستان کی کسی قبر میں ہوگا یا گورکن کی جھونپڑی میں چھپا ہوا ہوگا۔'' میں نے از راہ تمسخر یہ بات کہی تھی۔ میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ گھبرا کر اٹھیں۔ اپنی پیٹیاں کسیں اور حکم احکام کا شور مچا دیں۔

''چلو مولزر لیفٹننٹ تم چند آدمی لو۔ تم اگر سچ بولے تو میرا صرف ایک لفظ کہنا کافی

ہے اور اگر تم نے ہمیں بے وقوف بنانے کی کوشش کی ہے تو تمہیں سخت سزا بھگتنی پڑے گی۔"

وہ سب جلدی جلدی نکل گئے اور میں آرام سے ایک محافظ دستے کی نگرانی میں بیٹھا رہا۔ جب مجھے خیال آتا کہ وہ کیسی کیسی حماقتیں کریں گے تو اپنی مسکراہٹ کو روک نہیں سکتا تھا۔ میرا دماغ معطل ہو رہا تھا۔ مجھ میں گراوٹ آ رہی تھی اور ضد پیدا ہو رہی تھی۔ میں نے تصور میں دیکھا کہ وہ ڈھئی ہوئی قبر کھول رہے ہیں اور ایک ایک کر کے ان تہہ خانوں کے دروازے کھولتے پھر رہے ہیں جن میں تابوت رکھے جاتے ہیں۔ میں نے اس منظر کو اس طرح دیکھا جیسے میں کوئی اور ہوں۔ اس ڈرامے میں قیدی نے گویا تہیہ کر لیا تھا کہ ہیرو کا پارٹ ادا کرے گا۔ فوجی سپاہی بڑی بڑی مونچھیں لگائے اور افسر وردیاں پہنے قبروں میں دوڑتے پھر رہے تھے۔ بڑا پُر لطف طربیہ تھا۔

آدھ گھنٹے کے بعد موٹا افسر اکیلا واپس آیا۔ میں نے سمجھ لیا کہ مجھے گولی سے اڑانے کا حکم دینے واپس آیا ہے۔ باقی آدمی قبرستان میں ہوں گے۔

افسر نے میری طرف دیکھا۔ وہ بددل یا مایوس قطعی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

اس نے کہا۔ "اسے بڑے احاطے میں لے جاؤ، جہاں اور قیدی بھی ہیں۔ فوجی نقل و حرکت سے فارغ ہونے کے بعد کوئی مناسب منصف اس کی قسمت کا فیصلہ کرے گا۔"

میں سمجھا کہ میں نے ٹھیک نہیں سنا۔ میں نے اس سے پوچھا۔ "تو کیا وہ مجھے ابھی گولی سے نہیں اڑا رہے؟"

"بہر حال ابھی تو نہیں۔"

یہ کہہ کر اس نے پھر میری طرف دیکھا۔

"میں اب بھی نہیں سمجھا۔ لیکن کیوں؟"

اس نے کندھے اُچکائے اور کوئی جواب نہیں دیا۔ سپاہی مجھے کھینچ کر لے گئے۔ بڑے احاطے میں قیدیوں کی خاصی تعداد تھی۔ عورتیں، بچے اور چند بڈھے۔ میں نے بیچ میں پھر پھر کر چکر کاٹنے شروع کر دیئے۔ میرا دماغ ماؤف ہو گیا تھا۔

دوپہر کو انہوں نے ہمیں طعام خانے میں کچھ کھانا دیا۔ کئی کئی آدمیوں نے مجھ

سے سوال کیے لیکن میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ مجھے ان لوگوں کو جاننا چاہیے تھا، مگر مجھے تو یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ میں کہاں ہوں۔

شام ہوتے ہوتے انہوں نے دس اور قیدی احاطے میں داخل کر دیئے۔ میں نے گریشیا نابنائی کو پہچانا۔ وہ بولا۔ ''یااللہ! تم زندہ ہو؟''

میں نے کہا۔ ''انہوں نے مجھے سزائے موت دی تھی اور پھر اپنی رائے بدل ڈالی۔ مجھے نہیں معلوم کیوں؟''

گریشیا نے کہا۔ ''انہوں نے مجھے دو بجے گرفتار کیا ہے۔''

''کیوں؟'' گریشیا کو سیاست سے کوئی لگاؤ نہیں تھا۔

اس نے کہا۔ ''نہ جانے کیوں جو ذرا بھی ان کی طرح نہیں سوچتا اسے پکڑ لیتے ہیں۔'' پھر نیچی آواز میں بولا۔ ''انہوں نے گرس کو پکڑ لیا ہے۔''

میں نے کانپنا شروع کر دیا۔ ''کب؟''

''آج صبح۔ اس نے بڑا احمق پن کیا۔ منگل کو وہ اپنے رشتے کے بھائی کے ہاں سے چلا گیا، اس سے چخ چخ ہو گئی تھی اور بہت سے آدمی تھے جو اُسے چھپائے رکھتے، مگر وہ کسی کا احسان نہیں اٹھانا چاہتا تھا۔ وہ کہنے لگا۔ ''اگر میں چھپتا تو ابی ایٹا کے مکان میں چھپتا۔ مگر وہ گرفتار ہو چکا ہے، اس لیے میں قبرستان میں جا کر چھپتا ہوں۔''

''قبرستان میں؟''

''ہاں، اس سے بڑھ کر اور کیا حماقت ہو سکتی تھی؟ ظاہر ہے کہ وہ وہاں پہنچ گئے۔ آج صبح یہ تو ہونا ہی تھا۔ گورکن کی جھونپڑی میں جا کر انہوں نے اسے پکڑ لیا۔ اس نے ان پر گولی بھی چلائی مگر انہوں نے دھر ہی لیا۔''

''قبرستان میں؟''

تمام چیزیں میرے سر میں گھومنے لگیں اور میں نے اپنے آپ کو زمین پر بیٹھا پایا۔ میں اس قدر ہنس رہا تھا کہ میری آنکھوں میں آنسو اُمنڈ آئے تھے۔

○○

پسِ لفظ

ایک چراغ اور گل ہو گیا

(شاہد احمد دہلوی کی وفات پر رسالہ ''گفتگو'' بمبئی کے مدیر
سردار جعفری صاحب کے تاثرات)

شاہد احمد دہلوی کے ساتھ دلی کی ایک روایت ختم ہو گئی۔ ایک دور قبر میں اتر گیا۔ اب میرؔ اور غالبؔ، ڈپٹی نزیر احمد اور ان کے پوتے شاہد احمد کی دلی باقی نہیں ہے۔ ایک دوسری دلی نئے حسن کے ساتھ ابھر رہی ہے۔

گرم ہنگامہ ہوئے لالہ رخانِ پنجاب
گل کھلائے ہیں نئے تونے خزانِ دِلّی

اور یہ نئی دلی کراچی اور لاہور کی طرح شاہد احمد دہلوی کے سوگ میں شریک ہے۔

شاہد احمد دہلوی کی زندگی ادب اور موسیقی سے عبارت تھی۔

دلی کی زبان اور ہندوستان کی موسیقی وہ دونوں کے عاشق تھے اور ان کے تمام اسرار و رموز سے واقف۔ انہوں نے تقریباً پچاس کتابیں لکھیں اور ترجمہ کیں۔ لیکن غالباً ان کا سب سے بڑا کارنامہ رسالہ۔ ''ساقی'' ہے جو انہوں نے ۱۹۳۰ء میں جاری کیا تھا۔ ساقی کا شمار ان رسالوں میں ہوتا ہے جنہوں نے اپنے عہد کے ادیبوں کی ایک پوری نسل کی تربیت کی ہے۔ کرشن چندر، سعادت حسن منٹو، عصمت چغتائی، اختر حسین رائے پوری اور بہت سے ادیب اس اُفق سے طلوع ہوئے۔ جن ادیبوں کی شخصیت اور تحریروں سے

عصمت چغتائی متاثر ہوئی ہیں ان میں شاہد احمد بھی ہیں۔ ''ساقی بک ڈپو'' نے بھی اُردو ادب کی بڑی خدمت کی اور ڈیڑھ دو سو کتابیں شائع کیں۔

لیکن جب ۱۹۴۷ء میں ملک کی تقسیم کے بعد دلی اُجڑی تو ساقی اور ساقی بک ڈپو اور شاہد احمد دہلوی نے بھی دلی کو خیر باد کہا، اور یہ دلی کراچی میں جا بسی۔ جہاں اتفاق سے ''ساقی'' اور شاہد احمد کو وہ فراغت نصیب نہ ہو سکی جو دلی میں تھی۔ یوں تو شاہد احمد کو پاکستان میں بھی اعزاز ملا اور ادیبوں کی تنظیم میں اعلیٰ مقام بھی لیکن ساقی اپنی پچھلی اہمیت کھو چکا تھا۔ شاید اسی درد نے شاہد احمد کے یہاں تھوڑی سی تلخی پیدا کر دی تھی۔

وہ بہت حساس تھے۔ ایک بار جوشؔ ملیح آبادی نے ڈپٹی نذیر احمد کی زبان پر اعتراض کر دیا اور کہیں کہیں تصحیح بھی کر دی۔ اس پر شاہد صاحب اتنے برہم ہوئے کہ انہوں نے جوشؔ کی شخصیت اور شاعری کے خلاف ''ساقی'' کا ایک ضخیم نمبر شائع کر دیا۔ یہ ''اُفکار'' (کراچی) کے جوشؔ نمبر کے بعد شائع ہوا اور اس اعتبار سے ایک اہم دستاویز ہے کہ آنے والی نسلوں کو یہ معلوم ہو سکے گا کہ اس عہد کے ایک عظیم شاعر کے خلاف کیا کہا جاتا تھا۔

۱۹۳۶ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی تنظیم کے بعد وہ اس تحریک کے سرگرم طرفداروں اور کارکنوں میں تھے۔ جب دار و گیر شروع ہوئی تو شاہد احمد صاحب نے تحریک سے کنارہ کشی کر لی لیکن ترقی پسند ادیبوں سے ان کے دوستانہ مراسم برقرار رہے اور ان کی کتابیں ساقی بک ڈپو سے شائع ہوتی رہیں۔

آج شاہد احمد دہلوی ہمارے درمیان نہیں لیکن ان کی تحریریں زندہ ہیں اور ان میں دلی کی ٹکسالی زبان کے نادر نمونے ہمیشہ باقی رہیں گے۔ وہ زبان جو اَب دلی میں نہیں بولی جائے گی۔ جو تھا نہیں ہے، جو ہے نہ ہوگا۔ یہی ہے اک حرفِ محرمانہ۔

— سردار جعفری

OO

علم کی میراث

لکھو!

اور

اپنے عِلم کو اپنے دوستوں کے درمیان پھیلاؤ

اور

جب وقتِ مرگ آئے تو اپنے

بچوں کو

بطورِ میراث سُپرد کرو

کیوں کہ

جب فتنہ و آشوب کا زمانہ آتا ہے

تو بجز کتاب

کوئی اور مونس و دَمساز نہیں ہوتا!

○○

اِمامُ جَعفَرُ صَادِق ؑ

عِلم اور عَمل

یادرکھو کہ
عِلم کے ساتھ عَمل ضروری ہے
نہ عَمل کے بغیر عِلم نافع ہے اور نہ عِلم کے بغیر
عَمل نفع بخش ہے
جس عِلم کی پُشت پر عَمل موجود نہ ہو
وہ عِلم جہل ہی کے زُمرے میں شامل ہے۔

OO

— حضرت داتا گنج بخشؒ

﴿کَشف اَلمَحجُوبؔ سے﴾

عِلم کی تلاش

جو شخص
عِلم کی تلاش میں نکلے
وَہ اُس وَقت تک
خُدا کی رَاہ میں ہے
جب تک کہ
واپس نہ آجائے
OO

﴿ ترمذی من انسؓ ﴾

شاہد احمد دہلوی بیسویں صدی میں دہلی کے دبستان نثر کی ایک ممتاز شخصیت تھی۔ انہوں نے مختلف موضوعات پر بڑی تعداد میں کتابیں لکھی ہیں اور بہت سی کتابوں کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ بھی کیا ہے۔ ان کا رسالہ "ساقی" ادبی رسالوں میں اہم ترین سمجھا جاتا تھا۔ شاہد صاحب ڈپٹی نذیر احمد کے پوتے اور ایک بڑے مورخ، نثر نگار بشیر الدین صاحب کے صاحبزادے تھے۔ ان دونوں ہی نے اردو نثر کی تعمیر میں اہم حصہ لیا ہے۔ "دہلی جو ایک شہر تھا" میں فیاض رفعت نے شاہد احمد دہلوی کے مضامین کے انتخاب میں اس بات کا پورا خیال رکھا ہے کہ شاہد صاحب کی ادبی اور سماجی زندگی کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ ہو جائے اور مضامین سے یہ بھی ثابت ہو جائے کہ شاہد صاحب دلی کے روڑے تھے اور انہیں اردو زبان پر جو قدرت حاصل تھی وہ بہت کم لوگوں کو ہوتی ہے۔ ہمیں خوشی ہے کہ یہ انتخاب فیاض رفعت جیسے ایک ادیب نے کیا ہے جو خود اعلا درجے کے شاعر، افسانہ نگار، ناول نگار، ڈرامہ نویس اور رپورتاژ لکھنے والے ہیں۔ مجھے دلی مسرت ہے کہ فیاض رفعت نے اس کتاب کے ذریعہ شاہد احمد دہلوی کی ادبی شخصیت اور ان کے کارناموں کو انتہائی کامیابی سے پیش کیا ہے، اس لیے یہ کتاب ہر لحاظ سے قابل قدر ہے۔

— ڈاکٹر خلیق انجم، دہلی

شاہد احمد دہلوی ۱۹۴۷ء سے پہلے کی دلی کے دبستانِ اُردو کی ایک اہم شخصیت تھے۔ وہ ڈپٹی نذیر احمد کے پوتے اور مولوی بشیر الدین کے فرزند تھے۔ یہ دونوں ہی اردو ادب کے اہم ستون تھے۔ اپنے خاندان کی ادبی روایت کو اُسی آن بان کے ساتھ شاہد احمد دہلوی نے آگے بڑھایا۔ وہ دہلی کی ان روایات کا جیتا جاگتا نمونہ تھے جن میں زبان، ادب، ثقافت، صحافت، موسیقی اور اس کے ساتھ ساتھ دلی والوں کے مشاغل اور تفریحات سبھی کچھ شامل تھا۔ اس اعتبار سے فیاض رفعت کے مرتبہ شاہد احمد دہلوی کے منجملہ مضامین کا یہ مجموعہ شاہد احمد دہلوی کی ادبی شخصیت کے اُن تمام پہلوؤں کا بھرپور احاطہ کرتا ہے۔ آنے والی نسلیں جن کے پاس شاہد احمد دہلوی سے متعارف ہونے کا کتاب کے علاوہ اور کوئی ذریعہ نہیں ہوگا، ان کے لیے یہ کتاب "دلی جو ایک شہر تھا" آگے چل کر دستاویزی اہمیت کی حامل ثابت ہوگی۔

— ڈاکٹر اسلم پرویز

TAKHLEEQKAR PUBLISHERS

205/6, J - Extension, Laxmi Nagar, Delhi - 10092

Ph: 011-22442572, 9811612373 Email: qissey@rediffmail.com